معارف القرآن

2

تصنیف

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

جلد 2

تصنیف

استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ

سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ

رابطہ نمبر 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ہال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ②

سورۃ البقرہ کا تعارف	۱۰	حمقائے دنیا کی احمقانہ عبارات	۱۶۱
زمانہ نزول، شان نزول، فضائل	۱۱	وجوہ اعجاز قرآن	۱۶۷
حروف مقطعات	۲۰	دنیا اور جنت کے پھل	۲۱۴
لاریب کتاب قرآن کریم	۳۵	مکھی، مچھر کی مثالیں، اہل ایمان و کفار	۲۲۳
ملحدین کے شبہات کا جواب	۴۵	انسان کی دو موتیں، دو زندگیاں	۲۲۹
قرآن کریم کن کے لیے ہدایت	۵۸	آسمان کی پیدائش	۲۳۰
اہل تقویٰ کی نشانیاں	۵۹	آسمان پہلے پیدا کیے گئے یا زمین؟	۲۲۴
ختم نبوت	۷۴	خلافت آدم کا اعلان	۲۴۱
کافروں کی ایمان سے محرومی کی سزا	۷۸	حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا علم	۲۴۵
منافقین کی شر انگیزیاں	۸۳	فرشتوں کا عجز و انکسار	۲۴۷
توحید و الوہیت اور دلائل الوہیت	۱۰۳	ابلیس لعین کی سجدہ ریزی سے انکار	۲۴۹
آسمان کی طرف دیکھنے کے فوائد	۱۱۲	آدم و حواء کا پہلا ٹھکانہ، شجر ممنوعہ	۲۵۱
حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ باتوں کا حکم	۱۲۴	انسان و شیطان کی باہمی دشمنی	۲۵۴
وجود باری تعالیٰ پر استدلالات	۱۲۶	حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کیسے قبول ہوئی	۲۵۶
بارش آسمان سے یا بادلوں سے؟	۱۳۲	انسانی جزا و سزا کا قانون	۲۵۹
اعجاز قرآنی	۱۳۸	بنی اسرائیل پر نعمتوں کا ذکر	۲۶۷
ایک سورت، مکمل قرآن کا چیلنج	۱۴۱	یہود کو اعمال صالحہ اختیار کرنے کا حکم	۲۶۹
اعجاز القرآن سے کیا مراد ہے؟	۱۴۳	مبلغین و دعاۃ الی اللہ کی ذمہ داریاں	۲۷۳
عربوں کی بے بسی کے چند واقعات	۱۴۶	نماز و صبر کے ذریعے مدد حاصل کرو	۲۷۹

بنی اسرائیل پر نعمتیں، میدان محشر	۲۸۳	زرد رنگ گائے اور زرد رنگ جوتی	۳۱۸
بچوں کا قتل عام	۲۸۶	گائے کا پس منظر، عجیب واقعہ	۳۲۰
موسیٰ کی کامیابی، فرعون کی غرقابی	۲۸۷	مقتول کے قاتل کی تلاش	۳۲۸
کوہ طور پر چالیس راتوں کا اعتکاف	۲۸۸	پتھر دل لوگ	۳۳۰
الکتاب اور الفرقان	۲۸۹	یہود کی آسمانی کتابوں میں ردوبدل	۳۳۴
بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی توبہ	۲۹۰	یہود کا نفاق اور دورُخا پن	۳۳۷
اصحاب موسیٰ علیہ السلام موت کے منہ میں	۲۹۲	یہودیوں کا ان پڑھ گروہ	۳۲۹
قوم موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی کرم نوازی	۲۹۲	ویلٌ سے کیا مراد ہے؟	۳۴۰
یہود کی حکم عدولی پر آسمانی عذاب	۲۹۸	جہنم سے متعلق یہود کی خام خیالی	۳۴۲
میدان تیہ میں پتھر سے پانی	۳۰۰	جنتی کون اور دوزخی کون؟	۳۴۴
یہود کی احسان فراموشی، اس کی سزا	۳۰۳	بنی اسرائیل سے عہد وپیمان	۳۴۵
یہودی، نصاریٰ، صابی اور ایمان	۳۰۵	یہود مدینہ کے تین قبائل	۳۴۷
یہودی کون ہیں؟	۳۰۶	یہودیوں کی عہد شکنی	۳۵۰
نصاریٰ کون ہیں؟	۳۰۷	روح القدس سے کون مراد ہے؟	۳۵۲
صابی کون ہیں؟	۳۰۷	یہود کی رعونت، مکاری، اور انکار حق	۳۵۵
بنی اسرائیل کا ایمان اور بے ایمانی	۳۰۸	کسی پر ایمان اور کسی کا انکار	۳۵۶
بنی اسرائیل کا ذلیل بندر بننا	۳۱۱	روشن دلائل کے باوجود بچھڑا پرستی	۳۶۰
بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم	۳۱۵	جب پہاڑ قوم موسیٰ پر سائبان بن گیا	۳۶۰
ذبح کی جانے والی گائے کی صفات	۳۱۶	مباہلہ کی دعوت	۳۷۳
حجت بازی کا انجام	۳۱۷	عمر کی طولانی، عذاب ربانی	۳۷۶

یہودی سوالات کی بوچھاڑ اور جبریل	۳۷۷	تلاوت قرآن کا حق ادا کرنے والے	۴۲۸
واضح نشانیوں کا فاسق انکار کرتے ہیں	۳۸۵	بنی اسرائیل کیلیے نصیحت آموز جملے	۴۳۰
یہودیوں نے تورات پر عمل چھوڑا	۳۸۶	سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امتحان میں کامیابی	۴۳۱
جادو ٹونہ، ہاروت، ماروت کی آزمائش	۳۸۸	بیت اللہ شریف اور مقام ابراہیم علیہ السلام	۴۳۵
اللہ کے ہاں بہترین ثواب	۳۹۶	اہل مکہ کے لیے دعائے ابراہیمی	۴۳۶
غیر مسلموں کی مشابہت سے گریز لازم	۳۹۷	مکہ معظمہ میں پھلوں کی بہتات	۴۳۸
یہود کا مسلمانوں سے بغض وعناد	۴۰۱	مدینہ منورہ کے لیے دعائے مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم	۴۳۸
ایک آیت کی جگہ دوسری آیت	۴۰۲	تاریخ خانہ کعبہ	۴۳۹
ارض وسماء کا بادشاہ	۴۰۵	سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں	۴۴۲
بے جا قیل وقال کی ممانعت	۴۰۶	ملت ابراہیمی سے انحراف کرنے والے	۴۴۵
قومی عصبیت اور مسلمانوں کی تربیت	۴۰۸	ابراہیم ویعقوب کی اپنی اولاد کو وصیت	۴۴۶
صرف یہود ونصاریٰ ہی جنت جائیں گے؟	۴۱۰	ہر کوئی اپنے اعمال کا جواب دہ ہے	۴۵۰
اصل جنتی کون؟	۴۱۱	یہودیت ونصرانیت نہیں ملت ابراہیمی	۴۵۱
یہود ونصاریٰ کا تعصب	۴۱۲	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق ہیں	۴۵۳
مساجد وعبادت گاہوں سے روکنے والے ظالم	۴۱۶	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف صالحین	۴۵۴
بیت المقدس، بیت اللہ مقصود اللہ	۴۱۹	اللہ ہی کا رنگ بہترین ہے	۴۵۵
اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے	۴۲۰	اللہ کا رنگ عبدیت کا رنگ ہے	۴۵۶
یہود، نصاریٰ، مشرکین کے مطالبات	۴۲۲	اعمال مشرکین سے بیزاری	۴۵۷
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشیر ونذیر	۴۲۵	نسب پر غرور نہ کیا جائے	۴۶۱
یہود ونصاریٰ کی پیروی میں اللہ کی ناراضگی	۴۲۶	☼☼☼☼	

اپنی بات

بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ آلہ واصحابہ

بندہ حقیر وپر تقصیر محمود الرشید عباسی حدوٹی پر اللہ تعالیٰ نے فضل وکرم اوراحسان عظیم فرمایا کہ اسے گزشتہ چار دہائیوں سے اہل علم وفضل اوراہل اللہ کی جوتیوں میں بیٹھنے اوران سے فیض حاصل کرنے کی توفیق دی، گزشتہ چار دہائیوں سے بندہ راقم الحروف مسجد ومدرسہ کے ساتھ ہی وابستہ ہے، انہی مبارک چار دیواریوں کی حدود میں قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے اپنے ایمان وایقان کو جلا بخش رہا ہوں۔ الحمد للہ علی ذالک الاحسان والفضل والکرم

ایک مبارک خواب

بندہ کی عمر کوئی گیارہ سال تھی جب جامعہ اشاعت اسلام نیوء مری میں حضرت مولانا محمد سفارش عباسی صاحب اور حضرت مولانا فرید احمد آزاد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے ہوئے تھے، اسی دوران ہمارے ہم جماعت مفتی کوہسار حضرت مولانا مفتی خالد حسین صاحب نے ایک مبارک خواب دیکھا تھا، جس میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کو جلوہ افروز دیکھا، نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہم چند معصوم طالب علم بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان طالب علموں میں یہ فقیر پر تقصیر بھی بیٹھا ہوا تھا۔

حضرت مفتی خالد حسین صاحب نے اپنا خواب لکھ کر کراچی میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب کی خدمت میں بھیجا، جس کی تعبیر انہوں نے یہ بتائی تھی کہ اس منظر میں جتنے لوگ دکھائی دے رہے ہیں ان سب سے اللہ پاک اپنے دین کا کام لے گا، اسی مبارک خواب کی برکت ہے کہ ہم اسی زمانے سے مسجدوں ومدرسوں کی جاروب کشی کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ ومشائخ کے پاپوش سیدھے کرنے میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ نے طالب علمی کے بعد مختلف مدرسوں میں فنون کی کتابیں پڑھانے کی توفیق عطاء فرمائی، اپنی مادر علمی جامعہ اشرفیہ لاہور میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ڈیڑھ دہائی تک تدریس کی سعادت عطاء فرمائے رکھی، پھر جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور میں بنائے کی توفیق دی۔

مہربان اساتذہ کرام: جامعہ حنفیہ جہلم میں ولی کامل حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کی سرپرستی ملی تو اللہ تعالیٰ نے عقائد و نظریات درست کر دیے، مخلص اساتذہ کرام حضرت مولانا قاری ظفر اقبال صاحب، حضرت مولانا قاری نوراشرف صاحب اور حضرت مولانا عبدالودود صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت مل گئی، لاہور کے جامعہ عثمانیہ میں حضرت مولانا خلیل الرحمٰن حقانی صاحب، حضرت مولانا خادم حسین صاحب، حضرت مولانا عاشق حسین صاحب، حضرت مولانا فرید احمد حقانی صاحب حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی صاحب اور حضرت مولانا عبدالرؤف علوی صاحب جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے، پھر جامعہ اشرفیہ لاہور جیسی عظیم مادر علمی میں اللہ نے پہنچادیا، جہاں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب، حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی صاحب جیسے اساتذہ کرام سے فیض اٹھانے کی مبارک گھڑیاں نصیب ہو گئیں۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان والفضل والکرم

ان کے علاوہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب، مفکر اسلام علامہ خالد محمود صاحب، حضرت مولانا عبدالرحیم اشعر صاحب، حضرت مولانا امین صفدر اوکاڑوی صاحب، حضرت مولانا عبدالستار تونسوی صاحب جیسے اکابرین سے استفادے کا موقع بھی ملا۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان والفضل والکرم

مطالعاتی زندگی: مطالعاتی زندگی میں پانچ لاکھ سے زائد صفحات کھنگال ڈالے، پچاس ہزار سے زائد صفحات ان گناہگار ہاتھوں سے لکھے جا چکے، قرآن کریم کی تفسیر معارف لفرقان کی ۱۶ جلدیں چھوٹے سائز میں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ کتب بھی اللہ تعالیٰ نے ان گناہ گار ہاتھوں سے لکھوادی ہیں، گزشتہ دو دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے میری زیر ادارت ماہ نامہ آب حیات، ماہ نامہ تحفہ خواتین، ماہنامہ شاندار زیور طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں اور پاکستان بھر میں ارباب شوق وذوق کے ہاتھوں میں پہنچ رہے ہیں، علاوہ ازیں پاکستان کے قومی اخبارات،

رسائل وجرائد میں مختلف موضوعات وعناوین پر سینکڑوں تحریریں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم کے مطالعہ میں آئیں، جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان

معارف الفرقان

چھوٹے سائز میں معارف الفرقان میں سوالاً جواباً قرآن کریم کی چیدہ اور چنیدہ آیات مبارکہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ نے لکھوائی، جب آخر میں پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات دل میں ڈالی اور کچھ دوستوں نے راہنمائی فرمائی کہ تفسیر کا یہ بہت ہی مبارک سلسلہ ہے لہذا آپ اسے مکمل طور پر لکھیں، اس پر آخری چند مجلدات مکمل تحریر کی گئیں، پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو دوبارہ اس پر نظر ڈالی اور جو جو مقامات پہلے رہ گئے تھے انہیں بالترتیب مکمل کر دیا، یہ بھی اللہ کی توفیق ہے۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان والفضل والکرم

میرے مولیٰ کا یہ فضل واحسان عظیم ہے کہ اردو زبان میں معارف الفرقان کی پہلی جلد صرف سورۃ الفاتحہ پر ہے، جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی منفرد توجیہات وتوضیحات پر مشتمل تفسیر ہے، جسے دیکھ کر بہت سے ارباب علم ودانش اور صاحبان قلم وقرطاس نے نہ صرف ستائشی کلمات سے نوازا بلکہ دعائیہ جملوں سے بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان والفضل والکرم

جب چھوٹے سائز میں تفسیر معارف الفرقان سامنے آئی تو اللہ تعالیٰ نے دل میں یہ بات ڈالی کہ اسے دوسرے بزرگوں کی تفاسیر کی طرح بڑے سائز میں ہونا چاہیے، اس کے لیے اپنے برادر صغیر جناب محمد نوازاللہ عباسی صاحب مقیم دبئی سے گزارش کی کہ وہ سانچہ بنادیں تاکہ اس سائز میں بڑے سائز میں تفسیر پیش کی جاسکے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جانب سے جزائے خیر دے کہ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور سانچہ بنا کر روانہ کر دیا، جس پر شبانہ روز محنت کرتے ہوئے یہ کام مکمل کیا گیا۔ الحمدللہ علی ذالک الاحسان والکرم والفضل۔

پہلی طباعت میں ایک کوتاہی یہ رہ گئی تھی کہ وقفے وقفے سے مجلدات احباب کے سامنے پیش کی گئیں تھیں، اس وجہ سے کسی جلد کا کاغذ دوسری جلد کے کاغذ کے ساتھ نہیں ملتا تھا، کسی جلد میں ہلکا کاغذ استعمال کیا گیا، کسی میں بہت ہی ہلکا، کسی میں اعلیٰ معیار اور کسی میں بہت ہی اعلیٰ معیار کا کاغذ استعمال کیا گیا تھا، جس بناء پر کتاب کے ظاہری حسن وجمال میں بڑا فرق دیکھا گیا، ساتھیوں نے ملک بھر سے ہمارے اطلاع دینے پر وہ تفسیر منگوائی اور ہم نے بھی اپنی بساط اور ہمت کے مطابق جہاں تک ہاتھ پہنچتا تھا وہ تفسیر وہاں تک پہنچائی، لیکن مصنفین عصر حاضر کے روایتی طریقہ یعنی طباعت کتاب کے بعد اس کی منہ دکھلائی اور تقریب رونمائی سے عمداً گریز کیا، چونکہ میں اپنے کو اس قابل بالکل نہیں سمجھتا اور نہ ہی اپنی تفسیر معارف الفرقان کو اس لائق سمجھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تفسیر معارف الفرقان لکھنے کے دوران ایک بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ عربی زبان میں لکھی گئی اکثر وبیشتر تفاسیر پر نگاہ پڑی، علم وفضل کے اس سمندر میں غوطہ زنی کا بار بار موقع ہاتھ آتا رہا، ارباب تفسیر کے تفسیری حواشی سے حظ وافر ملا، اسی طرح اردو زبان میں لکھی گئیں تمامی تفاسیر پر نگاہ پڑی، اللہ تعالیٰ ان تمام ارباب تفسیر کو قرآن کریم کی اس عظیم الشان خدمت پر جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم

یہ بات میں عرض کرچکا ہوں کہ جب معارف الفرقان لکھنے کا آغاز ہوا تو اس وقت دو تفاسیر پر بیک وقت کام شروع کر دیا گیا، ایک کا نام مطالعہ قرآن رکھ دیا، یہ تفسیر سوالاً جواباً تھی، جب کہ معارف الفرقان کا انداز عام تفاسیر کی طرح تھا، معارف الفرقان کی جلد اول اس کا ایک نمونہ ہے، جو صرف سورت الفاتحہ پر مشتمل ہے، اس کا انداز آپ نے دیکھ لیا، اسی طرح باقی بھی کرنا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو شاید منظور نہیں تھا، ایک حادثہ جو شالیمار باغ کے قریب لنک روڈ لاہور میں پیش آیا تھا، جس میں میری پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، بائیں ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، پانچ ماہ بستر پہ پڑا رہا، اس دوران لکھنے پڑھنے کا باقی کام موقوف رہا، ہاں اس دوران طوعاً وکرہاً اپنی ادارت میں شائع ہونے والا ماہوار رسالہ ماہ

نامہ آب حیات تیار ہوتا رہا اور زیور طباعت سے آراستہ ہوتا رہا، اس حادثہ کے بعد ہمت جواب دے گئی، حوصلہ نہ پڑا کہ میں ان دونوں تفاسیر پر کام جاری رکھ سکوں۔

چنانچہ سوالاً جواباً تیار کی جانے والی تفسیر چونکہ ماہ نامہ آب حیات میں قسط وار شائع ہو رہی تھی، اس لیے وہ سلسلہ بالکل موقوف نہیں ہوا، ہاں معارف الفرقان کے عنوان سے لکھی جانے والی تفسیر کا سلسلہ تحریر رک گیا، جب مطالعہ قرآن کے نام سے کوئی آٹھ جلدیں شائع ہو گئیں تو اب اللہ تعالیٰ نے دل میں یہ بات ڈالی کہ مطالعہ قرآن کا نام بدل کر اسے معارف الفرقان میں شامل کیا جائے، چنانچہ یوں مطالعہ قرآن کی جس قدر جلدیں تیار ہوئی تھیں انہیں معارف الفرقان کا نام دے دیا گیا اور یوں یہ تفسیر سولہ جلدوں میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

اللہ تعالیٰ اس تفسیر کو میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے دوست احباب کے لیے، میرے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے، یہ متاع فقیر ہے، اس کے توشہ دان علمی میں یہی سوغات ایسی ہیں جو اپنے اللہ کی بارگاہ میں پیش کر رہا ہے کہ وہ کائنات کا مالک اس بضاعۃ مزجات کو قبول فرمائے۔

خادم اسلام، **محمود الرشید حدوٹی**

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۱۲ اکتوبر ۲۰۲۲ء بروز اتوار، رات ڈیڑھ بجے

معارف الفرقان

شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمود الرشید حدوٹی
پرنسپل جامعہ رشیدیہ لاہور

سُورَۃُ البَقَرَۃ آیات ۱ تا ۱۴۱، پارہ اول مکمل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ کا تعارف

سوال سورۃ البقرہ کا تعارف کروائیے۔

جواب بقرہ عربی زبان میں گائے کو کہا جاتا ہے، اس سورۃ مبارکہ میں بنی اسرائیل کی اس گائے کا ذکر ہے جو ایک مقتول کے قتل کی اطلاع پانے کے لیے امر ربانی سے ذبح کی گئی تھی، اس لیے یہاں عام گائے مراد نہیں ہے بلکہ وہ خاص گائے مراد ہے، اس لیے اس پر الف لام معرفہ کا لاکر البقرہ کہا گیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا نام دو وجہ سے رکھا گیا ہے ایک تو اس لیے کہ بقر جس کا ذکر اس سورت میں آیا اس کے علاوہ اور سورت میں اس کا ذکر نہیں، پس گائے کا واقعہ اسی سورت کا خاصہ ہے اور امتیاز پیدا کرنے کے مقام پر شے کے خاصہ کا ذکر ضروری ہے، دوسرے یہ کہ بقرہ کا قصہ دین کے تمام ضروری مسائل پر دلالت کرتا ہے، پس واقعہ گویا تمام قرآن پاک کا خلاصہ ہے، خصوصاً اس سورت کے مضامین کا خلاصہ ہے۔ (تفسیر عزیزی جلد اول)

یہ مدنی سورت ہے، جو دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیات پر مشتمل ہے، اس میں چھ ہزار اکیس (۶۰۲۱) کلمات ہیں، پچیس ہزار پانچ سو (۲۵۵۰۰) حروف ہیں، طوالت کے لحاظ سے قرآن کریم کی باقی سورتوں کی بہ نسبت لمبی سورت ہے، اس سورت کی مختلف آیات میں بے شمار شرعی احکامات بیان کیے گئے ہیں جو دوسری سورتوں میں نہیں ہیں۔

ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ سورۃ البقرہ میں شریعتِ مطہرہ کے پانچ سو احکامات بیان کیے گئے ہیں، اس میں ایک آیت تمام قرآنی آیات میں لمبی آیت ہے جس میں ایک دوسرے کو قرض دینے لینے اور اسے لکھنے اور گواہی کا حکم ہے، یہ طویل آیت بیس شرعی احکامات پر مشتمل ہے، اس میں بہت سے

احکامات و مضامین کا ذکر ہے مگر بنی اسرائیل کی اس گائے کی اہمیت کے پیش نظر اسی نام سے یہ سورت منسوب کر دی گئی ہے۔

زمانہ نزول سورۃ البقرہ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ مدینہ شریف میں نازل ہونے والی پہلی سورت ہے، سوائے ایک آیت وَاتَّقُوا يَوْماً تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ کے، کیونکہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر کو مکہ کے منیٰ نامی مقام میں نازل ہوئی۔ (لباب التاویل)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ رَمَى الْجَمْرَةَ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، فَجَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنًى عَنْ يَمِينِهِ، ثُمَّ قَالَ: هَذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ (بخاری و مسلم، تفسیر ابن کثیر ج ۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطن وادی میں رمی جمرہ کیا، ایسے میں کہ بیت اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب تھا جب کہ منیٰ دائیں جانب تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سورۃ بقرہ اتاری گئی۔

شان نزول: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ایسی کتاب نازل فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا جو نہ پانی سے دھو کر مٹائی جا سکے نہ پرانی ہو، جب قرآن پاک نازل ہوا تو فرمایا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کہ وہ کتاب موعود یہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے ایک کتاب نازل فرمانے اور بنی اسماعیل میں سے ایک رسول بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا، جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی جہاں یہود بکثرت تھے تو الم ذٰلِكَ الْكِتٰبُ نازل فرما کر اس وعدے کے پورے ہونے کی خبر دی۔ (تفسیر لباب التاویل فی معنیٰ التنزیل۔ خازن)

فضائل سورۃ البقرہ

سارا قرآن ہی دلکش اور حسن و جمال سے مزین ہے لیکن بعض سورتیں اور آیات اس وقت باقیوں سے فوقیت لے جاتی ہیں جب ان کا ذکر رب العالمین کے بعد نبی کریم رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے فرمادیں، چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات میں سے وہ چیدہ اور چنیدہ آیات

انتہائی قابل توجہ ہوتی ہیں جن کے بارے میں امتیازی فضائل آئے ہیں، ان میں سورۃ البقرہ اور اس کی بعض آیات ہیں جو امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ بَيْنَمَا جِبْرِيلُ عليهِ السَّلام قَاعِدٌ عِندَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّم سَمِعَ نَقِيضًا مِنْ فَوْقِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَه فَقَالَ: هَذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ اليَوْمَ ولَمْ يُفْتَح قَطُّ إِلاَّ اليَوْمَ فَنَزَلَ مِنه مَلَكٌ فقالَ: هذا مَلَكٌ نَزَلَ إِلى الأَرْضِ لم يَنْزِلْ قَطُّ إِلاَّ اليَوْمَ فَسَلَّمَ وقال: أَبشِرْ بِنُورَينِ أُوتِيتَهُمَا، لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبلَكَ: فَاتِحَةِ الكِتَابِ، وخَوَاتِيمَ سُورَةِ البَقَرَةِ، لَن تَقرأَ بِحرْفٍ مِنْهَا إِلاَّ أُعْطِيتَه (مسلم)

اسی دوران کہ جب جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک اپنے اوپر ایک آواز سنی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز سن کر اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا، پھر جبریل امین نے فرمایا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج ہی کھولا گیا ہے، آج کے دن سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا، پھر اس میں سے ایک فرشتہ اترا، پھر فرمایا کہ یہ فرشتہ زمین کی طرف آج ہی اُترا ہے آج سے پہلے کبھی نہیں اُترا، پھر اس نے سلام کیا، اور فرمایا کہ آپ کو دو نوروں کی خوشخبری ہو، یہ دو نور آپ ہی کو دیے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے، وہ دو نور سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی آخری آیات ہیں، ان میں سے آپ جس کی تلاوت کریں گے، آپ کو اس کا مصداق مل جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ وَلَا تَجْعَلُوهَا قُبُورًا، وَزَيِّنُوا أَصْوَاتَكُمْ بِالْقُرْآنِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يُنَفَّرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ (فضائل القران للقاسم بن سلام) اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ اور اپنی آوازوں کو قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ خوبصورت بناؤ کیونکہ شیطان ایسے گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِنَّ الشَّیْطَانَ لَیَخْرُجُ مِنَ الْبَیْتِ إِذَا سَمِعَ سُورَۃَ الْبَقَرَۃِ تُقْرَأُ فِیہِ (فضائل القران للفریابی) بے شک شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے جب وہ سورۃ البقرہ کو سنتا ہے کہ وہ اس گھر میں پڑھی جارہی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بہت خوش اِلحانی سے قرآن مجید پڑھتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں سورۃ بقرہ پڑھ رہا تھا، اس وقت میرا گھوڑا بندھا ہوا تھا اور میرا بیٹا یحییٰ میرے قریب لیٹا ہوا تھا، وہ اس وقت کم سن بچہ تھا، اچانک وہ گھوڑا اچھلنے لگا، میں کھڑا ہو گیا، مجھے اس وقت صرف اپنے بیٹے یحییٰ کے متعلق تشویش تھی، پھر گھوڑا پر سکون ہو گیا، اور میں نے وہ سورت پڑھنی شروع کر دی، گھوڑا پھر اُچھلنے لگا میں پھر کھڑا ہو گیا اور مجھے صرف اپنے بیٹے یحییٰ کی فکر تھی میں نے پھر پڑھنا شروع کیا اور گھوڑے نے پھر اچھلنا شروع کیا، اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان سے ایک سائبان کی طرح کوئی چیز اُتر رہی ہے جس میں روشن چراغ ہیں، میں خوفزدہ ہوا اور صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے یہ واقعہ بیان کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو یحییٰ! پڑھو میں نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میں نے پڑھا تو گھوڑا اچھلنے لگا اور مجھے اپنے بیٹے کی فکر تھی آپ نے فرمایا اے ابن حضیر! پڑھو، وہ کہتے ہیں: میں نے پڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سر کے اوپر سائبان کی مثل کوئی چیز تھی اور اس میں چراغ روشن تھے، میں خوفزدہ ہو گیا، آپ نے فرمایا: یہ فرشتے ہیں جو تمہاری آواز کی وجہ سے قریب آئے ہیں۔ اگر تم صبح تک پڑھتے رہتے تو لوگ ان کو دیکھ لیتے۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ جَرِّدُوا الْقُرْآنَ لِیَرْبُوَ فِیہِ صَغِیرُکُمْ، وَلَا یَنْأَی عَنْہُ کَبِیرُکُمْ، فَإِنَّ الشَّیْطَانَ یَفِرُّ مِنَ الْبَیْتِ یَسْمَعُ تُقْرَأُ فِیہِ سُورَۃُ الْبَقَرَۃِ صرف قرآن کریم کی تلاوت کرو تاکہ تمہارے چھوٹے اس سے قوت حاصل کریں اور تمہارے بڑے بھی اس سے دور نہ رہیں، پس شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۃ البقرہ پڑھے جانے کی آواز سنتا

ہے۔(فضائل القرآن للفریابی)

حضرت شعبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو التیاح سے اس بارے میں بات کی، کیونکہ وہ عربی تھے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ صرف قرآن کریم کی تلاوت کریں، میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مَا جَرَّدُوا الْقُرْآنَ کہ صرف قرآن کریم کی تلاوت کرو کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کو خلط ملط نہ کرو۔ خالص قرآن کریم کی تلاوت کرو۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا کہ إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ مَأْدُبَةُ اللَّهِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا فَلْيَفْعَلْ، فَإِنَّ أَصْغَرَ الْبُيُوتِ بَيْتٌ لَيْسَ فِيهِ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ شَيْءٌ، كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ الَّذِي لَا عَامِرَ لَهُ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ أَنْ يَسْمَعَ فِيهِ سُورَةَ الْبَقَرَةِ تُقْرَأُ فِيهِ» (فضائل القرآن للفریابی)

یہ قرآن اللہ کا دستر خوان ہے، جو تم میں سے استطاعت رکھتا ہے اس میں سے کچھ حاصل کرنے کی تو وہ ایسا کرلے، کیونکہ سب گھروں میں سے ذلیل ترین گھر وہ ہے جس میں کتاب اللہ کا کچھ حصہ بھی نہ ہو، وہ ویران گھر کی طرح ہے، اسے کوئی آباد کرنے والا نہیں ہے اور شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جب وہ اس میں سنتا ہے کہ سورۃ البقرہ پڑھی جارہی ہے۔

حضرت نواس بن سلیمان کلابی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن قرآن مجید اور اس پر عمل کرنے والوں کو لایا جائے گا، ان کے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہوں گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سورتوں کی تین مثالیں بیان فرمائیں جن کو میں آج تک نہیں بھولا، فرمایا: وہ ایسی ہیں جیسے وہ بادل ہوں، یا وہ دو سیاہ سائبان ہوں جن کے درمیان نور ہو، یا صف باندھے ہوئے پرندوں کی دو قطاریں ہوں، وہ سورتیں اپنے پڑھنے والوں کی وکالت اور حمایت کریں گی۔ یعنی قیامت کے دن اللہ ایک مخلوق پیدا فرمائے گا جو بادل، سائبان یا پرندوں کی قطاروں کی طرح ہوگی اور

قرآن پڑھنے والوں اور قرآن پر عمل کرنے والوں پر سایہ کرے گی۔

حضرت تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ أَيُّ الْقُرْآنِ أَشْرَفُ؟ قَالَ: الْبَقَرَةُ قَالَ: قُلْتُ: فَأَيُّ آيَةٍ أَشْرَفُ قَالَ: آيَةُ الْكُرْسِيِّ کون سا قرآن بزرگی والا ہے، تو انہوں نے جواب دیا کہ سورۃ البقرہ، فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ کون سی آیت زیادہ بزرگی والی ہے؟ تو جواب دیا کہ آیت الکرسی زیادہ بزرگی والی آیت ہے۔ (فضائل القرآن للفریابی)

حضرت ابو الاحوص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کی تلاوت کی، تو آپ نے فرمایا لَقَدْ قَرَأْتَ سُورَتَيْنِ فِيهِمَا اسْمُ اللَّهِ الْأَعْظَمُ الَّذِي إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ، وَإِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى تم نے دو ایسی سورتوں کی تلاوت کی ہے جن میں اللہ کا اسم اعظم موجود ہے، جس کے ذریعے اس سے دعا کی جائے تو وہ جواب دیتا ہے اور جب اس کے ذریعے اس سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔ (فضائل القرآن فریابی)

حضرت عبدالملک بن عمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے سورۃ البقرہ اور آل عمران کی تلاوت کی تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ لَقَدْ قَرَأْتَ سُورَتَيْنِ فِيهِمَا اسْمُ اللَّهِ الْأَعْظَمُ الَّذِي إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ تم نے ایسی دو سورتوں کی تلاوت کی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے، جب اس کے ذریعے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔ (فضائل القرآن للفریابی)

حضرت اسماء بنت یزید رحمہا اللہ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسْمُ اللَّهِ الْأَعْظَمُ فِي هَاتَيْنِ الْآيَتَيْنِ {وَإِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ} [البقرة: ۱۶۳]، وَفَاتِحَةُ سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ: {الم اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ} [آل عمران: ۲] (فضائل القرآن فریابی) اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیات میں ہے، ایک سورۃ البقرہ کی آیت ۱۶۳ میں اور دوسرا سورۃ آل عمران کے شروع میں آیت نمبر ۲ میں۔

حضرت عبداللہ بن علاء بن زبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو عبدالرحمٰن قاسم

رحمہ اللہ کو سنا وہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت بیان کر رہے تھے، فرمایا کہ اسْمُ اللّٰهِ الْأَعْظَمِ الَّذِي إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ فِي سُوَرٍ ثَلَاثٍ: فِي الْبَقَرَةِ، وَآلِ عِمْرَانَ، وَطٰهٰ. يَعْنِي الْحَيَّ الْقَيُّومَ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم وہ ہے جب اس کے ذریعے اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے، وہ تین سورتوں میں ہے، ایک سورۃ البقرہ، ایک سورۃ آل عمران اور ایک سورۃ طٰہٰ میں یعنی الحي القیوم۔ (ایضاً)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اقْرَءُوا هَاتَيْنِ الْآيَتَيْنِ، خَاتِمَةَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّ رَبِّي أَعْطَانِيهِمَا مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ) ان دو آیات کو پڑھو، سورۃ البقرہ کی آخری، کیونکہ یہ وہ آیات ہیں جو اللہ نے مجھے عرش کے نیچے سے عطا فرمائی ہیں۔ (فضائل القرآن للفریابی)

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَأُعْطِيتُ هَؤُلَاءِ الْآيَاتِ خَوَاتِمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، لَمْ يُعْطَ أَحَدٌ كَانَ قَبْلِي مجھے یہ آیات عرش کے نیچے کے خزانے سے عطا کی گئی ہیں وہ آیات سورۃ البقرہ کی آخری آیات ہیں، یہ مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ (فضائل القرآن للفریابی)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت میں یوں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أُعْطِيتُ ثَلَاثًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ كَانَ قَبْلِي: أُحِلَّ لِي الْغَنَائِمُ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وَأُعْطِيتُ خَوَاتِمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ مجھے تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں، میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئی ہیں، میرے لیے زمین سجدہ گاہ اور پاک بنائی گئی ہے اور مجھے سورۃ البقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے عطا کی گئی ہیں۔ (فضائل، فریابی)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے، اسی دوران ان سے حضرت عبد الرحمٰن بن یزید رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا تو دورانِ طواف ہی ان سے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ قَرَأَ الْآيَتَيْنِ مِنْ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ جس نے سورۃ البقرہ کی دو آیات رات کو پڑھ لیں وہ اس

رات میں اس کے لیے کافی ہو جائیں گی۔ (فضائل القرآن لابن الضریس)

حضرت ابو الاحوص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

إِنَّ أَصْغَرَ الْبُيُوتِ، الْجَوْفُ الصِّفْرُ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ، وَلَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ يَضَعُ إِحْدَى رِجْلَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى، ثُمَّ يَتَغَنَّى، وَيَدَعُ أَنْ يَقْرَأَ سُورَةَ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَفِرُّ، وَيَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ. (فضائل القرآن لابن الضریس)

گھروں میں سب سے ذلیل ترین گھر وہ ہے جو اللہ کی کتاب سے خالی ہو اور میں تم میں سے کسی کو اس طرح نہ پاؤں کہ وہ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اللہ کی کتاب سے بے نیاز ولاپروا ہو جائے اور سورۃ البقرہ کی تلاوت بھی چھوڑ دے، کیونکہ شیطان بھاگتا ہے اور اس گھر سے نکل جاتا ہے جس میں سورت البقرہ کی تلاوت ہو رہی ہوتی ہے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ تُوِّجَ بِهَا تَاجًا فِي الْجَنَّةِ (فضائل القرآن لابن الضریس) جس نے سورت البقرہ رات میں تلاوت کی تو اسے اس کے بدلے میں جنت میں تاج پہنایا جائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رایت ہے، فرماتے ہیں کہ مَنْ قَرَأَ أَرْبَعَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، وَآيَةَ الْكُرْسِيِّ، وَآيَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ آخِرِهَا، لَمْ يَقْرَبْهُ وَلَا أَهْلَهُ يَوْمَئِذٍ شَيْطَانٌ، وَلَا شَيْءٌ يَكْرَهُهُ، وَلَا تُقْرَأُ عَلَى مَجْنُونٍ إِلَّا أَفَاقَ (فضائل القرآن لابن الضریس) جس نے سورۃ البقرہ کی ابتدائی چار آیات کی تلاوت کی اور آیت الکرسی اور دو آیات اس کے بعد والی اور تین آیات سورۃ البقرہ کے اخیر والی تو شیطان اس دن اس کے اور اس کے گھر والوں کے قریب نہیں آتا اور نہ کوئی ایسی چیز جسے وہ ناپسند کرتا ہے، جب یہ آیات کسی مجنون پر پڑھی جاتی ہیں تو اسے افاقہ ہو جاتا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ اللَّهَ

تَعَالَى كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ بِأَلْفَيْ عَامٍ فَأَنْزَلَ مِنْهُ آيَتَيْنِ خَتَمَ بِهِمَا سُورَةَ الْبَقَرَةِ، فَلَا تُقْرَآنِ فِي بَيْتٍ فَيَقْرَبُهُ شَيْطَانٌ (فضائل القرآن لابن الضریس)

بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے دوہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی، اس میں سے دوآیات نازل فرمائیں وہ دوآیات سورت البقرہ کی آخری آیات ہیں، یہ دوآیات کسی گھر میں پڑھی جائیں تو شیطان اس کے قریب نہیں آتا۔

ایک شخص نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑے ہو کر سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کی تلاوت کی، حضرت کعب رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو نے سورۃ البقرہ اور آل عمران کی تلاوت کی ہے، اس نے عرض کیا کہ جی ہاں، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّ فِيهِمَا اسْمَ اللَّهِ الَّذِي إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ، فَقَالَ الرَّجُلُ: أَخْبِرْنِي. فَقَالَ: وَاللَّهِ لَا أُخْبِرُكَ، إِنِّي لَوْ أَخْبَرْتُكَ لَأَوْشَكْتَ أَنْ تَدْعُوَ بِدَعْوَةٍ أَهْلَكَ أَنَا وَأَنْتَ (فضائل القرآن للضریس)

قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کا اوہ نام ہے جب اس کے ذریعے دعا کی جائے تو وہ جواب دیتا ہے، اس آدمی نے پوچھا کہ مجھے اس بارے میں فرمایئے، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اللہ کی قسم میں تجھے نہیں بتاؤں گا، کیونکہ اگر میں تجھے وہ بتادوں تو ہو سکتا ہے کہ تو اس کے ذریعے دعا کرے اور میں اور تو دونوں ہلاک ہو جائیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

أَفْضَلُ الْقُرْآنِ السُّورَةُ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا الْبَقَرَةُ، وَأَعْظَمُهَا آيَةً، آيَةُ الْكُرْسِيِّ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ يَسْمَعُ تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَبُهُ قَالَ: مَنْ قَرَأَ مِائَةَ آيَةٍ لَمْ يُحَاجَّهُ الْقُرْآنُ، وَمَنْ قَرَأَ مِائَتَيْ آيَةٍ كُتِبَ لَهُ قُنُوتُ لَيْلَةٍ، وَمَنْ قَرَأَ مِنَ الْخَمْسِمِائَةِ آيَةٍ إِلَى أَلْفِ آيَةٍ، أَصْبَحَ لَهُ قِنْطَارٌ فِي الْجَنَّةِ، وَهُوَ دِيَةُ أَحَدِكُمْ وَإِنَّ أَصْغَرَ الْبُيُوتِ فِي الْخَيْرِ بَيْتٌ لَا يُقْرَأُ فِيهِ الْقُرْآنُ (فضائل القرآن للشیخ الضریس)

قرآن کریم کی بہترین وہ سورت ہے جس میں گائے کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں سب سے بڑی آیت آیت الکرسی ہے اور شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے جس میں سورت البقرہ کی تلاوت سنتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا جس نے ایک سو آیات کی تلاوت کی اس سے قرآن کریم جھگڑا نہیں کرے گا اور جس نے دو سو آیات تلاوت کیں تو اس کے لیے آج کی رات قنوت لکھ دی گئی، جس نے پانچ سو آیات سے ہزار تک آیات کی تلاوت کی اس کے لیے جنت میں ڈھیر لگ جاتا ہے اور وہ تم میں سے کسی کی دیت ہے اور خیر کے لحاظ سے سب سے خالی گھر وہ ہیں جن میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں کی جاتی۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامًا، وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ الْبَقَرَةُ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَخْرُجُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ، وَأَصْفَرُ الْبُيُوتِ الْجَوْفُ الَّذِي لَيْسَ فِيهِ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ شَيْءٌ (فضائل القرآن للضریس)

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی کوہان ہے جب کہ قرآن کریم کی کوہان سورۃ البقرہ ہے اور شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے جس میں سورۃ البقرہ پڑھی جاتی ہے اور گھروں میں سب سے زیادہ خالی خولی گھر وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کی کتاب میں سے کچھ بھی نہ پڑھا جائے۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ مَنْ قَرَأَ الْعَشْرَ آيَاتٍ مِنْ سُورَةِ الْبَقَرَةِ لَمْ يَرَ الشَّيْطَانَ، وَلَا شَيْئًا يُرِيبُهُ فِي أَهْلِهِ، وَلَا مَالِهِ لَيَبْتَدِئُ الْأَرْبَعَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ وَآيَةِ الْكُرْسِيِّ وَآيَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَالثَّلَاثُ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ قَالَ حُسَيْنٌ: تَقْرَأُ بِهَا فِي صَلَاةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ. قَالَ: وَلَمْ تُقْرَأْ عَلَى مَجْنُونٍ إِلَّا أَفَاقَ مِنْ جُنُونِهِ (فضائل القرآن)

جس نے سورۃ البقرہ کی دس آیات کی تلاوت کی تو وہ شیطان کو اور نہ کسی ایسی چیز کو دیکھے گا جو اس کے گھر والوں میں اور اس کے مال میں اسے شک وریب میں مبتلا کرتی ہے، چاہیے کہ ابتدا سورۃ البقرہ کی ابتدائی چار آیات سے کرے اور آیت الکرسی اور دو آیات اس کے بعد والی اور تین آیات سورۃ البقرہ کے اختتام سے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہیں نماز میں پڑھو مجھے یہ زیادہ پسندیدہ ہے، فرمایا کہ

جو کسی مجنون پر انہیں پڑھے گا تو اس کے جنون سے افاقہ ہو جائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد {وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي} [الحجر: ۸۷] اور ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جائے والی عطا کی ہیں، سے مراد سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الانعام، سورۃ الاعرف اور یونس لیتے ہیں۔

حضرت محمد بن المنکدر رحمہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع روایت بیان کرتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کی آخری آیات دعا ہیں، یہ آیات دعائیہ آیات ہیں جو جنت میں ہوں گی اور رحمٰن کو راضی کریں گی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ مَا خَلَقَ اللّٰهُ سَمَاءً وَلَا أَرْضًا، وَلَا سَهْلًا، وَلَا جَبَلًا أَعْظَمَ مِنْ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، وَأَعْظَمُ آيَةٍ فِيهَا آيَةُ الْكُرْسِيِّ (فضائل للضریس) اللہ تعالیٰ نے کوئی آسمان، کوئی زمین، کوئی میدان، کوئی پہاڑ سورۃ البقرہ سے عظیم پیدا نہیں کیا، اس میں ایک عظیم الشان آیت ہے جسے آیت الکرسی کہتے ہیں۔

ہر لحاظ سے قرآن کریم عظمت و رفعت والی کتاب ہے، اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سراسر انسانی فلاح و بہبود کے لیے نسخہ اکسیر ہے، تمام مسلمانوں کو اس پر دل و جان سے عمل کرنا چاہیے۔

حروفِ مقطعات

سوال قرآن کریم کی چند آیات کے شروع میں بہت ہی مختصر سے کچھ کلمات ہیں، جن کا ترجمہ اور مفہوم کسی جگہ واضح طور پر موجود نہیں ہے، انہیں اہل علم حروف مقطعات سے تعبیر کرتے ہیں، حروف مقطعات کے بارے میں تفصیل بیان فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کا آغاز حروف مقطعات سے فرمایا ہے، حروف مقطعات سے شروع فرما کر قرآنی اعجاز اور قرآنی وصف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور ایک باریک اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی چھوٹی سی چھوٹی سورت کا مقابلہ یا اس جیسی آیت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اشارہ ہے اس طرف کہ یہ ربانی کلام ہے، یہ عرش بریں کا پیام ہے اس کی طرح کوئی فصیح و بلیغ انسان بھی

اپنا کلام نہیں لا سکتا، کتنا قادر الکلام ہی کوئی کیوں نہ ہو اس جیسا کلام نہیں لا سکتا۔

جن لوگوں میں قرآن کریم اتارا گیا، چاہے وہ مکہ کے باشندے تھے یا مدینہ کے رہائشی، ان سب کی مادری زبان عربی تھی، قرآن عربی زبان میں ہی اتارا گیا، عربوں کی زبان کی ابتدا الف، ب، ت، ث سے ہی ہوتی ہے، اہل عرب کے حروف تہجی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ الف، لام، میم حروف تہجی ہیں، جو عرب استعمال کرتے ہیں، اس میں بھی ایک باریک اشارہ کر دیا گیا کہ کسی دماغ میں یہ بات اگر آتی ہے کہ یہ تو انسانی کلام جیسا کلام ہے، یہ انسانی زبان میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اس جیسا کوئی کلام لا کر دکھایا جائے۔

الف، لام، میم انسانی کلام اور گفتگو کی طرح ہے تو پھر اعتراض کرنے والے، شکوک و شبہات پیدا کرنے والے، لوگوں کے دماغوں میں الجھنیں پیدا کرنے والے اس جیسا کوئی مختصر کلام پیش کر کے دکھا دیں مگر تاریخ گواہ ہے، کلام الٰہی گواہ ہے، چشمِ فلک گواہ ہے کہ کوئی بھی اس معجز نما کلام جیسا کلام پیش نہیں کر سکا۔

الٓمٓ: یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات انتیس سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور وہ یہ ہیں ① اَلبَقَرہ ② آلِ عِمرَان ③ اَلاَعرَاف ④ یُونُس ⑤ ھُود ⑥ یُوسُف ⑦ اَلرَّعد ⑧ اِبرَاھِیم ⑨ اَلحجر ⑩ مَریَم ⑪ طٰہٰ ⑫ اَلشُّعَرَاءُ ⑬ اَلنَّمل ⑭ اَلقَصَص ⑮ اَلعنکَبُوت ⑯ اَلرُّوم ⑰ لُقمَان ⑱ اَلسَّجدَۃُ ⑲ یٰسین ⑳ صٓ ㉑ اَلمُؤمِن ㉒ حٰمٓ اَلسَّجدَۃ ㉓ اَلشُّوریٰ ㉔ اَلزُّخرُف ㉕ اَلدُّخَانُ ㉖ اَلجَاثِیَۃُ (۲۷) اَلاَحقَافُ، (۲۸) قٓ (۲۹) اَلقَلَمُ۔

ان سورتوں کی ابتدا میں جو حروف مقطعات آئے ہیں وہ یہ ہیں ا ل م۔ اَلٓمٓصٓ۔ ا ل رٰ۔ اَلٓمٓرٰ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ۔ طٰسٓ۔ طٰسٓمٓ۔ طٰہٰ۔ یٰسٓ۔ صٓ۔ قٓ۔ نٓ، ان میں ا ل م ر چھ جگہ ہے۔ اور ا ل ر پانچ جگہ ہے اور حٰمٓ چھ جگہ ہے اور طٰسٓمٓ دو جگہ ہے۔ اور ان کے علاوہ باقی سب ایک ایک جگہ ہیں۔ کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہیں۔

حروف مقطعات کا مفہوم: اہل علم و عرفان کی اس بارے میں آراء مختلف ہیں کہ آیا ان حروف مقطعات کا کوئی معنیٰ مفہوم اور مطلب ہے کہ نہیں، بعض کہتے ہیں کہ ان حروف مقطعات کا معنیٰ، مفہوم اور مطلب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، بعض اہل علم نے اپنی اپنی فہم و دانست کے مطابق ان کا کچھ نہ کچھ معنیٰ بیان کیا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا مطلب ہے؟ یہ سورتوں کے شروع میں کیوں لائے گئے ہیں؟ ان کو ابتدا میں رکھنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مفسر قرآن امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الم اور دوسری سورتوں کے آغاز میں استعمال ہونے والے اس طرح کے کلمات کے بارے میں دو قول ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ أَنَّ هَذَا عِلْمٌ مَسْتُورٌ وَسِرٌّ مَحْجُوبٌ اسْتَأْثَرَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى بِهِ یہ ایک پوشیدہ راز ہے، ایسا چھپا ہوا راز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے۔ خلیفہ اول بلا فصل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لِلّٰهِ فِي كُلِّ كِتَابٍ سِرٌّ وَسِرُّهُ فِي الْقُرْآنِ أَوَائِلُ السُّوَرِ، ہر کتاب میں کچھ راز ہوتے ہیں جب کہ قرآن کریم میں اللہ کا راز سورتوں کے بتدائی کلمات ہیں۔ خلیفہ چہارم حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ إِنَّ لِكُلِّ كِتَابٍ صَفْوَةٌ وَصَفْوَةُ هَذَا الْكِتَابِ حُرُوفُ التَّهَجِّي ہر کتاب کی کچھ چنیدہ باتیں ہوتی ہیں جب کہ اس کتاب (قرآن کریم) کی چنیدہ باتیں حروف تہجی ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی)

مفسر قرآن حضرت علامہ بیضاوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ

وَقِيلَ: إِنَّهُ سِرٌّ اِسْتَأْثَرَ اللّٰهُ بِعِلْمِهِ وَقَدْ رُوِيَ عَنِ الْخُلَفَاءِ الْأَرْبَعَةِ وَغَيْرِهِم مِّنَ الصَّحَابَةِ مَا يَقْرُبُ مِنهُ، وَلَعَلَّهُم أَرَادُوْا أَنَّهَا أَسْرَارٌ بَيْنَ اللّٰهِ تَعَالَى وَرَسُوْلِهِ وَرُمُوْزٌ لَّمْ يُقْصَدْ بِهَا إِفْهَامُ غَيْرِهِ إِذْ يُبْعَدُ الْخِطَابُ بِمَا لَا يُفِيْدُ (انوار التنزیل واسرار التاویل ج ۱، ۳۵)

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مراد یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز اور رموز ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو ان حروف

مقطعات پر مطلع کرنے کا قصد نہیں کیا گیا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ حضور ﷺ کو بھی ان حروف کے معانی کا علم نہ ہو ورنہ لازم آئے گا کہ غیر مفید کلام کے ساتھ حضور ﷺ سے خطاب کیا گیا اور یہ بہت بعید ہے۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَالَّذِی یَغلِبُ عَلَی الظَّن أَنَّ تَحقِیقَ ذٰلِكَ عِلمٌ مَّستُورٌ وَّسِرٌّ مَّحجُوبٌ عَجَزَتِ العُلَمَاءُ عَن إِدرَاكِهِ وَقَصُرَت خُیُولُ الخَیَالِ عَن لِحَاقِهِ (روح المعانی) ظن غالب یہ ہے کہ حروف مقطعات کا علم مخفی ہے، علماء اس کی مراد پانے سے عاجز ہیں، خیالات اس کے احاطے سے قاصر ہیں جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا، سِرُّ اللهِ تَعَالَی فَلَا تَطلُبُوهُ اللہ تعالیٰ کے بھیدوں کا کھوج نہ لگاؤ۔

بَینَ المُحِبِّینَ سِرٌّ لَیسَ یُفشِیهِ ... قَولٌ وَّلَا قَلَمٌ لِلخَلقِ یَحکِیهِ

باہمی محبت رکھنے والوں کے درمیان کچھ بھید اور راز ہوتے ہیں، جنہیں قول و قلم کے ساتھ مخلوق کے سامنے بیان کر کے فاش نہیں کرتے۔

اسی لیے علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ یہاں فرماتے ہیں، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی معرفت صرف اولیاء کرام رحمہم اللہ کو ہے جو وارث علم رسول ہیں، ان کو اسی دربار سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حروف خود ان کو اپنا معنی بتا دیتے ہیں نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں میں سنگریزوں نے اللہ کی تسبیح کی اور گوہ اور ہرن نبی کریم ﷺ سے ہم کلام ہوئے۔ (روح المعانی)

بعض علماء نے کہا: اگر ان حروف کا کوئی معنی نہ ہو تو یہ مہمل ہوں گے، یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ مراد ہو کہ تمام لوگوں کو ان حروف کا معنی معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں اور اگر یہ مراد ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کا معنی معلوم ہو تو کوئی مومن اس میں شک نہیں کر سکتا اور ہر صاحب ایمان کا یہ ایمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان حروف کے معنی معلوم ہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں، میرے نزدیک حق یہ ہے

حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان اَسرار ہیں، ان حروف سے عام لوگوں کو سمجھانے کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ صرف رسول اللہ ﷺ کو ان حروف سے افہام مقصود تھا یا رسول اللہ ﷺ اپنے کامل متبعین میں سے جن کو چاہیں ان کا معنی سمجھا دیں۔ (تفسیر مظہری)

علامہ سجاوندی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ کے درمیان اَسرار ہیں اور کبھی محبین کے درمیان کچھ کلمات بہ طور معمہ ہوتے ہیں، ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ ان کلمات کو محرمان راز کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رَاسِخِین فِي العِلم (جن کے علم میں پختگی اور مضبوطی ہوتی ہے) سے ہوں اور میں ان علماء سے ہوں جن کو ان کی تاویل کا علم ہے، اسی طرح مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے یہ دعوی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حروف مقطعات کی تاویل کو ظاہر فرمادیا ہے اور ان کے اَسرار کو بیان کر دیا ہے لیکن عام لوگوں کے لیے ان کا بیان ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا بیان کرنا ان کے اَسرار الٰہیہ ہونے کے منافی ہے۔ (تفسیر مظہری ج ۱)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں ان کے اصلی معنیٰ تک اوروں کی رسائی نہیں، بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو بوجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا اور بعض اکابر سے جو ان کے معنیٰ منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ و تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، تو اب اس کو رائے شخصی کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے جو تحقیق علماء کے بالکل خلاف ہے۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے ان حروف مقطعات کے بارے میں بڑی محنت سے توضیحی اقوال جمع فرمائے ہیں، ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ تنبیہ کے لیے حروف زائدہ ہیں، ایک قول یہ ہے کہ ان حروف سے ان کلمات کی طرف

اِشارہ ہے جو ان حروف سے مرکب ہیں جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الف سے مراد آلاء اللہ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) ہیں اور لام سے مراد اللہ کا لطف ہے اور میم سے مراد اس کا ملک ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ " الرحم " اور " ن " اس کے مجموعہ سے " الرحمن " مراد ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ " الم " سے مراد ہے " اَنَا اللّٰہُ اَعلَمُ " (میں اللہ ہی خوب جانتا ہوں) اور باقی سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات ہیں ان سے بھی اسی طرح کے کلمات مراد ہیں۔ (تفسیر بیضاوی، تفسیر کبیر للرازی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی ہے کہ الف سے اللہ کی طرف، لام سے جبریل امین کی طرف اور میم سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ قرآن اللہ نے جبریل کی زبان سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا، یا ان حروف سے بعض اقوام کی مدتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہود آئے تو آپ نے ان پر " الم " البقرہ " کی تلاوت کی انہوں نے حساب کر کے کہا: ہم اس دین میں کیسے داخل ہوں جس کی مدت اکہتر سال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے، انہوں نے کہا: اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ تو آپ نے پڑھا: " المص، الر، المر " وہ کہنے لگے، آپ نے ہم پر حساب مشتبہ کر دیا، اس کے علاوہ بھی تاویلات ہیں۔ (تفسیر بیضاوی)

حروفِ مقطعات میں راز کی حکمتیں: کلام اللہ شریف میں موجود حروف مقطعات کے بارے میں اہل علم و معرفت نے اپنی اپنی دانست کے مطابق توضیحات پیش کی ہیں، مگر اہل معرفت کہتے ہیں کہ علم مثال سمندر کی ہے، سمندر سے دریا جاری ہوتے ہیں، دریا سے نہریں، نہروں سے سوئے، سوئے سے چھوٹے چھوٹے کھال، اگر دریا کھالوں اور نالوں کی طرف بہنے لگے تو تباہی پھیل جائے، اگر سمندر نالوں کی طرف بہنے لگے تو تباہی آجائے گی، قرآن کریم میں رب تعالیٰ کا فرمان ہے کہ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا [الرَّعْدِ: ۱۷] اس نے آسمان کی طرف سے پانی برسایا تو نالے اپنے اپنے لائق بہنے لگے، تو علم کے دریا اللہ کے پاس ہیں، اس نے اپنے علوم میں سے انبیاء کرام کو علوم

کے دریا عطا فرمائے، انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے علوم کے دریاؤں سے علماء امت کو علوم کی نہریں عطا فرمائیں، پھر علماء کرام رحمہم اللہ نے ان سے عام لوگوں کو ان کی طاقت کے بقدر علم کی چھوٹی چھوٹی نالیاں عطا فرمائیں، پھر ان لوگوں نے اور لوگوں کو ان کی طاقت کے بقدر آگے پھیلایا، اس کی حقیقت ایک روایت میں بیان کی گئی

لِلْعُلَمَاءِ سِرٌّ، وَلِلْخُلَفَاءِ سِرٌّ وَلِلْأَنْبِيَاءِ سِرٌّ، وَلِلْمَلَائِكَةِ سِرٌّ، وَلِلّٰهِ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ كُلِّهِ سِرٌّ، فَلَوِ اطَّلَعَ الْجُهَّالُ عَلَى سِرِّ الْعُلَمَاءِ لَأَبَادُوهُمْ، وَلَوِ اطَّلَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى سِرِّ الْخُلَفَاءِ لَنَابَذُوهُمْ، وَلَوِ اطَّلَعَ الْخُلَفَاءُ عَلَى سِرِّ الْأَنْبِيَاءِ لَخَالَفُوهُمْ، وَلَوِ اطَّلَعَ الْأَنْبِيَاءُ عَلَى سِرِّ الْمَلَائِكَةِ لَاتَّهَمُوهُمْ، وَلَوِ اطَّلَعَ الْمَلَائِكَةُ عَلَى سِرِّ اللّٰهِ تَعَالَى لَطَاحُوا حَائِرِينَ، وَبَادُوا بَائِرِينَ (تفسیر کبیر للرازی ج ۱)

علماء کرام کے لیے کچھ راز ہوتے ہیں اور خلفاء کے لیے کچھ راز ہوتے ہیں، انبیاء کرام کے کچھ راز ہوتے ہیں، فرشتوں کے کچھ راز ہوتے ہیں، اس کے بعد سارے کے سارے راز اللہ ہی کے ہوتے ہیں، اگر جاہل لوگ علماء کرام کے رازوں سے واقف ہو جائیں تو انہیں ظاہر کر دیں، اگر علماء کرام خلفاء کے رازوں سے واقف ہو جائیں تو وہ انہیں پھینک دیں، اگر خلفاء انبیاء کرام کے رازوں سے واقف ہو جائیں تو وہ ان کی مخالفت کریں، اگر حضرات انبیاء کرام فرشتوں کے رازوں سے واقف ہو جائیں تو ان پر تہمت باندھیں، اگر فرشتے اللہ تعالیٰ کے رازوں سے آگاہ ہو جائیں تو حیرانگی میں پڑ جائیں اور جل کر راکھ ہو جائیں۔

مفسر قرآن علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چونکہ عقلیں ان مضبوط رازوں کو برداشت نہیں کر سکتیں جس طرح چمگادڑ سورج کی روشنی برداشت نہیں کر سکتا، حضرات انبیاء کرام کو رازہائے نبوت نبھانے کے لیے دوسروں کی بہ نسبت کامل عقل عطا فرمائی گئی ہے، علماء کرام رحمہم اللہ کو عام لوگوں کی بہ نسبت رازوں کے لیے اعلیٰ عقل عطا فرمائی گئی ہے، عام لوگ ان رازوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اسی طرح علماء باطن کا معاملہ ہے اور وہی حکماء ہیں ان

کی عقلیں وہ کچھ اٹھا سکتی ہیں جس سے علماء ظاہر عاجز ہیں۔ (کبیر)

حروف مقطعات کے رازہائے سربستہ اور تدبر قرآن: حضرات متکلمین نے قرآن کریم کی چودہ آیات کی روشنی میں اس بات سے انکار کیا ہے کہ حروف مقطعات کا معنیٰ اور مفہوم راز سربستہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کتاب اللہ شریف میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہوں جن کا مفہوم مخلوق نہیں سمجھ سکتی، اس پر قرآن کریم کی آیات، احادیث مبارکہ اور عقلی دلائل موجود ہیں۔

سورۃ محمد کی آیت ۲۴ کی روشنی میں وہ کہتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تدبر، غور و حوض کرنے کا حکم دیا ہے، اگر ان میں تدبر ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اللہ انہیں تدبر کرنے کا کیسے حکم دے سکتے ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۲ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے مخالفین سے فرمایا کہ وہ قرآن کریم میں تدبر کیوں نہیں کرتے، اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت ہی زیادہ اختلافات دیکھتے، تو جب مخلوق اس کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکتی تو پھر اللہ انہیں تدبر کرنے کا حکم کیونکر دے سکتے ہیں، مفہوم جانے بغیر تناقض واختلاف کی نفی کی معرفت کیسے لوگ حاصل کر سکتے ہیں؟

سورۃ الشعرا کی آیت ۱۹۲ اور ۱۹۵ میں فرمایا گیا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے، اسے روح الامین نے آپ ﷺ کے دل پر اتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں، عربی زبان میں ہے، اگر اس کا مفہوم مخلوق سمجھ ہی نہیں سکتی تو پھر نبی کریم ﷺ کا منذر (ڈرانے والا) ہونا تو بے کار ہو گیا، اسی طرح قرآن کو عربی زبان میں اتارنا یہ بتلاتا ہے کہ یہ عرب کی زبان میں اتارا گیا ہے، جب معاملہ یہ ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ سمجھا جائے۔

سورۃ النساء کی آیت ۸۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے، یہاں استنباط کا لفظ استعمال ہوا ہے تو استنباط اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے معانی کا احاطہ نہ کیا جا سکے۔

قرآن کریم کی سورۃ النحل آیت ۸۹ میں فرمایا گیا کہ یہ قرآن ہر چیز کا بیان ہے، پھر سورۃ الانعام کی آیت ۳۸ میں فرمایا گیا کہ ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں کی ہے، پھر سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۵ میں ارشاد ہے کہ یہ قرآن لوگوں کے لیے سامان ہدایت ہے، سورۃ البقرہ کی آیت ۲ میں فرمایا گیا کہ یہ قرآن اہل تقویٰ کے لیے سامان ہدایت ہے، توجب قرآن کریم کا مفہوم ہی معلوم نہیں ہو گا تو پھر سامان ہدایت کیسے ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۃ القمر کی آیت ۵ میں ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم حکمت بالغہ ہے، اسی طرح سورۃ یونس کی آیت ۵۷ میں ارشاد ہے کہ قرآن کریم جو کچھ دلوں میں ہے اس کے لیے شفاء ہے، سامان ہدایت ہے اور اہل ایمان کے لیے رحمت ہے، تو یہ تمام صفات ایسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتیں جو سمجھی ہی نہ جا سکتی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ ۱۵ میں ارشاد فرمایا تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے، سورۃ العنکبوت آیت ۵۱ میں فرمایا کہ کیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ ان پر تلاوت کی جائے، اس میں البتہ رحمت اور ایمان رکھنے والی قوم کے لیے نصیحت کا سامان ہے، تو یہ کتاب کیسے کافی ہو سکتی ہے؟ کیونکر سامان نصیحت ہو سکتی ہے جب کہ اس کا مفہوم ہی واضح نہیں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم آیت ۵۴ میں فرمایا کہ یہ لوگوں کو پہنچانا ہے، اور اس لیے کہ وہ اس سے ڈرائے جائیں توجب اس کا مفہوم ہی واضح نہیں ہو گا تو اس کا پہنچانا اور اس سے ڈرانا کیونکر ہو سکتا ہے؟ پھر سورۃ ابراہیم کی آیت ۵۲ کے آخر میں جو فرمایا گیا کہ اہل عقل نصیحت حاصل کریں، تو اہل عقل نصیحت تب ہی حاصل کر سکتے ہیں جب کہ اس کا مفہوم واضح اور معلوم ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء آیت ۱۷۴ میں ارشاد فرمایا کہ تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آچکی ہے، اور ہم نے آپ کی طرف واضح نور اتارا ہے، توجب اس کا مفہوم ہی واضح

نہیں ہو گا تو یہ برھان (دلیل) اور نور مبین کیسے ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴، ۱۲۳ میں ارشاد فرمایا کہ جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ گمراہ ہو گا اور نہ ہی بدبخت ہو گا اور جس نے میری یاد سے منہ موڑا اس کی گزراوقات تنگ کر دوں گا، تو جس چیز کا مفہوم و معنیٰ ہی معلوم نہ ہو اس کی اتباع، پیروی اور اس سے روگردانی، اعراض اور منہ موڑنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۃ لاسراء آیت ۹ میں ارشاد فرمایا یہ قرآن کریم وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے، تو جب اس کا معنیٰ، مفہوم اور مطلب ہی واضح نہیں تو یہ کیونکر سب سے زیادہ سیدھی راہ دکھا سکتا ہے؟ اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۲۸۵ میں ارشاد ہے کہ اہل ایمان کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، تو اطاعت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کسی چیز کا مفہوم، معنیٰ اور مطلب معلوم ہو، تو ان دلائل و براہین کی روشنی میں یہ بات لازمی ٹھہری کہ اس کا معنیٰ، مفہوم اور مطلب واضح ہو۔

حضرات متکلمین اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّتِي میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم انہیں مضبوطی سے تھام رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ان میں ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت ہے۔ (سنن ترمذی) تو آدمی مضبوطی سے اسی صورت میں تھام سکتا ہے جب اس کا معنیٰ اور مفہوم واضح ہو۔

اسی طرح علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کا فرمان مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا عَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بالهزل، من تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللَّهُ، وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ، وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ، وَالذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَالصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ، هُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ، وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ

الْعُلَمَاءُ، وَلَا يَخْلَقُ عَلَى كَثْرَةِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ، مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ، وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ، وَمَنْ خَاصَمَ بِهِ فَلَجَ، وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ (تفسیر الکبیر للرازی)

تم پر کتاب اللہ کا ماننا لازم ہے، اس میں تمہارے لیے تم سے پہلے اور بعد کی خبریں ہیں اور یہی تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے، یہی قطعی بات کرتا ہے، یہ مذاق نہیں ہے، جس نے اسے چھوڑا اللہ تعالیٰ اسے ختم کردے گا، جس نے اس کے علاوہ کی پیروی کی اللہ تعالیٰ اس پر گمراہی مسلط کردے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی، ذکر حکیم اور صراط مستقیم ہے، اس کی وجہ سے خواہشات ٹیڑھی نہیں ہوتیں، اس سے اہل علم کبھی سیر نہ ہوں گے، یہ کثرت تلاوت کی وجہ سے پرانا نہیں ہوگا، اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے، جس نے اس کے ساتھ قول کیا اس نے سچ کہا، جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کے ذریعے جھگڑا کیا وہ کامیاب ٹھہرا، جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔

متکلمین قرآن وحدیث کی ان دلیلوں کے بعد عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسی چیز جس کا علم نہ ہو اس کے ساتھ ایک دوسرے کو مخاطب کرنا، ایک دوسرے سے گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے عربی جاننے والے سے کوئی حبشی جاننے والا اپنی بولی میں گفتگو کرے، جب یہ جائز نہیں تو یہاں جب قرآن کا مفہوم نہیں ہوگا تو مفہوم ومطلب کے بغیر تخاطب جائز نہیں ہوگا۔

اسی طرح متکلمین کہتے ہیں کہ کلام اور گفتگو سے مقصود دوسروں کو بات سمجھانا ہے، جب کلام کا مفہوم ومطلب ہی نہیں تو اس کے ساتھ مخاطبت بے کار اور کم عقلی ہے اور یہ بات حکیم ذات کے لائق اور شایان شان نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح متکلمین فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ساتھ چیلنج اور تحدی ہے اور جو مفہوم اور معلوم ہی نہ ہو اس کے ساتھ چیلنج اور تحدی کا جواز نہیں ہوسکتا۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متکلمین کے دلائل کے مقابلے میں ان کے مخالفین نے بھی دلائل پیش کیے ہیں، ان دلائل میں قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا اور احادیث مبارکہ

سے بھی استدلال کیا گیا ہے، آیات قرآنی سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ آیات بھی ہیں، محکم آیات کا معنیٰ اور مفہوم واضح ہوتا ہے جب کہ متشابہ آیات کا معنیٰ معلوم نہیں ہوتا، وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ ان کی تاویل اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، یہاں إِلَّا اللّٰهُ پر وقف کئی وجوہ سے لازمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کا عطف اگر إِلَّا اللّٰهُ پر ہو تو يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ما قبل سے منقطع ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں ہے کیونکہ تنہا اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر)

اگر رَاسِخِينَ فِي العِلم تاویل متشابہات سے آگاہ ہوں تو پھر انہیں ان پر ایمان کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کیونکہ جب وہ اس کے معنیٰ سے آگاہ ہیں تو ان پر ایمان، محکم آیات پر ایمان کی طرح ہی ہو گا، اس لیے متشابہ پر ایمان کے لیے کوئی مزید تعریف نہیں بنے گی، حالانکہ یہ تعریف ہے۔

اگر متشابہات کی تاویل جاننا لازمی ہے تو پھر ان کی تاویل طلب کرنے پر مذمت نہیں ہونی چاہیے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی طلب پر مذمت فرمائی ہے، جیسے سورۃ آل عمران کی آیت ۷ میں ارشاد ہے کہ وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑے ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی)

پھر روایات میں جس طرح ہے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فرمان کہ ہر کتاب کے کچھ راز ہوتے ہیں اور قرآن کریم کا راز حروف مقطعات ہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے کہ بعض علوم پوشیدہ خزانہ ہیں جنہیں عارفین باللہ ہی جانتے ہیں جب وہ انہیں ظاہر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے مخالف اس کا انکار کرتے ہیں، اسی طرح اکابرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے کہ قرآنی سورتوں کے ابتدائی کلمات کے معانی و مفاہیم معلوم نہیں ہیں، اس لیے اسی کا حق ہونا ضروری ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی طرح ہیں، تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

قرآن وحدیث کے ان دلائل کے بعد متکلمین کے مخالفین نے عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جن افعال کے ہم مکلف بنائے گئے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ان افعال میں سے کچھ افعال ایسے ہیں جن کی حکمت کچھ نہ کچھ ہم اپنی عقلوں سے جانتے ہیں، جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، کیونکہ نماز محض تواضع اورانکساری اور پیدا کرنے والی ذات کے لیے عاجزی کرنے کانام ہے، زکوٰۃ کسی فقیر کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش ہے، روزہ شہوت کو توڑنے کی کوشش ہے۔

اور کچھ افعال ایسے ہیں جن کی حکمت ہم نہیں جانتے، جیسے حج کے افعال ہیں، کیونکہ ہم اپنی عقلوں سے شیطانوں کو کنکریاں مارنے کی حکمت نہیں جان سکتے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی میں کیا حکمت ہے ہم اپنی عقلوں سے نہیں جان سکتے، طواف کے ابتدائی چکروں میں اکڑ کر چلنے میں کیا حکمت ہے ہم اسے اپنی عقلوں سے نہیں معلوم کرسکتے، احرام کو بغل کے نیچے سے گھما کر کاندھے پر رکھنے میں کیا حکمت ہے ہم اسے اپنی عقلوں سے نہیں معلوم کرسکتے، پھر محققین کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جس طرح پہلی قسم کے افعال کا حکم دینا جائز ہے، اسی طرح دوسری قسم کے افعال کا حکم دینا بھی اچھا اور جائز ہے، اس لیے کہ پہلی قسم کی اطاعت کمال اِنقیاد، فرمانبرداری پہ دلیل نہیں، کیونکہ ممکن ہے مکلف اسے عقلی مصلحت کی بنا پر ہی بجالا رہا ہو، ہاں دوسری قسم کی طاعت کمال فرمانبرداری اورانتہائی تسلیم پر دلیل ہے، اس لیے کہ جب وہ ان کی عقلی مصلحت سے آگاہ ہی نہیں تو اب ان کی بجاآوری محض فرمانبرداری وتسلیم ہی کی وجہ سے ہوگی۔ (مفاتیح الغیب)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب افعال کی دو صورتیں ہیں تو پھر اقوال کی دو اقسام وصورتیں کیوں نہیں ہوسکتیں؟

① اللہ تعالیٰ ہم سے ایسے کلمات سے کلام فرمائے کہ ہم اس کے معنیٰ سے آگاہ ہوں۔

② اور کبھی ہم ان کے معانی سے آگاہ نہ ہوں۔ تو اس سے مقصود مکلف کا حاکم کے سامنے اِنقیاد وتسلیم کا ہی ظہور ہو، جب کہ اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے، انسان جب کسی معنیٰ سے اچھی طرح واقف ہو

تو اس کا اثر دل میں کم ہو جاتا ہے لیکن جب مقصود سے آگاہ نہ ہو اور قطعاً جانتا ہو کہ کلام فرمانے والا احکم الحاکمین ہے تو انسان کا دل ہمیشہ ہی اس کی طرف متوجہ اور اس میں غور و فکر کرتا رہے گا، مکلف بنانے کا نچوڑ یہ ہے کہ دل ذکر الٰہی میں اور دماغ فکر کلام الٰہی میں مشغول رہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہو کہ بندے کے ذہن و دماغ کا اس طرف ہمیشہ متوجہ رہنے میں اس کے لیے عظیم مصلحت ہے اور اسی مصلحت کو حاصل کرنے کے لیے وہ قول اور کلام پر ایمان رکھے گا، اس مسئلہ پر دونوں فریقوں کی گفتگو کا خلاصہ یہی ہے۔ (مفاتیح الغیب)

اوائل سُوَر کے بارے میں اقوال: کیا اوائل سور کے معانی معلوم ہیں ؟ اس بارے میں بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان کے معانی معلوم ہیں، پھر ان کے درمیان معانی میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے حضرات متکلمین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات یہ ان سورتوں کے نام ہیں، شیخ قفال رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرب لوگ ان حروف کے ساتھ بعض چیزوں کے نام رکھتے ہیں، مثال کے طور پر حارثہ کے والد کا نام ہے حارثہ بن لام الطاقی، نحاس (تانبہ) کو صاد، نقدی کو عین، سحاب کو غین، جبل کا نام قاف، مچھلی کا نام نون۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ کے نام ہیں، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں یوں دعا کرتے ہوئے یہ کلمات کہتے تھے کٓهٰيٰعٓصٓ، يٰحٰمٓ عٓسٓقٓ۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات اللہ تعالیٰ کے ناموں کے اجزا ہیں، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں الٓمٓ، حٰمٓ ن کا مجموعہ الرحمٰن ہے، لیکن ہم باقی کی کیفیت ترکیب سے آگاہ نہیں ہیں۔ امام کلبی، سدی اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف مقطعات قرآن کریم کے ناموں میں سے ہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان میں سے ہر کوئی اللہ تعالیٰ کے کسی اسم یا صفت پر دلالت کرتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما الٓمٓ کے بارے میں فرماتے ہیں اَلْأَلِفُ إِشَارَةٌ إِلَى أَنَّهُ تَعَالَى أَحَدٌ، أَوَّلٌ،

آخِرٌ، أَزَلِیٌّ، أَبَدِیٌّ الف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اَحد (اکیلا) ہے،، اللہ اول ہے، اللہ آخر ہے، اللہ ازلی ہے، اللہ ابدی ہے، لام اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لطیف ہے اور میم اس طرف اشارہ کرہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے، اللہ تعالیٰ مجید ہے اور اللہ تعالیٰ منان ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کٓھٰیٰعٓصٓ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف وثناء کی ہے، کاف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہے، ھاء اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے، عین اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور صاد اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صادق ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ وہ کاف کو کبیر اور کریم پر محمول کرتے تھے، یاء کو محمول کرتے تھے کہ اللّٰہُ یُجِیرُ (اللہ پناہ دیتا ہے) عین کو عزیز اور عدل پر محمول کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں ان حروف میں سے ہر ایک اسم معین کے ساتھ خاص ہے جب کہ دوسری وجہ میں ایسا نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات میں سے بعض اسماء ذات پر اور بعض اسماء صفات پر دلالت کرتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے الٓمٓ کا معنیٰ یوں بیان فرمایا اَنَا اللّٰہُ اَعلَمُ (میں اللہ ہوں سب سے زیادہ علم رکھنے والا) اسی طرح انہوں نے المٓصٓ کے بارے میں فرمایا کہ اس کا معنیٰ ہے اَنَا اللّٰہُ اَفعَلُ (میں اللہ ہی فیصلہ کرنے والا ہوں) الٓرٰ کا معنیٰ یہ ہے اَنَا اللّٰہُ اَرٰی (میں اللہ ہوں دیکھنے والا)۔

امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات میں سے ہر ایک صفات افعال پر دال ہے، الف آلَاءُ پر دلالت کرتا ہے یعنی اللہ کی نعمتوں کی طرف الف میں اشارہ ہے، لام میں اللہ کے لطف وکرم کی طرف اشارہ ہے، میم میں اللہ کے مجد اور بزرگی کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات آئے ہیں ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں پر دلالت کرتا ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ان حروف مقطعات میں سے بعض حروف اللہ کے ناموں پر اور بعض غیر اللہ پر دلالت کرتے ہیں، حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں الف مِنَ اللّٰہِ (اللہ کی طرف سے) پر دلالت کرتا ہے، لام مِن جِبرِیلَ پر (جبریل کی طرف سے) میم عَلَی مُحَمَّدٍ پر دلالت کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم جبریل امین کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف مقطعات میں سے ہر ایک حرف اللہ تعالیٰ کے کسی فعل پر دلالت کرتا ہے، الف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت فرمائی اور انہیں رسول بنایا، لام اس پر دلالت کرتا ہے کہ مخالفین نے اس پر ملامت کی میم اس پر دلالت کرتی ہے کہ کفار جل اٹھے اور ظہور حق سے ذلیل ہوئے۔

لاریب کتاب قرآن کریم

سوال وہ کون سی کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں؟ نیز یہ بتایئے کہ یہاں اسم اشارہ کا مشار الیہ کیا ہے؟

جواب سورۃ البقرہ کی ابتدا میں جس کتاب کی تعریف کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری کتاب قرآن کریم ہے، جسے عرش بریں کا سب سے آخری پیام ہونے کا شرف ملا، اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ اہل تقویٰ کے لیے پیام رشد وہدایت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ {۲} البقرۃ) یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ یہ اللہ کا کلام ہے اللہ سے) ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

عربی گرائمر میں باقاعدہ اسمائے اشارات کا باب موجود ہے، جس میں حاضر وغائب، مذکر ومؤنث کے لیے اشارات موجود ہیں، ذَالِكَ اَسمائے اِشارات میں بعید یعنی کسی دور کی چیز کی طرف اشارہ کرنے

کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ یہاں قرآن کریم جو سامنے ہے، موجود ہے اور پڑھنے والے کے سامنے حاضر ہے کے لیے اسم اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے، حاضر و موجود کتاب کے لیے اسم اشارہ بعید استعمال کرنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ اَرباب تفسیر نے یہ نقل فرمائی ہے کہ اس سورت کے نزول سے پہلے بہت سی سورتیں اتر چکی تھیں، مکہ میں بھی بہت سی سورتیں اتر چکی تھیں، تو یہاں اسم اشارہ بعید ان سورتوں کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے، وہ سورتیں قرآن کریم کا حصہ ہیں، تو قرآن کریم کے ان حصوں پر بھی قرآن اور کتاب ہی کا لفظ بولا گیا ہے، جیسے سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۴ میں فرمایا گیا کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو اسے انتہائی توجہ سے سنو اور اپنے ہونٹوں کو بند رکھو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اسی سورۃ الاحقاف کی آیت ۳۰ میں فرمایا گیا کہ ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اتاری گئی، تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ان لوگوں نے قرآن کریم کا کچھ ہی حصہ سنا تھا جس پر کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تاج نبوت سے سرفراز فرمایا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی کتاب اتاروں گا جسے کوئی مٹا نہیں سکے گا، اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دی، پھر امت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نقل کیا، سورۃ المزمل کی آیت ۵ میں اسی وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہ بے شک عن قریب ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے، یہ بات سورۃ المزمل میں ہے جو ابتدائی زمانہ میں ہی اتری تھی۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا ہے، کیونکہ سورۃ البقرہ مدنی ہے، اور اس سورت کا بہت سا حصہ بنی اسرائیل کے خلاف احتجاج اور استدلال ہے، بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اطلاع دی تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر ان پر کتاب نازل کریں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ذَالِكَ الكِتَابُ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کے بارے میں پہلے انبیاء نے اطلاع دی تھی، وہ عنقریب اولادِ اسماعیل علیہ السلام میں سے آنے والے نبی

پر نازل ہو گی۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہاں ذَالِكَ اسم اشارہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ اطلاع دی ہے کہ وہ کتاب لوح محفوظ میں ہے، جیسے سورۃ الزخرف میں فرمایا کہ بے شک وہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، تو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو اطلاع دی کہ ذَالِكَ الكِتَابُ کہنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے تاکہ علم ہو کہ یہ وہی کتاب ہے جو لوح محفوظ میں ثبت اور تحریر ہے۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ذَالِكَ الكِتَابُ میں اسم اشارہ بعید الٓمٓ کی طرف ہے جو گزر چکا ہے، جس کا تکلم ہو چکا ہے اور گزر گیا ہے کیونکہ گزرنے والا بعید ہی ہوتا ہے۔

انسانی ذہن میں پائے جانے والے اس اشکال کا حضراتِ مفسرین نے اپنے اپنے طور پر جواب دیا ہے، علم نحو میں جو اصول وضابطے طے کیے گئے ہیں ان میں یہ بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ ذَالِكَ اسم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور ھٰذَا اسم اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی بناء پر غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اگر کوئی چیز فاصلے پر موجود ہو اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو علم نحو کے قاعدہ میں اس کے لیے ذَالِكَ استعمال کیا جاتا ہے، اگر کوئی چیز قریب ہو اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے ھٰذَا (مذکر) اور ھٰذِهٖ (مؤنث) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مگر نحویوں کے نزدیک قریب اور بعید کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو چیز مخاطب کے علم میں ہے یا جس کا خطاب میں تذکرہ ہو چکا اگر اس کی طرف اشارہ مقصود ہو تو پھر ذالک استعمال کر دیا جاتا ہے، اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ مقصود ہو جس کا ذکر بعد میں ہونے والا ہے، یا ہو گا تو اس کے لیے ھذا اور ھذہ استعمال کیا جاتا ہے۔

عرب لوگ ان دونوں اشاروں کو اسی طور پر استعمال کرتے ہیں، اگر کسی موقع پر انہیں اس اصول وضابطے کے خلاف کرنا ہو تو وہاں بلاغت کے کسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر کسی سابق چیز کا ذکر کریں گے تو ھذا اور ھذہ سے کر دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز آنکھوں کے سامنے حاضر کر دینا ہو گا، اگر کسی مقام پر ھذا اور ھذہ کی جگہ ذالک استعمال کرنا ہوتا ہے

تو اس سے عام طور پر اس بات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی شان اس سے بہت ہی بلند ہے کہ اسے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ جیسا عظیم مفسر و محقق فرماتے ہیں کہ کتاب حاضر و موجود ہے لیکن ہم ذالک کو صرف اسم اشارہ بعید کے لیے ہی تسلیم نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ذالک اور ھذا یہ دونوں اسم اشارات ہیں جن کا اصل ذا ہے، جو حرف اشارہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً (الْبَقَرَةِ: ۲۴۵] ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسنہ دے۔

اور ھا کا معنیٰ تنبیہ ہے، جب شے قریب ہو تو ھذا سے اشارہ کر کے کہا جاتا ہے کہ اے مخاطب! متوجہ ہو جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، وہ اس طرح تیرے پاس ہے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور کبھی ذا پر کاف خطاب اور لام بمعنیٰ اشارہ بھی تاکید کے لیے لایا جاتا ہے تو ذالک بن گیا، گویا کلام والا تنبیہ میں خوب اضافہ کر رہا ہے کیونکہ مشارٌ الیہ مخاطب سے مؤخر ہے، یہاں واضح ہو رہا ہے کہ ذالک اصل کے اعتبار سے بعید پر دال نہیں بلکہ عرف میں بُعد پر اشارہ کے لیے قرینہ کی ضرورت ہو گی تو یہ الدَّابَّة کی طرح ہے جو عرف میں گھوڑے کے لیے ہے اگرچہ اصل وضع میں ہر زمین پہ چلنے والے کے لیے ہے، جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو ہم کہیں گے ہم یہاں ذالک کو وضع لغوی پر ہی محمول کریں گے نہ کہ وضع عرفی پر، تو اب اس میں بُعد نہیں ہے، ذالک اور ھذا کو اسی مقاربت کی وجہ سے ایک دوسرے کے مقام پر لایا جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

اپنے اس دعویٰ پر امام رازی رحمہ اللہ نے سورۃ ص کی ۴۵ سے ۴۸ تک آیات بطور استدلال پیش فرمائی ہیں اور اس میں حرف ذا استعمال ہوا ہے، اسی طرح ھذا ذکرٌ آیا ہے کہ یہ قرآن میرے ساتھ والوں کا ذکر ہے، اسی طرح سورۃ ص کی آیت ۵۲ اور ۵۳ میں فرمایا کہ وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ هَذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ [ص: ۵۲، ۵۳] اور ان کے پاس وہ بیبیاں ہیں کہ اپنے شوہر کے سوا اور کسی کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتیں ایک عمر کی ہیں یہ ہے وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح سورۃ ق کی آیت ۱۹ میں ارشاد فرمایا وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ [ق: ۱۹] اور آئی موت کی سختی حق کے ساتھ، یہ ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے فَأَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولٰى إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَخْشٰى [النّٰزِعَات: ۲۵، ۲۶] تو اللہ نے دنیا و آخرت کے عذاب میں اسے پکڑا بلاشبہ اس میں ڈر والے کے لیے سبق ہے۔ اسی طرح اللہ کا فرمان ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ [الْأَنْبِيَاء: ۱۰۵] اور بے شک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہیں۔ پھر فرمایا إِنَّ فِي هٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ [الْأَنْبِيَاء: ۱۰۶] بے شک یہ قرآن کافی ہے عبادت والوں کو۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى [الْبَقَرَة: ۷۳] تو ہم نے کہا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح مردوں کو زندہ فرماتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسٰى [طٰه: ۱۷] اور تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! یعنی یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟ (تفسیر کبیر)

اسم اِشارہ مذکر یا مؤنث: سوال: یہاں اللہ تعالیٰ نے اسم اشارہ مذکر کیوں ذکر کیا ہے حالانکہ سورۃ مشار الیہ مؤنث ہے؟ اس کا جواب امام رازی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم مشار الیہ مؤنث نہیں مانتے کیونکہ مؤنث مسمّٰی ہے یا اسم، اول باطل ہے کیونکہ مسمّٰی بعض قرآن ہے اور وہ مؤنث نہیں ہے اور اسم وہ (الٓمٓ) ہے اور یہ بھی مؤنث نہیں ہے، ہاں اس کا دوسرا مسمّٰی سورت ہے اور وہ مؤنث ہے لیکن سابق مذکور اسم مؤنث نہیں اور وہ (الٓمٓ) ہے نہ کہ سورت۔ (تفسیر کبیر)

کتاب: قرآن کریم کے بہت سے نام ہیں، اور کسی چیز کے بہت سے نام اس کی عظمت شان اور رِفعت مقام پر دلالت کرتے ہیں، سورۃ البقرہ کے آغاز میں قرآن کریم کو کتاب کہا گیا ہے، کتاب مصدر ہے، جس طرح قیام اور صیام مصدر ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ فعال کے وزن پر مفعول کے معنٰی میں ہے جیسے لباس ملبوس کے معنٰی میں ہوتا ہے، اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں کتاب سے مراد

قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ص میں ارشاد فرمایا كِتابٌ أَنْزَلْناهُ إِلَيْكَ [ص: ۲۹] یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے، یہاں کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔

کتاب کے کئی معانی: قرآن کریم میں کتاب کئی معانی میں استعمال ہوا ہے، ① کتاب فرض کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، جیسے قرآن کریم میں قصاص کے فرض ہونے بارے میں ارشاد ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصاصُ (الْبَقَرَةِ: ۱۷۸) کہ تم پر قصاص (بدلہ لینا) فرض کیا گیا ہے، اسی طرح روزہ کی فرضیت کے بارے میں کتاب فرض کے معنیٰ میں آیا ہے ارشاد ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيامُ (الْبَقَرَةِ: ۱۸۳) تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، اسی طرح نماز کے وقت مقرر پر فرض ہونے کے بارے میں ہے، إِنَّ الصَّلاةَ كانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتاباً مَوْقُوتاً [النِّسَاءِ: ۱۰۳] بے شک نماز اہل ایمان پر وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے۔

② کتاب کا دوسرا معنیٰ حجت اور برھان (دلیل) ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَأْتُوا بِكِتابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِينَ (الصَّافَّاتِ: ۱۵۷) اگر تم سچے ہو تو کتاب لاؤ یعنی دلیل لاؤ۔

③ کتاب کا تیسرا معنیٰ اَجل (وقت مقرر) ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے وَما أَهْلَكْنا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَها كِتابٌ مَعْلُومٌ (الْحِجْرِ: ۴) اور ہم نے جس کسی بستی کو ہلاک کیا تھا، اس کے لیے ایک معین وقت لکھا ہوا تھا۔

④ کتاب کا چوتھا معنیٰ غلام کی اپنے آقا کے ساتھ مکاتبت کرنا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمانُكُمْ (النُّورِ: ۳۳) اور تمہاری ملکیت کے غلام باندیوں میں سے جو مکاتبت کا معاہدہ کرنا چاہیں۔

⑤ کتاب کا لفظ بنانے اور شمار کرنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، قرآن مجید میں ہے: فَاكْتُبْنا مَعَ الشَّاهِدِينَ (آل عمران: ۵۳) سو گواہی دینے والوں کے ساتھ ہمارا شمار کرلے، کتاب کا لفظ حکم کے معنیٰ میں بھی وارد ہے، قرآن مجید میں ہے: لَوْلا كِتابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيما أَخَذْتُمْ عَذابٌ

عَظِيمٌ (الانفال: ۶۸) اگر پہلے (معاف کر دینے کا) حکم، اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو (کافروں سے) جو (فدیہ کا مال) تم نے لیا تھا، تمہیں اس میں ضرور بڑا عذاب پہنچتا۔ قرآن مجید میں جہاں اہل کتاب کا لفظ آتا ہے تو اس کتاب سے تورات، انجیل یا یہ دونوں کتابیں مراد ہوتی ہیں۔ (المفردات)

⑥ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں، کتاب کا معنی ہے چمڑے کے دو ٹکڑوں کو سی کر ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا اور عرف میں اس کا معنی ہے، بعض حروف کو لکھ کر بعض دوسرے حروف کے ساتھ ملانا اور کبھی صرف ان ملائے ہوئے حروف پر بھی کتاب کا اطلاق ہوتا ہے اسی اعتبار سے اللہ کے کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ وہ لکھا ہوا نہیں ہے، قرآن مجید میں ہے، الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ اصل میں مصدر ہے، پھر مکتوب کا نام کتاب رکھ دیا گیا۔

⑦ کتاب اصل میں لکھے ہوئے صحیفہ کا نام ہے، قرآن مجید میں ہے: يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ: (النساء: ۱۵۳) اہل کتاب آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی صحیفہ نازل کر دیں۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کتاب مصدر فعال بمعنیٰ مفاعلہ ہے، جیسے جدال، صیام، قتال بمعنیٰ مجادلہ، مخاصمہ اور مقاتلہ ہیں، کِتَاب كَتَبْتُ الشَّيْءَ بمعنیٰ جمع کرنا سے مشتق ہے، لشکر کو اجتماع کی وجہ سے كُتَيْبَةٌ کہا جاتا ہے، کتاب کو کتاب کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ شبہات کے لشکروں کے مقابل لشکر کا درجہ رکھتی ہے یا اس لیے کہ اس میں جمیع علوم ہیں یا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں مخلوق پر ذمہ داریاں لازم کی ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی)

قرآن کریم کے نام: قرآن کریم کے بہت سے اسماء ہیں، جو جگہ جگہ قرآنی آیات میں موجود ہیں، کسی چیز کے بہت سے نام اس کی عظمت و مقام کی بلندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کے بے شمار نام اس کی عظمت شان اور رفعت مقام پر دلالت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار نام ان کے عظیم الشان مرتبہ و مقام پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح اللہ کی کتاب قرآن کریم

کے بے شمار نام ہیں جو قرآن کریم کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں، ان ناموں میں سے کچھ نام ہم معارف الفرقان کی جلد اول میں ذکر کر چکے ہیں، کچھ یہاں ذکر کر رہے ہیں، امام رازی رحمہ اللہ نے بھی ان ناموں میں سے کچھ نام آیات قرآنیہ کی شہادت کے ساتھ ذکر کیے ہیں، جو تفسیر الکبیر کی جلد دوم میں اس آیت کے ذیل میں موجود ہیں، ان ناموں میں کچھ نام یہ ہیں

۱۔ اَلْعَظِیْمُ ۲۔ اَلْعَزِیْزُ ۳۔ اَلْعَلِیُّ ۴۔ اَلْمَجِیْدُ ۵۔ اَلْمُهَیْمِنُ ۶۔ اَلنُّوْرُ ۷۔ اَلْحَقُّ ۸۔ اَلْحَكِیْمُ ۹۔ اَلْكَرِیْمُ ۱۰۔ اَلْمُبِیْنُ ۱۱۔ اَلْمُنِیْرُ ۱۲۔ اَلْهُدٰی ۱۳۔ اَلْمُبَشِّرُ ۱۴۔ اَلشِّفَاءُ ۱۵۔ اَلرَّحْمَةُ ۱۶۔ اَلْكِتَابُ ۱۷۔ اَلْمُبَارَكُ ۱۸۔ اَلْقُرْآنُ ۱۹۔ اَلْفُرْقَانُ ۲۰۔ اَلْبُرْهَانُ ۲۱۔ اَلتِّبْیَانُ ۲۲۔ اَلْبَیَانُ ۲۳۔ اَلتَّفْصِیْلُ ۲۴۔ اَلْمُفَصِّلُ ۲۵۔ اَلْفَصْلُ ۲۶۔ اَلصِّدْقُ ۲۷۔ اَلْمُصَدِّقُ ۲۸۔ ذِكْرٰی ۲۹۔ اَلذِّكْرُ ۳۰۔ اَلتَّذْكِرَةُ ۳۱۔ اَلْحُكْمُ ۳۲۔ اَلْحِكْمَةُ ۳۳۔ مُحْكَمَةٌ ۳۴۔ اَلْاِنْزَالُ ۳۵۔ اَلتَّنْزِیْلُ ۳۶۔ اَلتَّصْدِیْقُ ۳۷۔ اَلْمُنَزَّلُ (بفتح الرا) ۳۸۔ اَلتَّبْصِرَةُ ۳۹۔ اَلْبَصَائِرُ ۴۰۔ اَلْمَوْعِظَةُ ۴۱۔ اَلْبَیِّنَةُ ۴۲۔ اَلْبَشِیْرُ ۴۳۔ اَلْوَحْیُ

۴۴۔ اَلرِّسَالَةُ ۴۵۔ اَلنَّبَاءُ ۴۶۔ اَلْقَیِّمُ ۴۷۔ قَیِّمَةٌ ۴۸۔ اَلرُّوْحُ ۴۹۔ اَلْكَلِمَاتُ ۵۰۔ صَاحِبُ الْمُؤْمِنِ ۵۱۔ اَلْكَلِمَةُ ۵۲۔ اَلْاٰیَاتُ ۵۳۔ اَلْبَیِّنَاتُ ۵۴۔ اَلْفَصْلُ ۵۵۔ اَلْقَوْلُ ۵۶۔ اَلْقِبْلُ ۵۷ اَلْحَدِیْثُ ۵۸۔ اَحْسَنُ الْحَدِیْثِ ۵۹۔ اَلْعَرَبِیُّ ۶۰۔ اَلْحَبْلُ ۶۱۔ اَلْخَبَرُ ۶۲۔ اَلْبَلَاغُ ۶۳ اَلْبَالِغَةُ ۶۴۔ اَلْاَمَانَةُ ۶۵۔ اَلْمَثَانِیْ ۶۶۔ اَلْغَیْبُ ۶۷۔ اَلصِّرَاطُ اَلْمُسْتَقِیْمُ ۶۸۔ اَلْمُبِیْنُ ۶۹۔ اَلْحُجَّةُ ۷۰۔ اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی ۷۱۔ اَلْقَصَصُ ۷۲۔ اَلْمَثَلُ ۷۳۔ اَلْعَجَبُ ۷۴۔ اَلْاِثَارَةُ ۷۵۔ اَلْقِسْطُ ۷۶۔ اَلْاِمَامُ ۷۷۔ اَلنُّجُوْمُ ۷۸۔ اَلنِّعْمَةُ ۷۹۔ اَلْكَوْثَرُ ۸۰۔ اَلْمَاءُ ۸۱۔ اَلْمَتْلُوُّ ۸۲۔ اَلْمَقْرُوْ ۸۳۔ اَلْعَدْلُ ۸۴۔ اَلْبُشْرٰی ۸۵۔ اَلْمَسْطُوْرُ ۸۶۔ اَلثَّقِیْلُ ۸۷۔ اَلْمُرَتَّلُ ۸۸۔ اَلتَّفْسِیْرُ ۸۹۔ اَلْمُثْبِتُ ۹۰۔ اَلصُّحُفُ ۹۱۔ اَلْمُكَرَّمُ ۹۲۔ اَلْمَرْفُوْعُ ۹۳۔ اَلْمُطَهَّرُ ۹۴۔ اَلْمُرْشِدُ ۹۵۔ اَلْمُعَدِّلُ ۹۶۔ اَلْمُعْتَصِمُ ۹۷۔ قَاصِمُ الظَّهْرِ ۹۸۔ اَلنَّجَاةُ ۹۹۔ اَلدَّافِعُ ۱۰۰۔ اَلْهَادِیْ

لاریب فیہ: اللہ تعالیٰ نے عرش بریں کا جو آخری پیام اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا اس کے بارے میں واضح کیا جارہا ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ، ریب وتردد نہیں ہے، یہ لاریب ہے اور شک سے پاک کتاب ہے، ریب کا لغوی معنیٰ شک اور تہمت ہے، علامہ ابن الاثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ریب اس شک کو کہا جاتا ہے جس میں تہمت کا عنصر شامل ہو، رحمت دو عالم ﷺ کا فرمان گرامی ہے کہ دَعْ مَا یَرِیبُكَ إِلَی مَا لَا یَرِیبُكَ جس چیز میں ریب ہو اس کو چھوڑ دو اور اس کو اختیار کرو جس میں ریب نہ ہو۔

حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ عَلَیكَ بِالرَّائِبِ مِنَ الْاُمُور جس چیز میں بالکل شبہ نہ ہو اس کو لازم کرلو، نبی کریم ﷺ نے اپنی لخت جگر بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا یُرِیبُنِی مَا یُرِیبُهَا جو چیز میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بے قرار کرتی ہے، وہ مجھے بھی بے قرار کرتی ہے اور تہذیب میں ہے: شک مع تہمت کو ریب کہتے ہیں۔

اسی طرح ریب کا ایک معنی حاجت بھی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے کچھ یہودی گزرے، کسی نے کہا کہ ان سے سوال کرو، اور کسی نے کہا مَا رَابَكُم اِلَیهِ تمہیں ان سے سوال کی کیا حاجت ہے؟

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ کی وجوہات ہوتی ہیں۔ ① پہلی وجہ یہ ہے کہ اس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ ② دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس چیز میں تو کوئی شک وشبہ یا نقص نہیں ہوتا۔ مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک وشبہ سے پاک ہے، اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلافِ واقعہ چیز ہے، یہ تو محض شک کرنیوالے کے اپنے ذہن کا فتور ہے، جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے، مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض

کرتے تھے، آج کل کے ملحدوں کے ذہن بھی پراگندہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں، ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں، بلکہ یہ تو منبع رشد وہدایت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

الٰہی پیغام قرآن کریم شکوک وشبہات سے پاک اور منزہ ہے، اس لیے کہ یہ پیام ربانی اپنے مطالب، اپنے مفاہیم پر روشن براہین ودلائل سے مزین ہے، شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں کو چیلنج دیا گیا، جس کا جواب وہ اس سے پہلے بھی نہیں دے سکے اور ہنگامہ یوم النشور تک نہیں دے سکیں گے، یہ معجز نما کتاب ہے، اس کے مضامین اعجاز سے بھرپور ہیں، منکرین جس طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں یہ عظیم معجز نما کتاب ان کا قلع قمع کرتی ہے، تورات، زبور، انجیل اور آسمانی صحیفوں کو ان کے پیروکاروں اور علمبرداروں نے اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھادیا تھا۔

مرورزمانہ کے ساتھ ان کتابوں کے مضامین تو دور کی بات ہے نام ونشان بھی قلوب واذہان سے مٹتا جارہا تھا مگر اس سرمدی پیام کلام اللہ شریف نے علی الاعلان، برسرعام بتایا کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور دیگر صحیفے ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام پر اتارے گئے ہیں، یہ اس عظیم الشان کتاب کا طغرائے امتیاز ہے جس نے ان پہلی کتابوں کی تصدیق کی۔

اللہ کی مخلوق کے سامنے ان کتابوں کا وحی ہونا قرآن کریم نے ہی بتایا، اس لیے اس کتاب میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہے، جن دماغوں اور ذہنوں میں شکوک وشبہات کے جراثیم پائے جاتے ہیں انہیں یرقان کے مرض میں مبتلا شخص کی طرح ہر چیز پیلی ہی پیلی دکھائی دے گی، ان کا اعتبار نہیں ہے۔

لاریب فیہ کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ قرآن کریم شک کا محل نہیں ہے، پھر یہ لاریب کتاب، اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے لیے لاریب ہے، پھر یہاں لاریب فیہ میں لا نفی والا نہی کے معنیٰ میں ہے یعنی اس پیام ربانی کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہ کرو، جیسے قیامت کے بیان میں فرمایا کہ

اس میں شک نہ کرو وہ آکر رہے گی۔

ملحدین کے شبہات کا جواب: علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں ملحدین کے چند شکوک وشبہات وسوالات کے دندان شکن جوابات دیے ہیں، ملحدین کی طرف سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ اگر قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ مخالفین کو اس میں شک نہیں ہے تو یہ بات غلط ہے اس لیے کہ اس میں ہمیں تو شک ہے، اگر اس میں شک سے مراد یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شک نہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا جواب امام رازی رحمہ اللہ یہ دیتے ہیں کہ یہ کتاب ظہور وضاحتِ حجت میں یہاں تک ہے کہ کسی کا اس میں شک کرنا مناسب ہی نہیں اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کیونکہ عرب فصاحت کے آخری درجہ پر فائز ہونے کے باوجود قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت کا مقابلہ اور معارضہ نہ کرپائے اور یہ بات گواہ بن رہی ہے کہ یہ کتاب ظہورِ حجت میں اس مقام پر ہے کہ کوئی عاقل اس میں شک جائز ہی نہیں سمجھتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں لاریب فیہ کیوں کہا یعنی فیہ کو بعد میں لایا گیا جبکہ دوسرے مقام پر لَا فِيهَا غَوْلٌ اس میں نشہ نہیں ہے الفاظ آئے ہیں، اس کا جواب یہ دیا کہ اُصول یہ ہے کہ سب سے اہم کو مقدم کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد والے اہم کو، اس مقام پہ کتاب سے کلیۃً شک کی نفی اہم ہے، اگر یہاں لافیہ ریب کہا جاتا تو وہم ہوتا شاید یہاں کوئی اور کتاب ہے جس میں شک ہے حالانکہ یہاں ایسی کتاب نہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے لَا فِيهَا غَوْلٌ اس میں نشہ نہیں ہے، میں مقصود شراب جنت کو شراب دنیا پر فضیلت دینا ہے کہ وہ عقول کو اس طرح تباہ نہیں کرے گی جیسے شراب دنیا کرتی ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیسے معلوم ہوا کہ لاریب فیہ سے کلیۃً ریب کی نفی ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ اس کی قرأت مشہور لازماً کلیۃً ریب کی نفی کو مستلزم ہے، اس پہ دلیل یہ ہے لاریب میں ماہیت ریب کی نفی ہے اور نفی ماہیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ افراد ماہیت کے ہر فرد کی نفی ہو کیونکہ اگر افراد

ماہیت میں سے ایک فرد بھی ثابت ہو جائے تو ماہیت ثابت ہو جائے گی اور یہ نفی ماہیت سے تناقض ہے، اسی حکمت وراز کی بناء پر کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمام الٰہ کی نفی ہے۔ (کبیر)

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ: ہدیٰ کا معنیٰ دلالت اور راہنمائی کرنا ہے، علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں کہتے ہیں کہ ہدایت ایسی راہنمائی کو کہتے ہیں جو مطلوب تک پہنچائے، جب کہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہدایت کا معنیٰ راہنمائی کرنا اور جاننا، امام رازی رحمہ اللہ یہاں ہدایت کے پہلے معنیٰ کو درست جب کہ دوسرے اور تیسرے معنیٰ کی خرابی پر دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر مطلوب تک پہنچانا ہدایت میں معتبر ہو تو مطلوب نہ پانے کے وقت حصول ہدایت محال ہو گی اس لیے منزل کی طرف رہنمائی عدم اِهتِدا کی صورت میں محال ہو گی حالانکہ وہ محال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى اور رہے ثمود انہیں ہم نے راہ دکھائی لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر چاہا و یہاں ہدایت اور راہنمائی کا اثبات ہے لیکن اِهتِدَا (ہدایت پالینے) کا نہیں اور اس لیے بھی کہ لغت میں کہا جاتا ہے هَدَيْتُهُ فَلَمْ يَهْتَدِ (میں نے رہنمائی کی مگر وہ منزل نہ پاسکا) اور یہ ہماری تائید ہے۔

صاحب کشاف نے ہدایت کے معنیٰ پر قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت ۱۶، سورۃ سبا کی آیت ۲۴ سے استدلال کیا ہے، جن میں فرمایا گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی، دوسری آیت میں فرمایا کہ یا تو وہ ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ لفظ مہدی (ہدایت یافتہ) مھتدی کی طرح مقام مدح میں بولا جاتا ہے اگر ہدایت میں مطلوب تک ایصال ورسائی نہ ہو تو مہدی ہونا کوئی مدح نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے ہدایت ہو مگر ہدایت نہ پائی ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے صاحب کشاف کے ان دلائل کا جواب دیا ہے، پہلا جواب یہ ہے کہ ہدایت دینے اور ہدایت پانے میں بلاشبہ فرق موجود ہے تو ہدایت و رہنمائی کے مقابل گمراہ کرنا اور اھتدا اور ہدایت پانے کے مقابل گمراہی ہے تو ہدایت کو گمراہی کے مقابل لانا ہی محال ہے۔

دوسرے کا جواب یہ دیا ہے کہ ہدایت سے فائدہ اٹھانے والا ہی مھدی (ہدایت یافتہ) ہوتا ہے اور جو اس سے نفع نہیں اٹھاتا اسے مھدی نہیں کہا جاسکتا اور اس لیے بھی کہ جب وسیلہ مقصود تک نہ پہنچائے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

مُتَّقِین: متقین متقی کی جمع ہے، متقی تقویٰ سے ہے، متقی عرب کے قول وقاہ فاتقی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، وقایہ کا عربی میں معنیٰ انتہائی درجہ میں حفاظت کرنا، بچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں متقی کا تذکرہ کیا ہے، یہ متقی کی مدح وستائش کی گئی، جس شخص میں تقویٰ والا وصف پایا جائے گا وہ بدرجہ اَولیٰ دنیاوی امور میں متقی ہو گا، بلکہ وہ ہر اس معاملہ میں متقی ہو گا جس کا تعلق امور اخروی کے ساتھ ہے، یعنی اگر وہ عبادات وبندگی بجالاتا ہے تو جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے وہ ان سے بھی بچے گا۔

گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کبائر (بڑے گناہ) دوسرے صغائر (چھوٹے گناہ) بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے اجتناب کرنا اور بچنا بھی تقویٰ میں داخل ہے، بعض کہتے ہیں یہ تقویٰ میں داخل نہیں ہے، بہر حال چھوٹے چھوٹے گناہوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بچنے کی کوشش کرتے تھے، جب کہ بعد کے زمانہ والے ان کی پرواہی نہیں کرتے رہے، گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنا چاہیے اور معافی مانگنا چاہیے۔

ایک شخص چھوٹے چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کرتا تو کیا وہ بھی متقی کہلوانے کا مستحق ہو سکتا ہے، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ جو چھوٹے چھوٹے گناہوں سے نہ بچے وہ درجہ متقین تک نہیں پہنچ سکتا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پیش کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ دَرَجَةَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَذَرًا مِمَّا بِهِ الْبَأْسُ بندہ متقین کے درجہ تک نہیں پہنچتا جب تک وہ کام نہ چھوڑے جن میں کوئی حرج نہیں اس سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں یہ حرج والے کاموں سے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ متقی ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہر اس معاملہ میں بھی ڈرتے ہوں جس کی طرف ان کی خواہش کا میلان ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں، ان تمام کی تصدیق کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو۔

قرآنی آیات میں تقویٰ خشیت وخوفِ خداوندی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، سورۃ النساء کی پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، یہاں اِتَّقُوا کا لفظ ہے، سورۃ الشعراء کی آیت ۱۰۶ میں فرمایا گیا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے، یہاں تَتَّقُونَ کا لفظ ہے، حضرت ھود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی اپنی قوم سے فرمایا کہ بندگی پروردگار کی کرو اور اسی سے تقویٰ اختیار کرو یعنی اسی سے ڈرو۔ (سورۃ العنکبوت)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۲ میں فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، یہاں بھی اِتَّقُوا اور تُقَاتِهِ کے الفاظ آئے ہیں، سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۷ میں تقویٰ کو بہترین زاد راہ قرار دیا گیا، کہ خوفِ خداوندی بہترین توشہ ہے، پھر سورۃ البقرہ کی آیت ۴۸ میں آیا کہ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی جان کے کام نہیں آئے گی، یہاں بھی اِتَّقُوا امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان وایقان کی بیش بہا دولت کے بعد بارگاہ ایزدی میں اپنی کوتاہ اعمالیوں، سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں سے رجوع کرتا رہے، توبہ تائب ہوتا رہے، گناہوں کو چھوڑے اور ان سے نفرت کرے، معاصی اور گناہوں کے ارتکاب پر ندامت وشرمندگی محسوس کرتے ہوئے اللہ کی بارگاہ سے معافی طلب کرے اور آئندہ کے لیے عزم بالجزم کرلے کہ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

اہل ایمان کے لیے دولت ایمان کے بعد تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو اس کے لیے لازم ہے، اہل ایمان

کا تقویٰ کی بناء پر ہی امتحان لیا گیا، قوموں کو اسی بناء پر ڈرایا گیا کہ وہ تقویٰ اختیار نہیں کرتی تھیں، اہل قریٰ یعنی بستیوں والوں کو فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے اور تقویٰ کیوں اختیار نہیں کرتے؟

اللہ تعالیٰ نے اہل طاعت سے فرمایا کہ وہ اس بات کا اظہار کریں کہ میرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے اور مجھ ہی سے وہ ڈرتے رہیں، اللہ کے علاوہ کسی سے خوف نہ کھائیں اور ڈریں نہیں، اہل ایمان کو اللہ فرماتے ہیں کہ میں ہی تمہارا پروردگار ہوں اس لیے تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہونے کی ضرورت نہیں ہے سامنے دروازے کی طرف سے آیا کرو اور اللہ سے ڈرا کرو، یعنی اس کی نافرمانی نہ کیا کرو، پھر اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی نشانی یہ بیان فرمائی کہ اخلاص دلوں کے تقویٰ کا نام ہے، اس لیے اللہ ہی سے ڈرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

تقویٰ اللہ کے ہاں بڑا مقام رکھتا ہے، اسی لیے تو سورۃ النحل کی آیت ۱۲۸ میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو نیکوکار ہیں، پھر سورۃ الحجرات کی وہ مشہور آیت ہے جس میں فرمایا گیا کہ تم میں سب سے زیادہ عزت و بزرگی والا اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار شخص ہے، معیار بزرگی اور شرافت تقویٰ کو قرار دیا گیا۔

مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ أَكْرَمَ النَّاسِ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ أَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ أَغْنَى النَّاسِ فَلْيَكُنْ بِمَا فِي يَدِ اللَّهِ أَوْثَقَ مِمَّا فِي يَدِهِ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ شرافت والا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ مضبوط ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کرے اور جو اس بات کو پسند کرے کہ وہ

لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائے تو اسے چاہیے کہ جو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے زیادہ اس چیز پر اعتماد کرے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

منبع علوم وفیوضات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ التَّقْوَى تَرْكُ الْإِصْرَارِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ، وَتَرْكُ الِاغْتِرَارِ بِالطَّاعَةِ تقویٰ گناہ اور نافرمانی پر اصرار کو چھوڑنے کا نام ہے، اسی طرح تقویٰ اطاعت اور نیکیوں پر اترانے کو چھوڑنے کا نام ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ التقوى أَن لَّا تَخْتَارُ عَلَى اللَّهِ سِوَى اللَّهِ، وَتَعْلَمَ أَنَّ الْأُمُورَ كُلَّهَا بِيَدِ اللَّهِ تقویٰ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر کسی اور کو ترجیح نہ دے اور تو یہ بات جان لے کہ سارے کے سارے کام اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

حضرت ابراھیم بن ادھم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ التَّقْوَى أَنْ لَا يَجِدَ الْخَلْقُ فِي لِسَانِكَ عَيْبًا، وَلَا الْمَلَائِكَةُ فِي أَفْعَالِكَ عَيْبًا وَلَا مَلِكُ العرش فِي سِرِّكَ عَيباً تقویٰ یہ ہے کہ مخلوق تیری زبان میں کوئی عیب نہ پائے، فرشتے تیرے کاموں میں کوئی عیب نہ دیکھیں اور عرش کا مالک تیرے دل میں کوئی عیب نہ پائے۔

حضرت واقدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ التَّقْوَى أَنْ تُزَيِّنَ سِرَّكَ لِلْحَقِّ كَمَا زَيَّنْتَ ظَاهِرَكَ لِلْخَلْقِ، تقویٰ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے دل کو مزین کرے جیسے تو اپنے ظاہر کو مخلوق کے لیے مزین کرتا ہے۔

تقویٰ کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ التَّقْوَى أَنْ لَا يَرَاكَ مَوْلَاكَ حَيْثُ نَهَاكَ، تقویٰ یہ ہے کہ تیرا مولا تجھے ایسی جگہ پر نہ دیکھے جہاں جانے سے اس نے تجھے منع کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الْمُتَّقِي مَنْ سَلَكَ سَبِيلَ الْمُصْطَفَى، وَنَبَذَ الدُّنْيَا وَرَاءَ الْقَفَا، وَكَلَّفَ نَفْسَهُ الْإِخْلَاصَ وَالْوَفَا، وَاجْتَنَبَ الْحَرَامَ وَالْجَفَا، متقی وہ شخص ہے جو حضرت مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلے اور دنیا کو گدی پیچھے پھینک دے اور اپنے آپ کو اخلاص ووفا کا مکلف بنادے، حرام اور ظلم سے بچے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر متقی کے لیے اور کوئی فضیلت نہ بھی ہو تو هُدىً لِلْمُتَّقِينَ والی فضیلت ہی اس کے لیے کافی ہے کیونکہ فرمان خداوندی ہے کہ یہ قرآن متقی لوگوں کے لیے سامان ہدایت ہے، پھر دوسرے مقام پر فرمایا کہ ماہ رمضان المبارک میں قرآن کریم اتارا گیا ہے جو لوگوں کے لے سامان ہدایت ہے، پھر یہاں سورۃ البقرہ کی ابتدا میں فرمایا کہ قرآن کریم متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے، یہ اس بات پر دلالت ہے کہ متقی ہی انسان ہیں، جو متقی نہیں ہیں وہ گویا انسان ہی نہیں ہیں۔ (کبیر)

تقویٰ کی بڑی اہمیت ہے، روایت کے مطابق اعمال میں وزن کا اجر و ثواب تقویٰ کی بناء پر ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن مطرف رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ تو دو ایسے آدمیوں کو پالے گا کہ ایک کا صدقہ روزے اور نمازیں زیادہ ہوں گی اور ثواب میں دوسرا بڑھا ہوا ہو گا، کسی نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے؟ فرمایا اس لیے کہ وہ تقویٰ میں پہلے سے بڑھا ہوا ہے۔ (تنبیہ الغافلین باحادیث سید الانبیاء والمرسلین)

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جب موتہ کی بستی کو روانہ ہونے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! مجھے کوئی وصیت فرما دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آپ ایسے علاقے میں جا رہے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کم ہوتا ہے، اس لیے وہاں پر نماز کثرت سے پڑھنا، عرض کرنے لگے، یا رسول اللہ! کچھ اور ارشاد فرما دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو کہ یہ ہر مطلب میں فائدہ مند ہے، ایک بار چلتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کچھ اور ارشاد فرما دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ہاں، ہر گز عاجزی نہ دکھا، ہر گز عاجز نہ بن، ہر گز عاجز نہ ہو اس بات سے کہ اگر آپ دس برائیاں کریں تو ایک بھلائی بھی کریں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میرے لیے چھ چیزوں کی ذمہ داری قبول کر لو تو میں تمہارے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں، إِذَا حَدَّثْتُمْ فَلَا تَكْذِبُوا، وَإِذَا وَعَدْتُمْ فَلَا تُخْلِفُوا، وَإِذَا

ائْتُمِنْتِمْ فَلَا تَخُونُوا، وَغُضُّوا أَبْصَارَكُمْ، وَاحْفَظُوا فُرُوجَكُمْ، وَكُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ عَنِ الْحَرَامِ، تَدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ ① جب بات کرو تو جھوٹ نہ بولو۔ ② جب وعدہ کرو تو اس کے خلاف نہ کرو۔ ③ جب کوئی امانت رکھے تو خیانت نہ کرو۔ ④ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو۔ ⑤ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔ ⑥ اپنے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء کو حرام سے بچائے رکھو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ (تنبیہ الغافلین)

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَبْدِي أَدِّ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْكَ، تَكُنْ مِنْ أَعْبَدِ النَّاسِ، وَانْتَهِ عَمَّا نَهَيْتُكَ عَنْهُ، تَكُنْ مِنْ أَوْرَعِ النَّاسِ، وَاقْنَعْ بِمَا رَزَقْتُكَ تَكُنْ مِنْ أَغْنَى النَّاسِ میرے بندے میں نے تیرے ذمہ جو فرض عائد کیا ہے وہ ادا کر تا رہ تو لوگوں میں سب سے بڑھ کر عبادت گزار ہو گا، جن باتوں سے منع کیا ہے ان سب سے باز رہ، سب سے بڑا پرہیز گار بن جائے گا اور تجھے جو رزق عطا ہو اس پر قناعت کر، تو سب لوگوں سے غنی بن جائے گا۔ (تنبیہ الغافلین)

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نیک بختی کی پانچ علامتیں ہیں، الْيَقِينُ فِي الْقَلْبِ، وَالْوَرَعُ فِي الدِّينِ، وَالزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا، وَالْحَيَاءُ فِي الْعَيْنَيْنِ ① دل میں یقین۔ ② دین میں پرہیز گاری۔ ③ دنیا سے زہد و بے رغبتی۔ ④ آنکھوں میں حیا۔ ⑤ بدن میں خشیت و تواضع اور بد بختی کی پانچ نشانیاں ہیں، الْقَسْوَةُ فِي الْقُلُوبِ، وَالْجُمُودُ فِي الْعَيْنَيْنِ ، وَقِلَّةُ الْحَيَاءِ، وَالرَّغْبَةُ فِي الدُّنْيَا، وَطُولُ الْأَمَلِ ① دل میں سختی کا ہونا۔ ② آنکھوں میں جمود ہونا کہ خوف خداوندی سے رونا نہ آتا ہو۔ ③ حیا کی کمی۔ ④ دنیا کی رغبت ہو۔ ⑤ امیدیں لمبی لمبی ہوں۔ (تنبیہ الغافلین)

اسلاف کا تقویٰ: سلف صالحین رحمہم اللہ کی زندگیاں کس قدر قابل رشک اور خوف خداوندی سے بھرپور تھیں کہ وہ شبہ میں ڈالنے والی چیزوں سے بھی بہت پرہیز کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا تقویٰ دیکھیے، وہ فرماتے ہیں کہ تَرْكُ فَلْسٍ مِنْ حَرَامٍ أَفْضَلُ مِنْ مِائَةِ أَلْفِ فَلْسٍ أَتَصَدَّقُ بِهَا حرام مال کا ایک پیسہ چھوڑ دینا ایک لاکھ پیسہ صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ حضرت عبد اللہ

بن مبارک رحمۃ اللہ کے اپنے تقویٰ وللّٰہیت کا واقعہ ہے کہ وہ ملک شام میں تھے، جہاں وہ حدیث شریف لکھا کرتے تھے، ان کا اپنا قلم ٹوٹ گیا تو کسی سے اُدھار مانگ لائے، لکھنے سے فارغ ہوئے تو قلم قلمدان میں رکھ دیا اور واپس کرنا بھول گئے، پھر شام سے مرو (جگہ کا نام) پہنچے تو وہاں قلم دیکھ کر یاد آیا کہ انہوں نے کسی سے قلم اُدھار لیا تھا جو واپس کرنا بھول گئے تو اسی مقصد کے لیے مرو سے شام کا سفر کیا۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، ان دونوں کے درمیان شبہ میں ڈالنے والی چیزیں ہیں، جنہیں بہت سے لوگ نہیں پہچانتے، سو جس شخص نے شبہات سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور عزت دونوں کو محفوظ کر لیا اور جو ان شبہ والی چیزوں سے ہیں بچتا رہا وہ بالآخر حرام میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس طرح وہ چرواہا جو چراگاہ کے کنارے کنارے بکریاں چراتا ہے کبھی چراگاہ میں جا داخل ہوتا ہے، یاد رکھو کہ ہر بادشاہ کا کچھ ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ممنوعہ علاقہ اس کے حرام کردہ امور ہیں، یہ بھی سن لو کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ صحیح ہو تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ ٹکڑا دل ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر شے کی کچھ حدیں ہوتی ہیں (جن کی حفاظت ضروری ہوتی ہے) اسلام کی حدود ورع، تواضع، صبر اور شکر ہیں، ورع اور پرہیز گاری تو تمام امور کی اصل اور جڑ ہے، تواضع تکبر سے پاک صاف کرتی ہے، صبر آگ سے نجات دلاتا ہے اور شکر جنت دلا کر کامیاب کرتا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگ نماز پڑھتے پڑھتے کمانوں کی طرح ٹیڑھے ہو جاؤ اور روزے رکھتے رکھتے سوکھ کر کانٹا ہو جاؤ پھر بھی نفع پرہیز گاری سے ہی ہو گا۔

حضرت ابو اللیث سمرقندی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ (پرہیز گاری) کی علامت ونشانی یہ ہے کہ دس چیزوں کو اپنے اوپر لازم سمجھے ① غیبت سے زبان کی حفاظت کرے۔ ② بد ظنی سے بچے۔ ③ مذاق کرنے سے بچتا رہے۔ ④ نگاہ کو حرام جگہ اور موقع سے بچائے۔ ⑤ زبان میں سچائی ہو۔

⑥ اپنے اوپر اللہ کے احسانات کا استحضار رکھے تاکہ تکبر میں مبتلا نہ ہو۔ ⑦ اپنا مال مصرف پر لگائے ناجائز جگہ پر نہ لگائے۔ ⑧ اپنے لیے تکبر اور بڑائی پسند نہ کرے۔ ⑨ پنجگانہ نماز رکوع، سجود کی پوری رعایت کے ساتھ بروقت ادا کرے۔ ⑩ حضرت نبی کریم ﷺ کی سنت اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طریق پر مضبوطی سے گامزن ہو۔

محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جن میں سے کوئی ایک بھی کسی حالت میں نہیں چھوڑنی چاہیے۔ ① کسی پر کبھی زیادتی نہ کرو۔ ② کسی کے خلاف تدبیر نہ کرو۔ ③ کبھی عہد نہ توڑو۔ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زہد کے تین درجے ہیں، فرض، فضل سلامت، فرض تو حرام سے بچنا ہے اور فضل یہ ہے کہ حلال میں بھی محتاط رہے اور سلامت یہ ہے کہ مشتبہ امور میں پرہیز گاری اختیار کرے۔ اکابرین اور سلف صالحین کے تقویٰ کی قابل رشک مثالیں اور واقعات انسان کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ملک شام سے بیت المال کا تیل آیا جو بڑے بڑے برتنوں میں تھا، آپ نے اسے لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کیا، آپ کا بیٹا بھی پاس ہی موجود تھا، جب برتن خالی ہو جاتا تو وہ اسے صاف کر کے اپنے بالوں پر مل لیتا تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ تیرے بال مسلمانوں کے تیل کے بہت شوقین معلوم ہوتے ہیں، یہ کہا اور ہاتھ پکڑ کر حجام کے پاس لے گئے اور بال منڈوا دیے اور فرمایا کہ اس کی نسبت یہ اچھا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے عمان تک سفر کے لیے ایک جانور کرایہ پر لیا، راستہ میں کوڑا ہاتھ سے گر گیا، جانور کو وہیں باندھا، خود پیدال واپس ہو کر کوڑا اٹھایا، کسی نے کہا کہ جانور ہی کو کیوں واپس نہ پھیر لیا؟ فرمایا میں نے جانور آگے جانے کے لیے کرایہ پر لیا ہے، واپس لوٹانے کے لیے نہیں۔

امام ابن ابی شیبہ ابن ابی الدنیا، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے طلق بن حبیب سے روایت کیا ہے کہ اس سے کہا گیا کیا آپ ہمارے لئے تھوڑی بات میں بھی تقوی کو جمع نہیں فرماتے یعنی تقوی کی مختصر اور

جامع تعریف فرمادیں کہ لوگ اس کو سمجھ لیں؟ انہوں نے فرمایا تقوی وہ عمل ہے جو اللہ کی اطاعت کے ساتھ ہو اور اللہ کی طرف سے ہدایت کی روشنی میں ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہوئے تقوی اللہ کی نافرمانی کو چھوڑنے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف (ہدایت والے) نور پر ہو۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پورا تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے، یہاں تک کہ رائی کے دانے کے برابر بھی اس سے ڈرے (اور) یہاں تک کہ بعض حلال چیزوں کو چھوڑ دے اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ شاید یہ حرام ہو تو یہ چیز اس کے اور حرام کے درمیان پردہ بن جائے گی۔ (کتاب الزہد لاحمد) حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تقویٰ متقین کے ساتھ برابر رہتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے حرام سے ڈرتے ہوئے بہت سی حلال چیزوں کو چھوڑ دیا۔ (ابن ابی الدنیا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سے پوچھا گیا کہ تقویٰ کیا ہے؟ اس نے کہا کیا تو نے کبھی ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس میں کانٹے ہوں؟ اس نے جواب دیا ہاں! پھر اس نے پوچھا اس راستے پر چلنا ہو تو کس طرح تو کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا جب میں کوئی کانٹا دیکھتا ہوں تو اس سے ہٹ جاتا ہوں یا اس سے بچ کر جاتا ہوں یا اس سے رک جاتا ہوں فرمایا یہی تقوی ہے۔ (کتاب التقویٰ)

حضرت سہم بن سحاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تقوی کا میدان یہ ہے کہ تیری زبان برابر اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رہے۔ (ابن ابی الدنیا) سعید بن ابی سعید مقبری سے روایت ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ ایک آدمی عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا اے معلم الخیر یعنی خیر کے سکھانے والے کس طرح میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا بن جاؤں جیسا وہ چاہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا ایک چھوٹے سے عمل کے راستے تو اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائی کے ساتھ محبت کر اور تو عمل کر اپنی محنت اور قوت کے ساتھ جتنا ہو سکے اور اپنے جنس کے بیٹے پر تو رحم کر جیسے تو اپنی جان پر رحم کرتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ میری جنس کا

بیٹا کون ہے اے معلم الخیر؟ انہوں نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد اور جس تکلیف کو تو پسند نہیں کرتا کہ وہ تیرے پاس آئے سو تو بھی اس کو کسی کے پاس مت لا یعنی کسی کو تکلیف نہ دے پس تو یقیناً اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ (کتاب الزہد)

ایاس بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تقویٰ کی اصل یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، پھر لوگ آپس میں ایک دوسرے سے فضیلت لے جاتے ہیں، تقویٰ کے لحاظ سے اور گناہوں سے بچنے کے لحاظ سے۔ (ابن ابی الدنیا) عون بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تقوی کی ابتداء اچھی نیت اور اس کا آخر توفیق الٰہی ہے اور بندہ ان کے درمیان ہے اور وہ ہلاک کرنے والا اور شبہات میں ڈالنے والے کے درمیان ہے اور نفس مدد کرتا ہے ان (مہلکات اور شبہات) کے راستے پر چلنے کی اور دشمن مکار ہے یعنی شیطان بھی غافل اور عاجز نہیں ہے کہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دے۔

حضرت محرز طفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ شخص تقویٰ کی چابیوں کی کیسے امید رکھتا ہے جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔ (ابن ابی الدنیا) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ دن کو روزہ رکھنا اور رات کو قیام کرنا اور ان کے درمیان میں معاملات کو خلط ملط کرنا تقوی نہیں ہے، لیکن تقوی یہ ہے کہ اس چیز کو چھوڑ دینا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا اور اس چیز کو ادا کرنا جس کو اللہ تعالیٰ نے فرض فرمایا سو جو شخص اس کے بعد نیکی کی توفیق دیا گیا پس وہ خیر ہی خیر ہے۔ (ابن ابی الدنیا)

حضرت محمد بن یوسف فریابی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے سفیان ثوری رحمہ اللہ سے عرض کیا میں دیکھتا ہوں لوگوں کو کہ وہ سفیان ثوری کا ہر وقت تذکرہ کرتے ہیں اور آپ رات بھر سوتے رہتے ہیں، انہوں نے مجھے فرمایا چپ ہو جاؤ، اس کا دارومدار تقویٰ پر ہے۔ (ابن ابی الدنیا)

حضرت شبیب بن شبہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حکماء میں سے ایک آدمی نے عبد الملک بن مروان کے پاس آکر بات کی اور متقی کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق

پر ترجیح دے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے خواہشات اس کو غم میں مبتلا نہ کریں، لالچ اس کے لئے رکاوٹ نہ بنے، اپنے ارادہ کی بلندیوں کو اپنے دل کی آنکھ سے دیکھے اور ان کا تلاش کرنے والا ہو، اس میں زہد چھپا ہوا ہو، جب لوگ سو جائیں تو وہ غم کی حالت میں رات گزار دے، دنیا میں غم زدہ اور قیدی بن کر زندگی گزارے، اس کے ارادے سے راحت کا خیال ختم ہو جائے سوائے اس کی اچھی آرزو کے، اس کی شفا قرآن ہو اور اس کی دوا حکمت کا کلام اور اچھی نصیحت ہو وعظ و نصیحت پر معاوضہ طلب نہ کرے اور اس کے علاوہ اس سے کسی چیز سے راحت و لذت نہ ملے یہ سن کر عبد الملک نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ ہم سے زیادہ پر امید ہے اور بہتر زندگی والا ہے۔ (امام ابن ابی الدنیا)

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی متقین میں سے نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے شریک کے حساب لینے سے زیادہ سخت اپنی ذات کا حساب نہ لے یہاں تک کہ تو جان لے کہ اس کا کھانا کہاں سے ہے، اس کا پہننا کہاں سے ہے، اس کا پینا کہاں سے ہے، کیا وہ حلال میں سے ہے یا حرام میں سے؟ (مصنف ابن ابی شیبہ، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم اصفہانی)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو جب تخت خلافت پر بٹھایا گیا تو انہوں نے اللہ کی حمد اور اس کی ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا میں تم کو اللہ کے تقوی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ڈر قائم مقام ہے ہر چیز سے اور کوئی چیز اللہ کے ڈر کا قائم مقام نہیں۔ (امام ابن ابی الدنیا)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو اس سے فرمایا مجھ سے بات کر، اس نے کہا متقین کے لیے خوشخبری ہے۔ (امام ابن ابی الدنیا) مالک بن دینار رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قیامت متقین کی خوشی اور مسرت کا دن ہے۔ (ابن ابی الدنیا)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص ابو العفیف رحمہ اللہ نامی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جنت والے چار قسموں میں جنت میں داخل کیے جائیں گے، پہلے متقی داخل کیے جائیں گے، ان کے بعد شاکرین داخل کیے جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے خائفین داخل کیے جائیں

گے، ان کے بعد اصحاب الیمین داخل کیے جائیں گے جنہیں نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ (ابن ابی حاتم، تفسیر در منثور)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہیں جو ایمان لا کر، شرک سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالائیں۔ ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کی امید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اسے سچا جانتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

قرآن کریم کن لوگوں کے لیے سامان ہدایت ہے؟

سوال قرآن کریم میں یہاں کتاب مقدس کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ متقی لوگوں کے لیے سامان ہدایت ہے، جب کہ سورت لقمان میں فرمایا گیا کہ قرآن کریم نیکوکاروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، سورت یونس میں فرمایا گیا کہ یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، جب کہ اسی سورت البقرہ میں دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ یہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے، متقین، محسنین، مؤمنین اور الناس چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یہ تو واضح طور پر تعارض ہے، اس کا کیا جواب ہے؟

جواب اَرباب تفسیر نے اس کے دو جوابات دیے ہیں ① اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم سارے ہی انسانوں کے لیے سامان ہدایت ہے، جو انسان بھی اس کی تلاوت کرے، اس کے مضامین پر غور کرے، جو اس کی آیات میں تدبر کرے، جو اس کے معانی، مفاہیم و مطالب پر توجہ دے تو وہ ہدایت پا سکتا ہے، جن آیات میں متقین، محسنین اور مؤمنین کو خاص کیا گیا ہے وہ اس لیے کہ اصل یہی لوگ ہیں جو اس نور ربانی سے فیض حاصل کرتے ہیں، جو لوگ اس کتاب ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے درجات مختلف ہیں، متقین اور محسنین نے اعلیٰ درجہ میں قرآن کریم سے فیض پایا، رہے عام اہل ایمان تو وہ پہلے درجے والوں کی طرح اس عظیم الشان کتاب سے فیض حاصل نہیں کر پاتے، فیض سب کو ملتا ہے، مگر درجہ بدرجہ، پھر جن لوگوں کو تقویٰ، ایمان اور احسان کے درجہ سے

نوازا گیا ان پر یہ عظیم فضل بھی فرمادیا گیا کہ ان کی تعریف وستائش بھی قرآنی نقوش میں ثبت کردی گئی ہے جو قیامت کی صبح تک لوحات قرآنی میں دمکتی اور چمکتی رہے گی۔

② ہدایت کے معنیٰ میں اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ہے، اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہدایت کا معنیٰ راستہ دکھانا ہے، جب کہ معتزلہ کے نزدیک ہدایت کا معنیٰ منزل مقصود تک پہنچانا ہے، قرآن کریم میں یہ دونوں ہی صفات پائی جاتی ہیں، راستہ دکھانے والا معنیٰ ہر شخص کے لیے عام ہے، قرآن کریم نے حق وباطل، نور وظلمت، روشنی واجالا سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اسی کو قرآن کریم نے فرمایا کہ یہ قرآن لوگوں کے لیے ہدایت ہے، یہ راستہ دکھانا ہے، جب کہ متقی، مومن اور محسن کی صفت رکھنے والوں کے لیے قرآن کریم کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی کی منزل مقصود تک پہنچانے میں ہدایت کا دوسرا معنیٰ پایا جاتا ہے کہ اہل تقویٰ، اہل ایمان اور اہل احسان قرآن کریم کی روشن اور نورانی تعلیمات کو اپنا کر، عمل پیرا ہو کر مقصود اصلی تک پہنچ گئے، اس کو قرآن کریم نے هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، هُدًى لِلْمُحسِنِينَ اور هُدًى لِلمومِنين سے تعبیر فرمایا، اس لیے متقین، مؤمنین اور محسنین کے حق میں ہدایت کا معنیٰ منزل مقصود تک پہنچانے کا ہے، جب کہ عام لوگوں کے لیے ہدایت کا معنیٰ راستہ دکھانے کا ہے، اس لیے ان آیات کے درمیان کسی قسم کا تعارض اور اختلاف نہیں پایا جاتا۔

اہل تقویٰ کی نشانیاں

سوال قرآن کریم کی سورۃ البقرہ میں متقین کی کیا کیا نشانیاں بیان کی گئی ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں متقین کی یہ نشانیاں بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳) وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (۴) (البقرہ

جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو اور ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ

کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اُتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔

ان دو آیات میں اہل تقویٰ کی چھ علامات وصفات بیان کی گئی ہیں، ان میں پہلی ① صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو بن دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ② دوسری صفت یہ ہے کہ یہ نماز قائم کرتے ہیں۔ ③ تیسری صفت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ④ چوتھی صفت یہ ہے کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ پر نازل کردہ چیز (قرآن کریم اور قرآن کریم کا معنیٰ اور مفہوم یعنی حدیث شریف) پر ایمان رکھتے ہیں اور ⑤ پانچویں صفت یہ ہے کہ یہ لوگ پہلی کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور دیگر آسمانی صحیفوں) پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ان کی ⑥ چھٹی صفت یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ: وہ لوگ بن دیکھی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اہل تقویٰ کی تفسیر بیان کی جارہی ہے، وہ اس طرح کہ نیک اعمال کرنے والا اور برائیوں سے بچنے والا متقی ہوتا ہے، انسانی فعل یا دل سے ہوگا یا اس کے اعضاء وجوارح سے ہوگا، اگر دل سے ہو تو اس کی طرف اشارہ یؤمنون کے ساتھ کیا گیا اور انسانی اعضاء وجوارح سے کیے جانے والے فعل کی بنیاد نماز، زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات ہے، اس لیے کہ عبادت یا تو بدنی ہوگی یا مالی، بدنی عبادت میں نماز افضل عبادت ہے، مالی عبادت میں زکوٰۃ کی ادائیگی افضل ہے، نبی کریم ﷺ نے اسی لیے نماز کو دین اسلام کا ستون قرار دیا ہے، زکوٰۃ کو اسلام کا پل قرار دیا ہے۔

بے حیائی کا ارتکاب کرنا، فحاشی کی دلدل میں دھنسنا، منکرات کے بھنور میں گھومنا یہ وہ امور ہیں جو تقویٰ کے بالکل منافی ہیں، اگرچہ نماز بے حیائی، برائی اور منکر سے روکتی ہے، ان کاموں کا ارتکاب کرنے والا متقی نہیں کہلا سکتا، متقی وہی ہے جو ان تمام مناہی امور سے اپنا دامن تقویٰ بچاتا ہوا آگے کی سمت بڑھتا جائے، بس اوامر خداوندی کو اس کی منشاء اور مرضی اور نبی کریم ﷺ کے نورانی

طریقوں کے مطابق انجام دیتا رہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایمان بالغیب، نماز، زکوٰۃ، ایمان بمانزل اللہ اورایقان بالآخرۃ کو بعد میں ذکر کیا، جب کہ تقویٰ کا پہلے ذکر کیا، حالانکہ باقی ساری باتوں کو پہلے اور تقویٰ کو بعد میں ذکر کرنا چاہیے تھا، کیونکہ ان چیزوں کی بجاآوری سے آدمی متقی بنتا ہے، لیکن یہاں یہ اسلوب نگارش لانے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی دل اس تختی کی مانند ہے جو درست عقائد اور بہترین اخلاق کے نقوش قبول کرتی ہے، تختی پر نقوش ڈالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسے پہلے صاف کیا جائے، اسے دھویا جائے، اسے مانجھا جائے، اس تختی پر جو غلط سلط لائنیں، لکیریں اور چیزیں لکھی ہوئی ہیں انہیں ہٹایا جائے، تاکہ اس پر اچھے اور عمدہ نقوش ڈالے جائیں، اسی لیے یہاں تقویٰ کا ذکر پہلے کیا تاکہ نامناسب افعال صاف ہوں اور اچھے افعال اس پر ثبت ہو سکیں۔

یُؤۡمِنُونَ: ایمان باب افعال سے مضارع کا صیغہ ہے، ایمان کسی کی تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے، کسی کو تکذیب و مخالفت سے امن دینے کو ایمان کہا جاتا ہے، اگر ایمان با کے ساتھ متعدی ہو تو اس میں اقرار واعتراف کا معنیٰ شامل ہو جاتا ہے، ایمان کے شرعی مفہوم میں اہل قبلہ کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے اور ایمان کی شرعی تعریف بارے چار فرقے ہیں، پہلا فرقہ معتزلہ، خوارج اور زیدیہ کا ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان افعال قلوب وجوارح اور اقرار باللسان کا نام ہے۔

پھر خوارج کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایمان باللہ، معرفت الٰہی اور ہر اس چیز کو شامل ہے جس پہ اللہ تعالیٰ نے دلیل عقلی یا کتاب وسنت سے دلیل نقلی بیان فرمائی ہے، اسی طرح طاعت الٰہی کو بھی شامل ہے جو تمام مامور افعال وتروک میں ہے، خواہ وہ صغیر ہے یا کبیر، ان تمام کا مجموعہ ایمان ہے، ان میں ایک کو بھی ترک کرنا کفر ہے۔

معتزلہ اس پر متفق ہیں کہ جب الفظ ایمان با کے ساتھ متعدی ہو تو مراد تصدیق ہوتی ہے، اس کو کہا جاتا ہے فُلَانٌ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَبِرَسُولِہٖ تو یہاں تصدیق ہی مراد ہے، کیونکہ ایمان بمعنیٰ اداء واجبات

یوں متعدی نہیں ہوتا، جب کوئی نماز روزہ کرے تو نہیں کہا جاتا فُلَانٌ اٰمَنَ ھٰکَذَا جبکہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ اٰمَنَ باللّٰہِ جیسا کہ یوں بھی کہا جاتا ہے صَامَ وَصَلّٰی للّٰہِ تو جب لفظ ایمان با سے متعدی ہو گا تو اس کا معنیٰ اہل لغت والا (تصدیق) ہی ہو گا، ہاں جب مطلق غیر متعدی استعمال ہو گا تو یہ معنیٰ لغوی (تصدیق) سے منقول ہو کر دوسرے معنیٰ میں مستعمل ہو گا۔

پھر معتزلہ کا اس کے مفہوم میں اختلاف ہے، ایک رائے ان کی یہ ہے کہ ایمان تمام نیکیاں بجا لانے کا نام ہے، خواہ وہ واجب ہیں یا مندوب و مستحب، وہ باب اقوال سے ہیں یا افعال یا اعتقادات سے ہیں، ایک رائے معتزلہ کی یہ ہے کہ ایمان واجبات کو بجالانے کا نام ہے نہ کہ نوافل کا، ایک رائے معتزلہ کی یہ ہے کہ ایمان ہر اس کام سے بچنا ہے جس پر وعید آئی ہے، تو اللہ کے ہاں وہ مومن ہے جو کبیرہ گناہوں سے بچے اور معتزلہ کے ہاں مومن وہ ہو گا جو ہر اس کام سے بچے جس پر وعید آئی ہے۔ (کبیر)

حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ معرفت الٰہی ایمان کامل ہے اور یہی اصل ہے، اس کے بعد ہر طاعت الگ ایمان ہے اور تمام طاعات تب ایمان بنتی ہیں جب یہ اصل معرفت پر مرتب ہوں اور کہتے ہیں کہ ان کا انکار و مخالفت کفر ہے، پھر اس کے بعد ہر معصیت کفر ہے، یہ کسی طاعت کو بھی ایمان نہیں کہتے جب تک معرفت و اقرار موجود نہ ہو اور کسی معصیت کو کفر نہیں کہتے جب تک انکار و مخالفت نہ ہو کیونکہ فرع اصل کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

محدثین رحمہم اللہ کی ایک رائے یہ ہے کہ ایمان تمام طاعات کے بجالانے کا نام ہے اور یہ ایمان واحد ہے، انہوں نے تمام فرائض و نوافل کو ایمان کا حصہ و جز کہا ہے، جس نے فرائض میں سے کچھ ترک کیا اس کا ایمان ناقص اور جس نے نوافل چھوڑے اس کا ایمان ناقص نہیں، ان میں سے بعض نے کہا ایمان فرائض کا نام ہے نوافل کا نہیں۔

دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ ایمان تصدیق قلبی اور لسانی دونوں کا نام ہے، پھر ان کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور تمام فقہاء رحمہم اللہ کا یہ مذہب ہے کہ ایمان اقرار باللسان اور معرفت قلبی کا نام ہے، پھر

ان میں دو مقامات پر اختلاف ہے ایک یہ کہ اس معرفت کی حقیقت میں اختلاف ہے بعض نے اس کی تفسیر اعتقاد جازم سے کی ہے خواہ اعتقاد تقلیدی ہو یا دلیل کی بنا پر ہو، یہی اکثریت کہتی ہے کہ مقلد مسلمان ہی ہوتا ہے بعض نے معرفت کی تفسیریوں کی کہ ایسا علم جو استدلال سے ثابت ہو۔ دوسری رائے یہ ہے ثبوت ایمان میں کون سا علم معتبر ہے؟

بعض متکلمین نے کہا کامل طور پر اللہ کی ذات وصفات کا علم ہے، پھر جب صفات باری میں خلق کا بہت اختلاف ہو گیا اور ہر ایک نے دوسرے کی تکفیر کی تو اہل انصاف نے کہا ہر اس چیز کا علم جس کا دین محمدی ہونا بدیہی وظاہر ہو یعنی ضروریات دین کا ماننا کافی ہے تو اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا عالم بالعلم لذاتہ اور اس کے مرئی اور غیر مرئی ہونے کا علم ایمان میں داخل نہیں۔

حضرت ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ اور بشر بن عتاب مریسی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی اور لسانی کا نام ہے، یہاں تصدیق بالقلب سے مراد کلام قائم بالنفس ہے۔ تیسرا قول صوفیاء رحمہم اللہ کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اقرار لسانی اور اخلاص قلبی کا نام ایمان ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

تیسرا فرقہ کہتا ہے کہ ایمان فقط عمل قلبی کا نام ہے، پھر ان کے دو اقوال ہیں، ایک یہ کہ ایمان معرفت الٰہی بالقلب ہے یہاں تک کہ جسے دلی معرفت الٰہی حاصل ہو گی پھر زبان سے انکار کیا اور پھر اقرار سے پہلے مر گیا تو وہ کامل مؤمن ہے، یہ جہم بن صفوان کا قول ہے، وہ کہتا ہے معرفت کتب رسل اور یوم آخرت ایمان میں داخل نہیں، شیخ کعبی رحمہ اللہ نے اس سے یہ نقل کیا کہ ایمان اللہ کی معرفت کے ساتھ اس تمام کی معرفت کا نام ہے جس کا دین محمد ہونا واضح ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایمان محض تصدیق قلبی کا نام ہے یہ حسین بن فضل الحلبی کا قول ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

چوتھا فرقہ کہتا ہے کہ ایمان اقرار لسانی ہے، آگے پھر اس کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ایمان تو فقط اقرار لسانی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دل میں حصول معرفت ہو، تو ان کے ہاں اقرار کے ایمان بننے کے لیے معرفت شرط ہے نہ کہ ایمان میں داخل، یہ غیلان بن مسلم دمشقی اور فضل رقاشی

کا قول ہے، اگرچہ کعبی نے غیلان کا قول کہنے سے انکار کیا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ایمان محض اقرار لسانی ہے اور یہ کرامیہ کا قول ہے ان کا کہنا ہے کہ منافق ظاہراً مؤمن اور باطناً کافر ہے دنیا میں اس کا حکم مؤمنین اور آخرت میں کفار والا ہے، ایمان کے شرعی مفہوم میں مختلف فرقوں کے اقوال کا مجموعہ اور خلاصہ یہی ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں ان چاروں فرقوں کی آراء بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارا مختار یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، ایمان اعتقاد کے ساتھ ان تمام کی تصدیق کا نام ہے جن کا دین محمدی ہونا معروف و آشکار ہے۔ (تفسیر کبیر)

نفس ایمان اور ایمان کامل: حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایمان تصدیق، اقرار اور عمل کا نام ہے جس کی تصدیق میں خلل ہو وہ منافق ہے، جس کے اقرار میں خلل ہو وہ کافر ہے اور جس کے عمل میں خلل ہو وہ فاسق ہے، وہ دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات پالے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسلک پر یہ قوی اشکال ہے کہ جب اعمال ایمان کا جز ہیں اور جز کی نفی سے کل کی نفی ہو جاتی ہے تو بے عمل شخص مومن کیسے ہو گا؟ اور وہ کیسے دوزخ سے خارج اور جنت میں داخل ہو گا؟ اس اشکال کا یہ جواب ہے کہ شارع کے کلام میں ایمان کبھی اصل ایمان کے معنی میں ہوتا ہے اور اصل ایمان میں اعمال کا اعتبار نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس سے ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان لاؤ اور اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ (صحیح مسلم)

اور کبھی شارع کے کلام میں ایمان، ایمان کامل کے معنی میں ہوتا ہے جس میں اعمال داخل ہوتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ پر ایمان لانا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بات کی گواہی دینا کہ

اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت سے خمس ادا کرنا۔ (مسلم)

پہلی حدیث میں ایمان اصل ایمان یا نفس ایمان کے معنی میں ہے اور اس دوسری حدیث میں ایمان، ایمان کامل کے معنی میں ہے اور جن احادیث میں اعمال کی نفی سے ایمان کی نفی کی گئی ہے ان میں ایمان سے مراد ایمان کامل ہے اور جن احادیث میں عمل کی نفی کے باوجود ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے اور جنت کی بشارت دی گئی ہے ان میں ایمان سے مراد نفس ایمان ہے، اس کی مثال یہ ہے: جس وقت زانی زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم) اس حدیث میں ایمان کامل کی نفی ہے۔

حضرت رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جس شخص نے بھی لا الہ الا اللہ کہا پھر اسی پر مر گیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، میں نے کہا، خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو! آپ نے فرمایا: خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ (صحیح مسلم) اس حدیث میں نفس ایمان مراد ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف لفظی ہے کیونکہ اس کا رجوع ایمان کی تفسیر کی طرف ہے اور ایمان کا کون سا معنی منقول شرعی ہے اور کون سا معنی مجاز ہے اس میں اختلاف ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس ایمان کی وجہ سے دوزخ میں دخول سے نجات ملتی ہے وہ ایمان کامل ہے، اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور جس ایمان کی وجہ سے دوزخ کے خلود سے نجات ملتی ہے وہ نفس ایمان ہے اس میں اہل سنت کا اتفاق ہے اور خوارج اور معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ سلف اور امام شافعی رحمہ اللہ نے جو اعمال کو ایمان کا جز کہا ہے اس ایمان سے ان کی مراد ایمان کامل ہے نہ کہ نفس ایمان یا اصل ایمان مراد ہے اور جب وہ کسی بے عمل یا بد عمل شخص پر مومن کا اطلاق کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد نفس ایمان ہوتی ہے نہ کہ ایمان کامل، وہ کہتے

ہیں کہ اس شخص میں ہر چند کہ ایمان کامل نہیں ہے لیکن وہ نفس ایمان کی وجہ سے نجات پاجائے گا۔ (عمدۃ القاری ج ا بحوالہ تبیان)

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، ایمان کی تعریف میں جو تصدیق بالقلب معتبر ہے اس سے مراد علم، معرفت اور جاننا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا اور نبی کریم ﷺ کے دعوی کی تصدیق کرنا اور آپ ﷺ کو مخبر صادق ماننا ہے، کیونکہ بعض کفار بھی حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو جانتے تھے لیکن وہ مومن نہیں تھے، قرآن مجید میں ہے، اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ: ۱۴۶) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس نبی کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے حکایت کی ہے، انہوں نے فرعون سے فرمایا: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (اسراء: ۱۰۲) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یقیناً تو جانتا ہے کہ ان (چمکتی ہوئی نشانیوں) کو آسمانوں اور زمینوں کے رب نے ہی اتارا ہے جو آنکھیں کھولنے والی ہیں اور اے فرعون! میں گمان کرتا ہوں کہ تو ہلاک ہونے والا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا کفار اور فرعون کو علم تھا، اس کے باوجود وہ کافر تھے اور وہ مومن نہیں تھے، نیز اس سے واضح ہوا کہ ایمان کے تحقق کے لیے صرف جاننا کافی نہیں ہے ماننا ضروری ہے یعنی اپنے قصد اور اختیار سے مخبر کی طرف صدق کو منسوب کرے اور اسے اس کی دی ہوئی خبروں میں صادق قرار دے۔ (عمدۃ القاری ج ا)

ایمان اور اسلام: مسلم شریف میں روایت ہے کہ حضرت جبریل امین انتہائی سفید لباس، انتہائی سیاہ بالوں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، ان پر نشانات سفر بالکل نہیں تھے، ہم میں سے کوئی بھی انہیں نہیں جانتا تھا، یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آکر بیٹھ گئے،

آپ ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ اپنے گھٹنے ملا دیے، اپنی ہتھیلیاں نبی کریم ﷺ کی رانوں پر رکھ دیں، پھر آپ ﷺ سے پانچ سوالات کیے، ان میں سے دو سوالات ایمان اور اسلام کے بارے میں بھی تھے، ان میں پہلا سوال اسلام کے بارے میں تھا کہ اسلام کیا ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے جواب دیا اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا

اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس بات کی گواہی دے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان المبارک کے روزے رکھے اور اگر تو استطاعت رکھتا ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اسلام کے بارے میں یہ جواب سن کر جبریل امین نے کہا کہ آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس شخص پر تعجب ہوا کہ وہ سوال بھی کرتا ہے اور جواب سننے کے بعد اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، دوسرا سوال جبریل نے یہ کیا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے تو اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر ایمان لائے، اللہ کے فرشتوں پر ایمان لائے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے، روز آخر پر ایمان لائے اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لائے۔

اَلْغَيْبُ: یہ مصدر قائم مقام اسم فاعل ہے، جیسے صوم صائم کے معنیٰ میں ہے، زور زائر کے معنیٰ میں ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد یؤمنون بالغیب میں دو اقوال نقل کیے گئے ہیں، ایک ابو مسلم اصفہانی کا ہے اور ان کا مختار بھی یہی ہے، بالغیب مؤمنین کی صفت ہے معنیٰ یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ پر حالت غیب میں بھی ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ وہ سامنے ایمان رکھتے ہیں اور وہ منافقین کی طرح نہیں ہوتے، کہ جب وہ اہل ایمان سے ملیں تو کہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم مسلمانوں کے ساتھ تو ہنسی مزاح کرتے ہیں، یہ تمام اہل ایمان کی

مدح ہے کہ ان کا ظاہر ان کے باطن کے موافق اور حال منافقین کے مخالف ہے کیونکہ وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔

جمہور مفسرین کرام کا قول یہ ہے کہ غیب وہ ہے جو حواس سے غائب ہو، پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ غیب جس پر دلیل ہو اور دوسرا وہ غیب جس پر دلیل نہ ہو، اس آیت میں متقین کی مدح ہے کہ وہ اس غیب پر ایمان رکھتے ہیں جس پر دلیل شاہد ہے بایں طور کہ وہ تفکر واستدلال کر کے غیب پر ایمان لاتے ہیں، اس صورت میں ذات الٰہی اس کی صفات کا علم، آخرت کا علم، نبوت اور احکام شرعیہ کا علم بھی داخل ہے کیونکہ ان علوم کے استدلال سے حصول میں بہت مشقت ہے، اس لیے یہ ان کی ثناء عظیم کا سبب ٹھہرا۔

روافض میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہاں غیب سے مراد حضرت امام مہدی علیہ الرضوان ہیں، انہی کے بارے میں سورۃ النور میں وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو دی تھی، ایک روایت میں ہے کہ اگر دنیا سے ایک ہی دن رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دیں گے تاکہ میرے اہل بیت سے ایک شخص آئے گا جس کی کنیت میری کنیت پر ہوگی اور جس کا نام میرے نام پر ہوگا وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسا کہ وہ پہلے سے ظلم وجور سے بھری تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بے تکی اور خانہ ساز بات ہے، سورۃ النور میں امام مہدی کی خلافت کا وعدہ نہیں فرمایا گیا بلکہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت کا وعدہ فرمایا گیا ہے جنہوں نے سر زمین مکہ میں ظلم وستم برداشت کیا، مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے پہنچے تو یہاں انہیں جنگوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کے اطمینان قلبی کے لیے سورۃ النور میں وعدہ فرمایا گیا کہ انہیں تاج خلافت پہنایا جائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو دیا گیا تھا، حدیث شریف میں امام مہدی کی خلافت اور عدل وانصاف کا ذکر ضرور موجود ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ان کا ذکر یہاں نہیں فرمایا، کسی

مفسر قرآن اور کسی محدث نے اپنی تفسیر میں اور کسی شرح حدیث میں اس آیت کا مصداق یہ بیان نہیں کیا۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ :يُقِيمُونَ اقامت سے ہے،باب افعال ہے،اہل تقویٰ کی دوسری نشانی اور علامت بیان کی جارہی ہے وہ نماز قائم کرتے ہیں، اقامت صلاۃ کا مطلب یہ کہ وہ اس کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں، نماز کے فرائض ، نماز کی سنن، نماز کے مستحبات اورآداب کالحاظ رکھتے ہیں،ان کی ادائیگی میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتے۔

اسی طرح اِقامت صلاۃ کاایک مفہوم یہ ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ہمیشہ ادا کرتا رہے، کبھی پڑھ لی، کبھی چھوڑ دی، وقت بے وقت نہ پڑھے بلکہ وقت پر ادائیگی کرنے والے ہی متقی ہیں،ان اہل تقویٰ کی سورۃ المعارج میں بھی تعریف ومدح کی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح سورۃ المعارج میں ان کی دوسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں ہمیشگی کرتے ہیں،اسی طرح اقامت صلاۃ کاایک مفہوم یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی میں کمی نہ کرے،کاہلی اور سستی نہ کرے، نماز میں کاہلی اور سستی اہل تقویٰ کی علامت ونشانی نہیں ہے بلکہ یہ منافقین کی نشانی وعلامت ہے، جیسے قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقامت صلاۃ کا ایک مفہوم نماز کی مطلق ادائیگی ہے،ادائیگی کو اقامت اس لیے کہا گیا کہ قیام نماز میں فرض ہے،اس کا رکن ہے۔

صلاۃ کا مفہوم :صلاۃ کے عربی میں کئی معانی ہیں، ایک معنیٰ دعا ہے، شیخ خارز نجی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صلاۃ صلی سے ہے، صلی کا مطلب یہ ہے کہ ٹیڑھی گیلی لکڑی کو آگ پر سینک کر سیدھا کرنا، جب لکڑی کو آگ پر سینک کر سیدھا کر دیا جائے تو عربی میں کہا جاتا ہے صَلَّيتُ العَصَا کہ میں نے لکڑی کو سیدھا کر دیا ہے، مصلی نمازی کو کہا جاتا ہے، گویا کہ اس نمازی کے ظاہر وباطن کو خوب سیدھا رکھنے کی کوشش کرنا ہے جیسے لکڑی کو سیدھا کرنے کے لیے اسے آگ پر پیش کیا جاتا ہے، صلاۃ کا ایک معنیٰ لازم ہونا ہے، سورۃ اللہب اور سورۃ الغاشیہ میں اسی معنیٰ میں آیا ہے،اسی طرح گھوڑ دوڑ کے مقابلے میں جو گھوڑا

دوسرے نمبر پر آتا ہے اسے مصلی کہا جاتا ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ: رزق کا معنیٰ حظ (حصہ) ہے، یعنی وہ حصہ جو کسی شخص کے لیے خاص ہو دوسرے کا نہ ہو، بعض یہ معنیٰ کرتے ہیں کہ رزق اسے کہتے ہیں جو کھایا پیا یا استعمال کیا جائے لیکن یہ معنیٰ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کردہ رزق میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے جیسے سورۃ الرعد میں ارشاد ہے کہ اس مال میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اگر رزق وہی ہے جو کھالیا جائے یا استعمال کر لیا جائے تو انفاق کا معنیٰ نہیں پایا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ رزق وہ ہے جس کا مالک بنا جائے، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ انسان اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کرتا ہے اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي وَلَدًا صَالِحًا وَّزَوْجَةً صَالِحَةً اے میرے پروردگار! مجھے نیک اولاد عطا فرمائیے اور مجھے نیک بیوی عطا فرمائیے۔ حالانکہ وہ نہ اولاد کا مالک ہوتا ہے اور نہ بیوی کا اور یہ بھی دعا کرتا ہے اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي عَقْلًا أَعِيشُ بِهٖ اے میرے پروردگار! مجھے ایسی عقل و دانش عطا فرمائیے جس سے بہتر زندگی بسر کروں، حالانکہ عقل مملوک و غلام نہیں، پھر چوپایوں کا رزق ہے حالانکہ وہ اس کے مالک نہیں ہوتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کے معنیٰ زکوٰۃ ادا کرنے کے ہیں۔ بعض صحابہ نے کہا ہے اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے۔ خرچ میں قربانی دینا جو قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ اپنی استعداد کے مطابق بھی شامل ہے جو زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی سات آیتیں جو سورۃ برأت میں ہیں ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو دیتے رہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مال تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے عنقریب تم سے جدا ہو جائے گا۔ اپنی زندگی میں اسے اللہ کی راہ میں لگا دو۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے زکوٰۃ میں اہل و عیال کا خرچ اور جن لوگوں کو

دینا ضروری ہے ان سب کو دینا بھی شامل ہے اس لئے کہ پروردگار نے ایک عام وصف بیان فرمایا اور عام تعریف کی ہے۔ لہذا ہر طرح کا خرچ شامل ہو گا۔ میں کہتا ہوں قرآن کریم میں اکثر جگہ نماز کا اور مال خرچ کرنے کا ذکر ملا جلا آتا ہے اس لئے کہ نماز اللہ کا حق اور اس کی عبادت ہے جو اس کی توحید، اس کی ثناء اس کی بزرگی، اس کی طرف جھکنے، اس پر توکل کرنے، اس سے دعا کرنے کا نام ہے اور خرچ کرنا مخلوق کی طرف احسان کرنا ہے جس سے انہیں نفع پہنچے، اس کے زیادہ حقدار اہل و عیال اور غلام ہیں، پھر دور والے اجنبی، لہذا تمام واجب خرچ اخراجات اور فرض زکوٰۃ اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں رَزَقْنٰهُمْ کا معنیٰ ہے، ہم نے انہیں عطا کیا۔ اہل سنت کے نزدیک رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو، معتزلہ کا مسلک اس کے مخالف ہے، ان کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے کیونکہ اس کا تملک صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ حرام عطا نہیں فرماتا بلکہ حلال عطا فرماتا ہے اور رزق ملک کے معنی میں ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں: اگر ایک بچہ چوروں کے ساتھ پرورش پائے اور اس نے کچھ نہ کھایا مگر وہ جو چوروں نے اسے کھلایا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوا، طاقتور ہوا اور چور بن گیا پھر وہ ہمیشہ چوری کرتا رہا اور مرتے دم تک چوری کا مال کھاتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی چیز عطا نہ فرمائی کیونکہ اس کا اسے مالک نہیں بنایا تھا اور وہ مر گیا اور اس نے اللہ کے رزق سے کچھ نہ کھایا، یہ قول اور نظریہ فاسد ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ رزق بمعنی تملیک ہوتا تو واجب تھا کہ بچے کو رزق نہیں دیا گیا اور ان جانوروں کے بچوں کو بھی رزق نہیں ملا کیونکہ ان کی ماؤں کے دودھ کا مالک تو ان کا مالک تھا نہ کہ جانوروں کے بچے۔ (تفسیر قرطبی ج ۱)

جب امت کا اس پر اجماع ہے کہ انسانی بچہ اور جانوروں کے بچے اور دوسرے جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے حالانکہ وہ مالک نہیں ہوتے، پس معلوم ہوا کہ رزق صرف غذا ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ غلاموں اور جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں

رزق دیتا ہے جبکہ وہ مالک نہیں ہوتے، پس معلوم ہوا رزق وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جو معتزلہ نے بیان کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَيۡرُ اللّٰهِ يَرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ (فاطر:۳) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوا الۡقُوَّةِ الۡمَتِيۡنِ۔ (الذاریات) (بلاشبہ اللہ ہی) (سب کو) روزی دینے والا قوت والا (اور) زور والا ہے) اور فرمایا: وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (ھود:۶) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)۔ یہ آیات قطعی ہیں، اللہ تعالیٰ حقیقۃً رازق ہے اور بندہ مجازاً رازق ہے کیونکہ اس کا مالک ہونا عارضی ہے، بندے کو بھی حقیقۃً ان جانوروں کی طرح رزق دیا گیا ہے جن کو کوئی ملکیت حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسے کسی چیز کے حاصل کرنے کا اِذن دے دیا گیا تو وہ حکماً اس کے لئے حلال ہو گی اور جس کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کا لینا حکماً حرام ہے اور یہ تمام رزق ہے۔ (تفسیر قرطبی)

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استنباط کیا ہے: كُلُوا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوا لَهٗ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ (سبا) (کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور)۔

فرمایا: مغفرت کا ذکر یہ اشارہ کرتا ہے کہ رزق کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ، رزق مصدر ہے رَزَقَ يَرۡزُقُ رِزۡقًا کا اور اَلرِّزۡقُ راء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور را کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس کی جمع اَرۡزَاق ہے اور اَلرَّزَّاق کا مطلب ہے الرازقیہ اولیٰ سفید کپڑوں کو کہتے ہیں۔ اِرۡتَزَقَ الۡجُنۡدُ کا مطلب ہے دس بکریوں نے اپنا اپنا رزق حاصل کیا۔ اَلرِّزۡقَةُ ایک مرتبہ لینا، اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: الرزق کا معنی ازدشنوہ لغت میں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں رزق کا معنی شکر ہے: وَ تَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ (واقعہ)۔ یعنی تمہارا شکر جھٹلانا ہے۔ رَزَقَنِي کا معنیٰ ہے: شَكَرَنِي اس نے میرا شکر ادا کیا۔ (تفسیر قرطبی ج ۱)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے کچھ راہ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں رزق کے لغوی معنی ہیں نصیب اور حصہ جیسا کہ آیت وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ میں (رزق سے یہی لغوی معنی حصہ (بہرہ) مراد ہیں مگر عرف میں رزق کہتے ہیں اس چیز کو جس سے جاندار فائدہ اٹھائے۔ (تفسیر مظہری)

علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رزق لغت میں اَلنَّصِيبُ وَالعَطَاءُ وَيُطلَقُ عَلَى الحِسِّيِ وَالمَعنَوِي (المنار) لغت میں رزق کہتے ہیں حصہ اور بخشش کو خواہ حسی ہو یا معنوی، مال، اولاد، علم و معرفت اس لحاظ سے سب رزق ہیں اور یہاں بھی رزق کا یہی لغوی معنی مراد ہے۔ اس آیت سے پتہ چلا کہ جو کچھ کسی کے پاس ہے مال و جاہ ہو، علم و عرفان ہو کسی کا اپنا نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اس میں ہے کہ وہ اس میں بخل نہ کرے، بلکہ جو ان نعمتوں سے محروم ہیں ان میں تقسیم کرتا رہے، دولت مند اپنی دولت سے، عالم اپنے علم سے اور عارف اپنے روحانی فیوضات سے مستحقین کو مالا مال کرے، یہ فیض عام متقین کی تیسری علامت ہے۔ (ضیاء القرآن)

شیخ عبد الحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں من تبعیضیہ کو پہلے ذکر کر کے جتلا دیا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اپنے مال کو دے کر فقیر ہو جاؤ اور پھر آپ مانگتے پھرو اور حیرانی اٹھاؤ کیونکہ یہ بات قانون شریعت کے بر خلاف ہے، نہ عام طبائع اس کو قبول کر سکتی ہے بلکہ یہ کہ کسی قدر خدا کی راہ میں دو اور باقی اپنے نفس اور اہل و عیال کے لیے رکھو، گویا کنایۃً اسراف اور فضول خرچیوں سے بھی منع کر دیا اور اس فضولی سے روک دیا کہ بیاہ شادی یا کسی اور تفاخر اور نامداری کے کام میں یا لڑکوں کی بسم اللہ، ختنہ، عقیقہ، دودھ بڑھانے میں اندھا بن کر صرف کیا جاوے کہ پھر آج جن کے روبرو اتراتے تھے کل ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں، اپنی جائیداد اور تنخواہ یا کسی اور آمدنی کو کسی سود خوار مہاجن کے پاس گروی رکھ کر تمام عمر کے لیے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس کا غلام بنا دیا جائے۔ (تفسیر حقانی)

يُنْفِقُونَ: یہ انفاق سے باب افعال مضارع کا صیغہ ہے، انفاق کا معنیٰ مال خرچ کرنا، راہ خدا میں مال لوٹانا، اللہ کی مخلوق کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا مال طیب نفس سے خرچ کرنا، شریعت اسلامیہ میں مال خرچ کرنا سات قسموں کی عبادت ہے۔

اول فرض زکوٰۃ ادا کرنا کہ سونے اور چاندی سے نصاب کی حد کو پہنچنے کی شرط کے ساتھ اور ایک سال گزرنے پر اس کا چالیسواں حصہ واجب ہے، اور مویشی اور تجارتی اموال اور عشری زمین کی پیدا وار سے بھی اسی طرح واجب ہے، دوسری صدقہ فطر کہ عید کا چاند دیکھنے سے دو سیر گندم ہر آدمی پر واجب ہوتی ہے۔

تیسری خیرات جو کہ سائلوں کو دینے، مہمانوں کی ضیافت، کمزوروں، یتیموں اور مقروضوں کی امداد کرنے سے عبارت ہے، چوتھی وقف جیسے مسجد، مدرسے، پل، کنواں اور سرائے بنانا، پانچویں مصارف حج خواہ اپنے لیے یا دوسرے کے لیے سامان حج درست کر کے دیا جائے جیسے سواری، سفر خرچ وغیر ذالک، چھٹا مصرف جہاد کہ اس جگہ ایک درہم خرچنا سات سو دراہم کے برابر ہے، ساتویں ادائے نفقات واجبہ وہ اخراجات جو کہ اس کے ذمہ واجب ہیں اور وہ زوجہ، چھوٹی اولاد اور دوسرے محارم اس شرط پر کہ اس میں استطاعت ہو اور وہ رشتے دار محتاج ہوں۔ (تفسیر عزیزی)

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے والوں پر نازل ہونے والی پر ایمان رکھتے ہیں کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان دونوں کی تصدیق کرتے ہیں، جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے لائے اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے والے انبیاء و مرسلین اللہ کی طرف سے لائے یہ ایمان لانے والے ان میں اور ان سابقہ انبیاء و مرسلین میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور نہ ہی یہ لوگ ان انبیاء کرام کی لائی ہوئی وحی کا انکار کرتے ہیں۔

ختم نبوت: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں تحریر فرمایا کہ

آیت کے اس طرز بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ کی وحی آخری وحی کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی کیونکہ تورات و انجیل اور تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا اگر آنحضرت ﷺ کے بعد بھی سلسلہ وحی اور نبوت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت ﷺ سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر فرمایا بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ بھی مضمون اول سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے سب میں آنحضرت ﷺ سے پہلے انبیاء پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے جس پر ایمان لانا ہے مثلاً ارشاد ہے

① وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ (سورۃ نحل: ۴۳) ② وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ (سورۃ مومن: ۷۸) ③ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا (سورۃ روم: ۴) ④ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۃ نساء: ۶۰) ⑤ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۃ زمر: ۶۵) ⑥ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۃ شوریٰ: ۳)

⑦ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (سورۃ بقرہ: ۱۸۳) ⑧ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (سورۃ اسرائیل: ۷۷) ان آیات میں اور ان کی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی و کتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلِ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے کہیں مِنْ بَعْدِ کا اشارہ تک نہیں اگر ختم نبوت اور انقطاع وحی کا دوسری آیات میں صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو

قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا۔ (معارف القرآن ج ۱)

اس آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، یومنون بالقرآن نہیں کہا، بلکہ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ فرمایا گیا ہے، یعنی قرآن کریم سے استفادہ کرنے والے وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے، اگر یہاں قرآن کریم کا نام لیا جاتا، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن فرمایا یہ جارہا ہے کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ وہ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

اسی طرح وہ حدیث اور سنت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کا مفہوم و معنی بھی آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، قرآن کریم کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، لیکن حدیث کا معنی اور مفہوم اللہ کی جانب سے نازل ہوتا رہا ہے، لیکن اس کے الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں، چنانچہ یہاں یہ فرمایا جارہا ہے، کہ وہ لوگ صرف قرآن پاک پر ایمان لانے کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ قرآن پاک کی عملی تشریح اور اس کے مبہمات کی وضاحت اور اس کے مجملات کی تفصیل جو حدیث کی شکل میں ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حدیث کو نظر انداز کرکے نہ قرآن پاک کو سمجھنا ممکن ہے اور نہ اس پر عمل کرنا اور جو شخص حدیث کا انکار کرتا ہے اور صرف قرآن پاک کو کافی سمجھتا ہے، وہ قرآن پاک کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ (روح القرآن)

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: آخرت پر ایمان رکھتے ہیں سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے کے دن قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ لوگ جنت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں، یہ لوگ حساب کتاب اور میزان قائم ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۔وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہی لوگ ہیں اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر اور یہی لوگ ہیں کامیاب۔ جو لوگ کتاب خداوندی کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہ

ہدایت پر چل پڑے، بن دیکھے ایمان وایقان کی دولت سے مالامال ہوگئے، نماز پنجگانہ کی ادائیگی کماحقہ کرتے رہے، رب تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے اس کا حق ادا کرتے رہے، کتاب وسنت کی روشن تعلیمات کو حرز جان بناتے رہے، ان پر عمل کرتے رہے، ایمانیات کو تسلیم کرتے رہے، سابقہ انبیاء کرام اوران کی کتابوں پر ایمان رکھتے رہے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر، روز قیامت پر، جنت دوزخ پر، حساب کتاب پر ایمان وایقان رکھتے رہے یہی لوگ تواپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامران وفائز المرام ہوں گے۔ فلاح کا معنی کسی چیز کو پھاڑنا اور کاٹنا ہے، کسان کو اس لیے فلاح کہتے ہیں کہ وہ ہل چلا کر زمین کو پھاڑتا ہے اور جو شخص محنت اور جدوجہد کرنے کے بعد کسی مطلوب کو حاصل کرلیتا ہے اس کو بھی مفلح کہتے ہیں گویا کہ اس پر غور وفکر کی راہیں کھل گئیں اور بند نہیں ہوئیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے مثلاً غیب پر ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، اللہ کے دیئے ہوئے سے دینا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اترا اس پر ایمان لانا، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں ان کو ماننا، دار آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے کے لئے نیک اعمال کرنا، برائیوں اور حرام کاریوں سے بچنا، یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے نور ملا اور بیان و بصیرت حاصل ہوا اور انہی لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں فلاح و نجات ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت سے کی ہے اور فلاح کی تفسیر اپنی چاہت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے کی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے نور، دلیل، ثابت قدمی، سچائی اور توفیق میں حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے ان پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات، ثواب اور دائمی جنت پانے کے مستحق ہیں اور عذاب سے محفوظ ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے یہاں ھدی کو مفلحون سے پہلے ذکر

کرنے کی وجہ یوں بیان فرمائی کہ ہدی کو فلاح سے بھی پہلے فرمایا۔ اصل چیز تو راہ ہی ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصل جزاء کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستے پر چل رہا ہے اور جو اس راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے اس کے لئے مفلحون فرمایا گیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسے بزرگوں کی جوتیوں میں پہنچا دیا کہ انہوں نے سیدھے راستہ پر ڈال دیا خلاصہ یہ ہے کہ بڑی چیز راہ پر آگاہ کر دینا اور پتہ ونشان بتلا دینا ہے۔ (اشرف التفاسیر)

کافروں کی ایمان سے محرومی کی سزا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (٦) خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (٧) البقرہ

جواب ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر، اور ان کے سننے کی قوت پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا: یعنی انہوں نے حق کو چھپایا اور اس پر پردہ ڈالا، یہ لوگ کسی صورت ماننے والے نہیں ہیں، ان کا فیصلہ ہو چکا ہے، انہیں ڈرانا نہ ڈرانا دونوں ہی برابر ہے، جو کچھ نبی کریم ﷺ لائے اس پر یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ [يُونُس: ٩٦، ٩٧] بیشک جن لوگوں پر آپ کے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس تمام دلیلیں آجائیں۔ جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے معاندین اہل کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ [الْبَقَرَة: ١٤٥]

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر آپ ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آئیں تب بھی یہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔

جب اللہ نے بد بختی اور بد نصیبی ان کے مقدر میں لکھ دی ہے تو یہ سعادت مند کیونکر ہو سکتے ہیں، جسے رب تعالیٰ راہ راست سے بھٹکا دیں وہ راہ راست پر گامزن نہیں ہو سکتا، اس لیے اے میرے حبیب! ان پر حسرت اور افسوس میں اپنی جان ضائع نہ کریں، آپ کو جو آسمانی پیغام ملتا جارہا ہے اسے لوگوں تک بلا کم و کاست پہنچاتے رہیں، جو اس پیغام کو قبول کرتا جائے گا وہ سعادت و نیک بختی کا وافر حصہ حاصل کرتا جائے گا، جو روگردانی کرے تو آپ اس پر غم گین نہ ہوں، سورۃ الرعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو واضح فرمایا کہ آپ کا کام لوگوں تک پیغام پہنچانا ہے اور ہمارے ذمہ اس کا حساب لینا ہے، سورۃ ھود میں فرمایا کہ آپ ﷺ کا منصب اور کام ڈرانا ہے باقی اللہ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت علی بن ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے ذیل میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے بارے میں حرص رکھتے تھے کہ وہ سبھی ایمان لے آئیں اور ہدایت پر آپ ﷺ کی پیروی کرنے والے بن جائیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا کہ وہی ایمان لائے گا جس کے لیے سعادت مندی لکھ دی گئی ہے، جس کے لیے بد بختی لکھ دی گئی ہے وہ ایمان نہیں لائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ کی طرف اتارا گیا ہے یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں، اگرچہ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ سے پہلے جو کچھ اتارا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں ہی برابر ہے، یہ آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ آپ سے پہلے جو کچھ اتارا گیا وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ سے پہلے جو کچھ اتارا گیا اس میں تو

آپ ﷺ کا ذکر موجود ہے، ان سے ان کتابوں میں عہد و پیمان کیا گیا تھا، آپ پر ایمان لانے کی بات کی گئی تھی مگر انہوں نے اس کا انکار کر دیا ہے، جو آپ لائے یہ اس کے بھی منکر ٹھہرے اور جو آپ سے پہلے ان کے پاس تھا اس کا بھی انکار کر دیا ہے، اس لیے یہ آپ ﷺ کی زبان سے ڈرانے کی بات سن ہی نہیں سکتے اس لیے انہیں ڈرانے کا فائدہ ہی نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

کفر کی تعریف: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے ان سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا اور حق سمجھنا اس لئے جو شخص آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔ (معارف القرآن)

اِنذار کے معنیٰ: حضرت مفتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ انذار ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو جیسا کہ ابشار ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اردو زبان میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے مگر در حقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے بلکہ ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بناء پر ہو جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے اسی لئے جو ڈاکو، چور ظالم، کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا، انبیاء کو خصوصیت سے نذیر کا لقب دیا جاتا ہے کہ وہ ازراہ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں انبیاء کے لئے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیر خواہی کیساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔ (معارف القرآن)

اس آیت میں رسول ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ ضدی اور معاند کفار جو

حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر وانکار پر جمے ہوئے ہیں یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بناء پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں ان کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا ان کے حق میں برابر ہے۔(معارف القرآن)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ: اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، ان کے کانوں میں ڈاٹ ڈال دی ہے، ان کی آنکھوں پر دہ ڈال دیا ہے، اس لیے ان کے دلوں میں حق بات جانہیں سکتی، ان کے کان حق بات سن نہیں سکتے اوران کی آنکھیں حق وصداقت کی کھلی نشانیاں دیکھ نہیں سکتیں، یہ راہ ہدایت کو پانہیں سکتے، یہ عقل وخرد سے عاری ہو چکے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں میں بستے جاتے ہیں اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں، بس یہی طبع اور ختم یعنی مہر ہے، دل اور کان کے لئے محاورہ میں مہر آتی ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن میں ران کا لفظ ہے طبع کا لفظ ہے اوراقفال کا لفظ ہے، ران طبع سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے، اقفال سب سے زیادہ ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے اور بندے کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے، اس طرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی پھر دوسرا گناہ کیا دوسری انگلی بند ہو گئی یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو گئیں اور اب مٹھی بالکل بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی، اسی طرح گناہوں سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں، مہر لگ جاتی ہے پھر اس پر کسی طرح حق اثر نہیں کرتا، اسے رین بھی کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ تکبر کی وجہ ان کا حق سے منہ پھیر لینا بیان کیا جارہا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے سننے سے بہرا بن گیا، مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پرواہی کر کے اس نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مختلف روایات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ

گناہوں کی زیادتی دلوں پر غلاف ڈال دیتی ہے اور اس کے بعد مہر الٰہی لگ جاتی ہے جسے ختم اور طبع کہا جاتا ہے۔ اب اس دل میں ایمان کے جانے اور کفر کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی، اسی مہر کا ذکر اس آیت (ختم اللہ) الخ میں ہے، وہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ جب کسی چیز کا منہ بند کر کے اس پر مہر لگا دی جائے تو جب تک وہ مہر نہ ٹوٹے نہ اس میں کچھ جا سکتا ہے نہ اس سے کوئی چیز نکل سکتی ہے، اسی طرح جن کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر الٰہی لگ چکی ہے ان میں بھی بغیر اس کے ہٹے اور ٹوٹے نہ ہدایت آئے، نہ کفر جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ: جھٹلانے والے کفار کے لئے عذاب عظیم ہے۔ عظیم، عذاب کی صفت ہے۔ عذاب کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً کوڑے مارنا، آگ کے ساتھ جلانا، لوہے سے کاٹنا وغیرہ جو بھی انسان کو تکلیف پہنچائے وہ عذاب ہے۔ قرآن میں ہے: **وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ** [النور: ۲] اس کا معنی الحبس اور المنع (روکنا) ہے۔ لغت میں کہا جاتا ہے: **أَعْذَبْتُهُ عَنْ كَذَا** یعنی میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے **عُذُوبَةُ الْمَاءِ** ہے پانی کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ برتن میں پانی کو روکا جاتا ہے تاکہ صاف ہو جائے اور جو دوسرا مواد اس میں ملا ہوا ہے وہ جدا ہو جائے۔

اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے **أَعْذِبُوا نِسَاءَكُمْ عَنِ الْخُرُوجِ**، یعنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا تو آپ نے فرمایا: **أَعْذِبُوا عَنْ ذِكْرِ النِّسَاءِ** [أَنْفُسَكُمْ] اپنے نفس کو عورتوں کے ذکر سے روکو کیونکہ ان کا ذکر تمہیں جہاد سے محروم کرے گا، ہر وہ جسے تو کسی چیز سے روکے تو اس کے لئے اعذبتہ استعمال کر سکتا ہے۔ ضرب المثل میں ہے: **لَأُلْجِمَنَّكَ لِجَامًا مُعْذِبًا**۔ (میں تمہیں ایسی لگام چڑھاؤں گا جو تجھے لوگوں پر چڑھنے سے روک لے گی)۔

کہا جاتا ہے: اعذب یعنی میں جاتا ہوں۔ اعذب غیرہ، غیر کو روکتا ہوں۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ عذاب کو عذاب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی عذاب دیئے جانے

والے کو روک دیتا ہے اور جسم کے مناسب سب خیر والی چیزوں کو اس سے روک لیتا ہے۔ اس کے مخالف چیزیں اس پر ڈالتا ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن تفسیر قرطبی)

منافقین کی شر انگیزیاں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ (٨) يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (٩) فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (١٠) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (١١) أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ (١٢) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ (١٣) وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (١٤) اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (١٥) أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (١٦) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ (١٧) صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (١٨) أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (١٩) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٢٠) البقرہ

جواب ترجمہ: اور بعضے لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اور نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو۔ اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بڑا روگ ہے سو اللہ نے ان کا

روگ بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو یہی لوگ فساد پھیلانے والے ہیں لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جیسے دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ خوب اچھی طرح سن لو کہ یہی لوگ بیوقوف ہیں لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے۔

اور جب یہ لوگ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اور جب تنہائیوں میں اپنے شیطانوں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مذاق بنانے والے ہیں۔ اللہ ان کا مذاق بناتا ہے اور ان کو ڈھیل دے رہا ہے وہ اپنی سرکشی میں اندھے ہو کر بھٹک رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی۔

سو ان کی تجارت نفع مند نہ ہوئی۔ اور نہ وہ ہدایت پر چلنے والے بنے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی پھر جب اس آگ نے اس شخص کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو ختم کر دیا۔ اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ رجوع نہ ہوں گے۔

یا ان کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان سے تیز بارش ہو رہی ہو اس میں اندھیریاں ہوں اور گرج ہو اور بجلی ہو یہ لوگ موت کے اندیشے کے سبب اپنے کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں کڑک کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ کئے ہوئے ہیں کافروں کو۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی کو اچک لے۔ جب کبھی ان کے لیے روشنی ہوئی تو اس میں چلنا شروع کر دیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے سننے اور دیکھنے کی قوتوں کو ختم فرما دے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ: سورۃ البقرہ کی ابتدائی چند آیات میں خالص مسلمانوں کا تذکرہ تھا، پھر اس کے بعد والی دو آیتوں میں پکے کافروں کا ذکر تھا، اب ایک تیسرے طبقے کا ذکر ہے، جن میں نفاق پایا جاتا ہے اور ان اہل نفاق کو منافق کہا جاتا ہے، نفاق کہتے ہیں بھلائی ظاہر کرنے اور برائی پوشیدہ رکھنے کو، نفاق کی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔

منافق کو اسلامی تعلیمات میں خطرناک سمجھا اور بتایا گیا ہے، اسی لیے منافقین کے بارے میں ایک مستقل سورت بھی نازل فرما کر ان کی بدباطنی کو عالم آشکار کیا گیا اور یہاں بھی پورے رکوع میں ان کی شر انگیزیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلْمُنَافِقُ يُخَالِفُ قَوْلُه فِعْلَهُ، وسِرّه عَلَانِيَتَهُ، وَمَدْخَلُهُ مَخْرَجَهُ، وَمَشْهَدُهُ مَغِيبه منافق کا قول اس کے فعل کے خلاف، اس کا باطن ظاہر کے خلاف اس کا آنا جانے کے خلاف اور اس کی موجودگی عدم موجودگی ہوا کرتی ہے۔

منافقین کے احوال مدنی سورتوں میں عالم آشکار کیے گئے ہیں اس لیے کہ نفاق مکہ مکرمہ میں تو تھا ہی نہیں بلکہ اس کے الٹ تھا یعنی بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی بہ ظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دل میں مسلمان ہوتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہاں پر اوس اور خزرج کے قبائل نے انصار بن کر آپ کا ساتھ دیا اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کر دی اور دونوں قبیلوں میں سے خوش نصیب لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن یہودی اب تک اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم تھے، ان میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سچے دین کو قبول کیا تب تک بھی منافقوں کا خبیث گروہ قائم نہ ہوا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان یہودیوں اور عرب کے بعض قبائل سے صلح کر لی تھی۔

غرض اس جماعت کے قیام کی ابتدا یوں ہوئی کہ مدینہ شریف کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے بنو قینُقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، بنو قینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے اور باقی دو قبیلوں

کا بھائی چارہ اوس سے تھا، جب جنگ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا، شوکت وشان اسلام ظاہر ہوئی، مسلمانوں کا سکہ جم گیا اور کفر کا زور ٹوٹ گیا تب یہ ناپاک گروہ قائم ہوا چنانچہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا تو خزرج کے قبیلے سے لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ ان دونوں قبیلوں کا رخ اسلام کی طرف پھر گیا اور اس کی سرداری یونہی رہ گئی۔

عبداللہ بن ابی کے دل میں یہ خار تو تھا ہی اسلام کی روز افزوں ترقی میں لڑائی اور کامیابی نے اسے مخبوط الحواس بنا دیا تھا، اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلے گا اس نے بظاہر اسلام قبول کر لینے اور باطن میں کافر رہنے کی ٹھانی اور جس قدر جماعت اس کے زیر اثر تھی سب کو یہی ہدایت کی، اس طرح منافقین کی ایک جمعیت مدینہ کے آس پاس قائم ہو گئی۔

ان منافقین میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آنے والوں میں سے کوئی شخص شامل نہیں تھا بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل وعیال، مال ومتاع کو نام حق پر قربان کر کے اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دے کر آئے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں میں سے تھے اور یہودی بھی جو ان کے طریقے پر تھے، قبیلہ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بہت سی بری خصلتوں کا یہاں بیان کیا ہے تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آجائیں اور انہیں مسلمان خیال کر کے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہاں منافقین کی اس بری خصلت کو بیان کیا گیا جس میں وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہتے تھے کہ ہم تو مسلمان ہیں، ہم تو مومن ہیں، ہم تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ہم تو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ یہ خلاف واقعہ بات تھی وہ نہ مسلمان تھے، نہ مومن تھے، نہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور نہ ہی آخرت پر ایمان رکھتے تھے، ایسا کہنے کا مقصد صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینا تھا، ورنہ ان کا دل ایمان وایقان کی دولت سے خالی تھا۔

اسی طرح یہ منافقین نبی کریم ﷺ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتے تھے مگر جب آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تو منہ کھول کر کہتے تھے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون کی ابتدا میں ہی ان کے اس فریب کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ وہ دل میں نبی کریم ﷺ کا بغض رکھتے ہیں، آپ ﷺ پر دل سے ایمان نہیں رکھتے مگر زبانی کلامی وہ یوں کہہ رہے ہیں، ان کی اس جھوٹی گواہی کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری گواہی یہ ہے کہ منافقین جھوٹ بول رہے ہیں، اسی طرح یہاں واضح فرمایا کہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ: اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے نفاق کا پردہ چاک فرمادیا ہے کہ یہ دھوکہ دہی کے لیے اپنے کو مومن ظاہر کرتے ہیں، یہ اپنے اس کام کی برائی کو جانتے ہی نہیں، یہ دھوکہ خود اپنی جانوں کو دے رہے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ النسآء:۱۴۲) یعنی منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ انہیں کو دھوکہ میں رکھنے والا ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو منافق دھوکہ کیسے دیں گے؟ وہ جو اپنے دل کے خلاف اظہار کرتے ہیں وہ تو صرف بچاؤ کے لیے ہوتا ہے تو جواباً کہا جائے گا کہ اس طرح کی بات کرنے والے کو بھی جو کسی خطرہ سے بچنا چاہتا ہے عربی زبان میں مخادع کہا جاتا ہے چونکہ منافق بھی قتل، قید اور دنیاوی عذابوں سے محفوظ رہنے کے لئے یہ چال چلتے تھے اور اپنے باطن کے خلاف اظہار کرتے تھے اس لئے انہیں دھوکہ باز کہا گیا، ان کا یہ فعل چاہے کسی کو دنیا میں دھوکا دے بھی دے لیکن درحقیقت وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں، کیونکہ وہ اسی میں اپنی بھلائی اور کامیابی جانتے ہیں اور دراصل یہ سب ان کے لئے انتہائی برا عذاب اور غضب الٰہی ہوگا جس کے سہنے کی ان میں طاقت نہیں ہوگی پس یہ دھوکہ حقیقتاً ان پر خود وبال ہوگا، وہ جس کام کے انجام کو اچھا جانتے ہیں وہ ان کے حق میں برا اور بہت برا ہوگا، ان کے کفر، شک اور تکذیب کی وجہ سے ان کا رب ان سے

ناراض ہو گا لیکن افسوس انہیں اس کا شعور ہی نہیں اور یہ اپنے اندھے پن میں ہی مست ہیں۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں مرض غم کے معنیٰ میں ہے، جیسے عربی محاورے میں کہا جاتا ہے کہ مرض قلبی من امر کذا کہ فلاں معاملہ کی وجہ سے میرا دل غم گین ہے، مطلب یہ کہ منافقین کے دل روز بروز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی وکامرانی اور غلبہ کو دیکھ کر پریشان ہوگئے اور یہ ان کی ریاست کے زوال میں مؤثر تھا جیسا کہ روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار عبد اللہ بن ابی بن سلول کے پاس سے گزرے تو وہ کہنے لگا کہ اپنے گدھے کو دور لے جاؤ اس کی بدبو نے ہمیں تنگ کر دیا ہے۔

ایک انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسے معذور سمجھیں ہم اس کے غلبہ سے پہلے ریاست حاصل کریں گے، جب ان پر اس کا غم زیادہ ہوا تو فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم شان اور غلبہ کے ذریعے ان کے غم میں مزید اضافہ کر دیا۔ (کبیر)

دوسرا مرض سے یہاں مراد کفر ہے کہ ان کا مرض کفر تکالیف کی وجہ سے زیادہ ہوتا گیا جیسا کہ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے فَزَادَتْهُمْ رِجْساً إِلَى رِجْسِهِمْ (التوبہ ۱۲۵) انہیں اور پلیدی پر پلیدی بڑھائی، حالانکہ سورت کا یہ عمل وثمر نہیں، کیونکہ سورت کے نزول پر اس کی مخالفت کی وجہ سے ان کی ناپاکی میں اضافہ ہوتا تو اس لیے فرمایا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے حوالہ سے سورۃ نوح میں ہے إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَاراً فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَاراً (النوح ۵،۶) میں نے اپنی قوم کو رات دن میں دعوت دی، میری دعوت نے ان کے فرار میں اضافہ ہی کیا حالانکہ دعوت وپیغام ایسا فعل نہیں، اسی طرح فرمایا وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلا تَفْتِنِّي (التوبہ ۴۹) اور ان میں کوئی تم سے یوں عرض کرتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے اور فتنہ میں نہ ڈالیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اسے اجازت نہ دیتے تو فتنہ میں نہ پڑتا۔

قرآن کریم جیسی روشن کتاب کے اترنے کی وجہ سے بھی منافقین کے پیٹوں میں مروڑ اٹھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَاناً وَ كُفْراً (المائدہ ۶۴) اے میرے حبیب! یہ جو کچھ آپ ﷺ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے اترا اس سے ان میں بہتوں کی شرارت اور کفر میں ترقی ہو گی، پھر سورت فاطر میں ارشاد ہے فَلَمَّا جاءَهُمْ نَذِيرٌ مَا زادَهُمْ إِلَّا نُفُوراً (فاطر ۴۲) پھر جب ان کے پاس ڈر سنانے والا آیا تو اس نے انہیں نہ بڑھایا مگر نفرت کرنا۔ جب تم کسی کو نصیحت کرو اور وہ نہ سنے اور فساد میں بڑھتا چلا جائے تو آپ کہتے ہیں کہ میری نصیحت نے اس کے شر میں ہی اضافہ کیا، میرے وعظ نے اس کے فساد میں اضافہ ہی کیا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح یہاں منافقین کا معاملہ ہے وہ کافر تھے جب انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دینی احکام کی طرف بلایا تو انہوں نے ان شرائع اور احکام کا انکار کیا، اس سبب سے ان کے کفر میں اضافہ ہوا تو اب ان کے اضافہ کفر کی نسبت یقیناً اللہ کی طرف ہی ہونی چاہیے تھی۔ (کبیر)

امام رازی رحمہ اللہ فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضًا کا ایک مفہوم یوں بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد اضافہ الطاف سے ممانعت ورکاوٹ ہے تو اس سبب سے وہ منع ان کے لیے ذلیل کن ہوا جیسے اللہ نے سورۃ المنافقون میں فرمایا کہ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ (المنافقون ۴) اللہ انہیں مارے کہاں اوندھے جاتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

یہاں مرض سے مراد نیت کا فتور ہے، اس لیے کہ ابتدا میں ان کے دل محاربت وبرائی کے لیے مضبوط تھے پھر ان کی شوکت ٹوٹ گئی تو خوف وکمزوری کی وجہ سے انہوں نے منافقت شروع کر دی جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کمزوری اور بزدلی میں اضافہ کر دیا جیسے سورۃ الحشر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ (الحشر ۳) اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا کہ وہ اپنے گھر ویران کرتے ہیں اپنے ہاتھوں اور

مسلمانوں کے ہاتھوں۔(کبیر)

مرض کا ایک معنٰی دل کی تکلیف ہے اس لیے کہ جب انسان حسد، نفاق اور مشاہدہ مکروہ میں دائمی مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سبب سے مزاج قلبی بدل کر تکلیف والم میں ہو جاتا ہے، اب مرض کا اس معنٰی پر محمول کرنا حقیقت ہی ہے اور یہ باقی وجوہات و معانی سے بہتر ہے۔(کبیر)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرض سے مراد وہ فساد ہے جو ان کے عقائد میں تھا یا تو یہ شک اور نفاق تھا یا انکار اور تکذیب تھی، معنی یہ ہے ان کے دل مریض ہیں کیونکہ وہ عصمت، توفیق، رعایت اور تائید سے خالی ہیں۔ ابن فارس لغوی نے کہا: مرض سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو صحت کی حد سے خارج کر دے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق ہو یا کسی امر میں کوتاہی ہو۔(تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا بعض علماء کے نزدیک یہ منافقین کے خلاف بد دعا ہے۔ اس کلام کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شک اور نفاق میں اضافہ فرمائے ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے اور ان کی مدد کی جگہ ضعف اور قدرت کی جگہ عجز میں اضافہ فرمائے۔(قرطبی)

اہل معانی نے کہا: فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ان کے دلوں میں مرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں سے پر سکون ہیں اور دنیا کی محبت ان کے دلوں میں ہے اور آخرت سے غافل ہیں اور آخرت سے اعراض کئے ہوئے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نفسوں کے سپرد کر دیا ہے، ان پر دنیا کے غموں کو جمع کر دیا ہے اس لئے وہ دین کے اہتمام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔(قرطبی) جنید رحمہ اللہ نے کہا: دلوں کی بیماریاں خواہش نفس کی پیروی کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اعضاء کی بیماریاں بدن کے مرض سے ہوتی ہیں۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ: جس طرح جسمانی امراض کا نتیجہ موت ہے اسی طرح روحانی امراض کا ثمرہ اس عالم میں عذاب الیم ہے۔ آسمانی پانی ہر درخت اور تخم کی بالیدگی کا باعث ہے مگر کسی درخت میں اسی پانی سے کانٹے اور کڑوے پھل آتے ہیں اور جس کا تخم اچھا ہوتا ہے اس سے

عمدہ اور خوشبودار پھول اور پھل نکلتے ہیں، اسی طرح قرآن جو تخم روح کے لیے آسمانی پانی ہے اس سے مومنوں کو شفا ہوتی ہے اور جن کی جبلت میں کجی ہے ان کو زیادہ مرض پیدا ہوتا ہے پھر وہ مرض اس عالم میں بصورت عذاب الیم ظاہر ہوتا ہے۔ (تفسیر حقانی)

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور منافقوں کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر مردود اور محروم ازلی ہے، اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے، کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل محرومی کی حالت اختیار کرلی ہے لہٰذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہوگا۔ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے، ان میں استعداد تو موجود تھی، مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود محرومی پیدا کرلی، جب سزا کی نوبت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہوگا اور دکھ پیدا ہوگا، کہ افسوس ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا لہٰذا ان کو مولم عذاب ہوگا، یعنی جس قدر احساس ہوگا، اسی قدر تکلیف ہوگی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں، وہ تو اول و آخر کافر ہی رہے، برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے، اس کا حکم اور ہوتا ہے، لہٰذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ بکثرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں، جہاں ایسے پھل نہیں ہوتے، تو انہیں احساس محرومی ہوتا ہے، اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے، بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ابدالی نے جب پانی پت کا معرکہ سر کیا تو دلی کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا۔ ایں جا انار قندھار کجا است، یعنی قندھاری انار یہاں کہاں

ہے؟ جو میں یہاں قیام کرلوں، وہ قندھاری انار کے ذائقہ سے واقف تھا، اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر اس ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔ (تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۰۲ پ ۱)

منافقین کا حال بھی یہی ہو گا، چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چکھا تھا، اس لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہو گا اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دکھ اور درد میں اضافہ ہو گا، اسی لیے اس کو عذاب الیم کہا۔ (تفسیر معالم العرفان)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ دعوائے ایمان میں جھوٹ بولتے تھے اور پھر طرفہ یہ کہ اس جھوٹ کو اپنا کمال سمجھتے ہیں، مردوں کی طرح اپنے عقیدہ کو کھول کر نہیں بیان کرتے، عورتوں کی طرح گرجتے ہیں اسی وجہ سے منافق کھلے کافر سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ کافر فقط کفر کرتا ہے مگر جھوٹ تو نہیں بولتا اور نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے بخلاف منافق کے کہ وہ کفر بھی کرتا ہے اور زبان سے جھوٹ بھی بولتا ہے کہ مسلمان ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتا ہے۔ (معارف القرآن) امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وہ اس زمانہ میں زندیق ہے (تفسیر ابن کثیر) یعنی زندیق وہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو اسلام کا کرے مگر دل میں کفر مضمر ہو۔ (معارف القرآن)

آیات مذکورہ میں منافقین کے عذاب الیم کی وجہ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ یعنی ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد ان کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے مگر عذاب الیم کا سبب ان کا جھوٹ بولنے کو قرار دیا اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا اسی بری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے، فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (۲۲:۳۰) یعنی بچو بت

پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے۔ (معارف القرآن)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ: منافقین اپنے اندرونی بیماری کی بناء پر شر انگیزی کو صلاح، صلاح کو شر انگیزی، بیماری کو صحت اور صحت کو بیماری سمجھنے لگے، انہیں جب ان کی شر انگیزیوں سے روکا جاتا ہے، انہیں منع کیا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو شر انگیزی نہیں کرتے، ہم تو فساد انگیزی نہیں کرتے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منافقین کئی طرح سے فساد پھیلاتے تھے، کبھی مسلمانوں کے راز فاش کرتے، کبھی کافروں کو مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ کرتے اور کبھی کافروں کے اعتراضات اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے سامنے نقل کرتے تاکہ وہ مذبذب اور متزلزل ہو جائیں ان سب کو حق تعالیٰ نے فساد سے تعبیر فرمایا ہے، علاوہ ازیں نفاق خواہ دین کا ہو یا دنیا کا خود ایک مستقل فساد ہے، دورویہ ہونے سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں، ایسا شخص ہمیشہ فساد پھیلاتا ہے اور کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا، مسلمان جب ان کو اس قسم کے فسادوں سے منع کرتے تو جواب میں یہ کہتے کہ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ۔ جزایں

نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ سب شیر وشکر ہو جائیں، آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے، نئے دین کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کے درپے قتل وغارت اور ایذاء اور ہتک حرمت ہو گیا ہے وہ سب یک لخت ختم ہو جائے اور ملک اور ملت پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلۂ معاش وتجارت حسب سابق جاری ہو جائے۔ (معارف القرآن للکاندھلویؒ)

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ: آگاہ ہو جاؤ کہ یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر وشرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پرداز پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا

چاہتے ہیں لیکن قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس اس درجہ مختل ہو گیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دین حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے، اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد و قتال کرنا عین اصلاح ہے، جہاد کو فساد بتانا یہی فتنہ اور فساد ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام پر صدق و اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ، جیسا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان لائے، بعض روایتوں میں، الناس سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ حق شناس یہود کے نام آئے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا، اس کے جواب میں منافقین نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بیوقوف کہا، گویا کہ یہ طنز ہے، اس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم پر جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، منافقین صحابہ رضی اللہ عنہم کو بیوقوف سمجھتے تھے، ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق و راستی کی خاطر تمام ملک سے دشمنی مول لے لی جائے، ان کے خیال میں عقلمندی یہ تھی کہ آدمی حق و باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ: یہ ان کی عقلمندی کے زعم باطل کا جواب ہے، چار تاکیدوں کے ساتھ منافقوں کی سفاہت اور حماقت پر زور دے کر بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس درجہ بیوقوف ہیں کہ اپنے نفع و نقصان میں بھی تمیز نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ایمان لاؤ، دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مثل ایمان لانے کا حکم دیا، تو اس سے ایک بات واضح اور عالم آشکار ہو گئی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق ہیں، یہاں بھی حکم دیا گیا کہ الناس (خاص لوگوں) کی طرح ایمان لاؤ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ایمان لانے کا حکم بتا رہا ہے کہ وہ لوگ کسوٹی اور معیار ایمان ہیں، ان کی طرح ایمان

لایا جائے تو قابل قبول ہو گا ورنہ عبث اور فضول ہے۔

منافقین کو فسادی کہا گیا مگر انہوں نے اپنے کو فسادی کی بجائے مصلح ظاہر کیا، جس پر اللہ نے انہیں فسادی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ انہیں شعور نہیں ہے، یہاں اہل ایمان کو بے وقوف کہنے پر اللہ نے جواباً انہی منافقین کو بے وقوف قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ جانتے نہیں (لَایَعلَمُونَ) ہیں، وہاں لَایَشعُرُونَ اور یہاں لَایَعلَمُونَ فرمانے کی وجہ ایک تو امام رازی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس سے آگاہی ہو جائے کہ مسلمان حق پہ اور وہ باطل پہ ہیں، یہ امر عقلی نظری ہے جب کہ نفاق اور اس کے ذریعے بغاوت جو زمین میں فساد کا ذریعہ ہے بدیہی وضروری اور محسوس کی طرح ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی جہالت کی بناء پر بے وقوف قرار دیا تھا، تو اس کے ساتھ علم کا ذکر کرنا نہایت ہی ضروری تھا۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ : منافقین کی دورخی پالیسیوں میں سے ایک یہ تھی کہ جب یہ بدباطن لوگ مسلمانوں کے پاس آتے تو آکر اپنی ایمان دوستی اور خیر خواہی ظاہر کر کے انہیں دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ مال و جان کا بچاؤ بھی ہو جائے، بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے اور جب اپنے ہم مشربوں میں ہوتے ہیں تو ان ہی کی سی کہنے لگتے ہیں۔

شیاطین سے مراد ان کے سردار ہیں جیسے یہود علماء اور سرداران کفار قریش و منافقین۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ شیاطین ان کے امیر امراء اور سرداران کفر تھے اور ان کے ہم عقیدہ لوگ بھی، شیاطین یہود بھی انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے اور قرآن کی تکذیب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں شیاطین سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو یا تو مشرک تھے یا منافق۔

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو برائیوں میں اور شرک میں ان کے سردار تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ہر بہکانے اور سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ جنوں

میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ: یعنی ظاہری موافقت جو ہم مسلمانوں سے کرتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم واقعہ میں ان کے موافق ہیں، ہم تو ان سے تمسخر کرتے ہیں اور ان کی بیوقوفی سب پر ظاہر کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہمارے افعال ہمارے اقوال کے مخالف ہیں مگر وہ اپنی بیوقوفی سے صرف ہماری زبانی باتوں پر ہم کو مسلمان سمجھ کر ہمارے مال اور اولاد پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور مال غنیمت میں ہم کو شریک کر لیتے ہیں اور اپنی اولاد سے ہمارا نکاح کر دیتے ہیں اور ہم ان کے راز کی باتیں اڑالاتے ہیں اور وہ اس پر بھی ہمارے فریب کو نہیں سمجھتے۔ (تفسیر عثمانی)

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ: اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے ان کے اس مکروہ فعل کے مقابلہ میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے ٹھٹھا کرے گا اور انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے دے گا جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے، يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ، [الْحَدِيدِ: ۱۳] قیامت کے روز منافق مرد و عورت ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ٹھہر جاؤ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں، کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور کی تلاش کرو، اس کے لوٹتے ہی درمیان میں ایک اونچی دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہو گا، اس طرف تو رحمت ہو گی اور دوسری طرف عذاب ہو گا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ [آلِ عِمْرَانَ: ۱۷۸] کافر ہماری ڈھیل کو اپنے حق میں بہتر نہ جانیں، اس تاخیر میں وہ اپنی بدکرداریوں میں اور بڑھ جاتے ہیں اور ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے، یہ آیات اور اس جیسی دوسری آیات قرآن کریم میں جہاں استہزاء، سخریت یعنی مذاق، مکر، خدیعت یعنی دھوکہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہی مراد ہے۔

ارباب تفسیر میں سے ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ صرف ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں ان کی بد کرداریوں اور کفر و شرک پر انہیں ملامت کی گئی ہے اور مفسرین کہتے ہیں یہ الفاظ صرف جواب میں لائے گئے ہیں جیسے کوئی بھلا آدمی کسی مکار کے فریب سے بچ کر اس پر غالب آکر کہتا ہے کہو میں نے کیسا فریب دیا حالانکہ اس کی طرف سے فریب نہیں ہوتا۔ (بن کثیر)

وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ: يَمُدُّهُمْ کا مطلب ڈھیل دینا اور بڑھانا بیان کیا گیا ہے۔ جیسے فرمایا اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ (المومنون ۵۵) یعنی کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے مال اور اولاد کی کثرت ان کے لئے باعث خیر ہے نہیں! نہیں! نہیں! صحیح شعور ہی نہیں اور سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (الاعراف: ۱۸۲) اس طرح ہم انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے، غرض کہ ادھر یہ گناہ کرتے ہیں ادھر دنیوی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں، جن پر یہ پھولے نہیں سماتے حالانکہ وہ حقیقت میں عذاب ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ قرآن پاک نے اور جگہ فرمایا فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۴۴) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۵) (الانعام) یعنی جب لوگوں نے نصیحت بھلادی ہم نے ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ وہ اپنی چیزوں پر اترانے لگے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا، اب گھبرا گئے، ظالموں کی بربادی ہوئی اور کہہ دیا گیا کہ تعریفیں رب العالمین کے لئے ہی ہیں۔ (تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ)

مفسر قرآن ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں ڈھیل دینے اور انہیں اپنی سرکشی اور بغاوت میں بڑھنے کے لئے ان کو مہلت دی جاتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الانعام ۱۱۰) طغیان کہتے ہیں کسی چیز میں گھس جانے کو، جیسے ارشاد ہے فرمایا اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ

حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (الحاقة:۱۱)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وہ اپنے کفر میں گرے جاتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ضلالت و کفر میں ڈوب گئے اور اس ناپاکی نے انہیں گھیر لیا اب یہ اسی دلدل میں اترتے جاتے ہیں، اسی ناپاکی میں پھنسے جاتے ہیں اور اس سے نجات کی تمام راہیں ان پر بند ہو جاتی ہیں۔ بھلا ایسی دلدل میں جو ہو اور پھر اندھا بہرا اور بیوقوف ہو وہ کیسے نجات پا سکتا ہے۔ آنکھوں کے اندھے پن کے لئے عربی میں "عمی" کا لفظ آتا ہے اور دل کے اندھاپے کے لئے "عمہ" کا لیکن کبھی دل کے اندھے پن کے لئے بھی "عمی" کا لفظ آتا ہے جیسے قرآن میں ہے وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج:۴۶)

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہدایت کو چھوڑ دیا اور گمراہی کو لے لیا، حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر قبول کیا۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت پر گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔

ان منافقین میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (المنافقون:۳) یہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے پس ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ایسے بھی منافق تھے جنہیں ایمان نصیب ہی نہ ہوا پس نہ تو انہیں اس سودے میں فائدہ ہوا، نہ راہ ملی، بلکہ ہدایت کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کے خارزار میں، جماعت کے مضبوط قلعہ سے نکل کر تنہائیوں کی تنگ جیل میں، امن کے وسیع میدان سے نکل کر خوف کی اندھیری کوٹھری میں اور سنت کے پاکیزہ گلشن سے نکل کر بدعت کے سنسان جنگل میں آ گئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي

ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ : منافقوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا اور دل میں ان کے ایمان نہ تھا ظاہری ایمان قبول کرنے سے جو کچھ انہیں دنیاوی فائدہ پہنچ گیا مثلاً جان و مال محفوظ کرلیا کہ مسلمان ان سے تعرض نہ کریں اس کو اولاً ایسے شخص سے تشبیہ دی جو اندھیری رات میں آگ جلائے اور اس روشنی سے راستہ دیکھنے کا فائدہ حاصل کرنا چاہے اور ان لوگوں کا جو انجام ہونے والا ہے کہ مرتے ہی سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے، اس کو اس آگ کے بجھانے سے تشبیہ دی جس کو انہوں نے روشنی کے لئے جلایا تھا۔

دنیا میں جھوٹے منہ سے ایمان ظاہر کر کے ذرا سا فائدہ اٹھالیا اور ہمیشہ کے لیے عذاب الیم میں گرفتار ہوئے، جیسے کوئی شخص اندھیری رات میں آگ جلائے اور روشنی ہو جائے تو وہ روشنی اللہ تعالیٰ شانہٗ ختم فرمادے اور یہ آگ جلانے والا اندھیروں میں حیران کھڑا رہ جائے نہ کچھ دیکھ سکے نہ بوجھ سکے۔

منافقوں نے اپنے طور پر بڑی ہوشیاری کی کہ ایمان ظاہر کر کے دنیا کا کچھ فائدہ اٹھالیا لیکن دل میں جو کفر گھسا ہوا ہے اس کی وجہ سے موت کے بعد جن مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے اس کو نہ سوچا اور کفر میں بڑھتے بڑھتے اس درجے پر پہنچ گئے کہ بہرے بھی ہیں حق سننے کے قابل نہ رہے اور گونگے بھی ہیں جن کے منہ سے کلمہ حق ادا نہیں ہو سکتا اور اندھے بھی ہیں جو راہ حق نہیں دیکھ سکتے، اپنا نفع نقصان جاننے اور سمجھنے سے غافل ہیں، ان کے بارے میں اب نہ سوچا جائے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں گے اور دل سے مسلمان ہوں گے۔ (تفسیر ابن کثیر بحوالہ تفسیر انوار البیان)

أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ: مفسر قرآن علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منافقین کو اصحاب صیب (بارش والوں) سے تشبیہ دی اور ان کے (ظاہری) ایمان کو جو کفر اور دھوکے بازی کے ساتھ ملا ہوا تھا ایسی بارش سے تشبیہ دی جس میں اندھریاں ہوں اور گرج ہو اور بجلی ہو، یہ تشبیہ اس

اعتبار سے ہے کہ بارش اگرچہ فی نفسہ نافع ہے لیکن جب مذکورہ صورت میں بارش نازل ہوئی تو اس کا نفع ضرر سے بدل گیا اور منافقین نے جو نفاق اس لیے اختیار کیا کہ مومنین کی طرف سے جو تکالیف پہنچنے والی ہوں اور کھلے کافروں کی طرف سے جو تکالیف پہنچتی ہوں ان سے بچاؤ ہو جائے ان کی اس منافقت کو کانوں میں انگلیاں دینے سے تشبیہ دی جیسے کوئی شخص بجلیوں کی کڑک سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رہا ہو اور موت سے ڈر رہا ہو تو جس طرح کانوں میں انگلیاں دینے سے اللہ تعالیٰ کے قضاو قدر کے فیصلے کو نہیں ٹالا جاسکتا اس طرح سے منافقت اختیار کرنے سے مصائب و آلام سے حفاظت نہیں ہو سکتی۔

صیب کے معنی مینہ اور بارش کے ہیں، بعض نے بادل کے معنی بھی بیان کئے ہیں لیکن زیادہ مشہور معنی بارش کے ہی ہیں جو اندھیرے میں برسے۔ ظلمات سے مراد شک، کفر و نفاق ہے اور رعد سے مراد یعنی گرج ہے جو اپنی خوفناک آواز سے دل دہلا دیتی ہے، یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہر وقت ڈر، خوف، گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے۔ جیسے کہ اور جگہ فرمایا يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (المنافقون :۴) یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی سمجھتے ہیں ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُوْنَ * لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ [التَّوْبَة: ۵۶، ۵۷] یہ منافقین اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، دراصل وہ ڈرپوک لوگ ہیں اگر وہ کوئی جائے پناہ یا راستہ پالیں تو یقیناً اس میں سمٹ کر گھس جائیں۔

اور شدت الامر کی وجہ سے جو ان کی حیرانی اور یہ پریشانی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اسے بجلی سے تشبیہ دی کہ کوئی موقع پاتے ہیں تو ذرا اپنے مقاصد میں آگے بڑھ جاتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ خوف لگا ہوا ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں نہ اچک لے۔ لہٰذا چند قدم چلتے ہیں پھر جب بجلی کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو بلا حس و حرکت کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ پھر دوسری طرح سے بھی اس تشبیہ کی تقریر کی

ہے ، بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلی مثال ان منافقوں کے بارے میں پیش فرمائی ہے جو بہت مضبوطی کے ساتھ کفر پر جمے ہوئے تھے، ان کے بارے میں فرمایا وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (بیضاوی بحوالہ انوار البیان)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: دوسری مثال ان منافقوں کے بارے میں ہے جن کو اسلام کے بارے میں تردد تھا کبھی اس کی حقانیت دل میں آتی تو اس کی طرف مائل ہونے لگتے اور جب دنیاوی اغراض سامنے آتیں اور دنیا کی محبت زور پکڑ لیتی تو وہ میلان ختم ہو جاتا تھا اور کفر ہی پر جمے رہ جاتے تھے۔ (انوار البیان)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دوسری مثال ہے جو دوسری قسم کے منافقوں کے لئے بیان کی گئی ہے، یہ وہ قوم ہے جن پر کبھی حق ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی پھر شک میں پڑ جاتے ہیں تو شک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے۔

بجلی کی مثال سے مراد وہ نور ایمان ہے جو ان کے دلوں میں کسی وقت چمک اٹھتا ہے، اس وقت وہ اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں لیکن ایسا کرنا انہیں کوئی نفع نہ دے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادے کے ماتحت ہیں، یہ بچ نہیں سکتے۔ جیسا کہ اور جگہ فرمایا هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ (۱۷) فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ (۱۸) البروج) یعنی کیا تمہیں فرعون و ثمود کے لشکر کی روایتیں نہیں پہنچیں؟ بے شک پہنچی تو ہیں لیکن یہ کافر پھر بھی جھٹلاتے ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ان کے پیچھے سے گھیر رہا ہے۔

بجلی کا آنکھوں کو اچک لینا، اس کی قوت اور سختی کا اظہار ہے اور منافقین کی بینائی کی کمزوری اور ضعف ایمان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے چھپے ہوئے عیب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انہیں

حیران کر دیں گی جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایمان ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک و شبہ آیا، دل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی اور بھونچکے ہو کر کھڑے رہ گئے۔

اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا لیکن جہاں اس کے خلاف نظر آیا یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج: ۱۱) یعنی بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر ٹھہر کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اگر بھلائی ملے تو مطمئن ہو جائیں اور اگر برائی پہنچے تو اسی وقت پھر گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین خصلتیں ایسی ہیں جس میں یہ تینوں ہوں وہ پختہ منافق ہے اور جس میں ایک ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک اسے نہ چھوڑے، بات کرنے میں جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں کبھی نفاق کا کچھ حصہ ہوتا ہے خواہ وہ نفاق عملی ہو خواہ اعتقادی جیسے کہ آیت و حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دل چار قسم کے ہیں ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو دوسرا وہ دل جو غلاف آلود ہیں، تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں، چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں پہلا دل مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے، دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں، تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے، چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان و نفاق دونوں جمع ہیں، ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہو اب جو

مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آجاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں برباد کر دے، مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے حق کو جان کر اسے چھوڑ دیا تو اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر چاہے تو عذاب و سزا دے چاہے تو معاف کر دے، یہاں قدرت کا بیان اس لئے کیا کہ پہلے منافقوں کو اپنے عذاب، اپنی جبروت سے ڈرایا اور کہہ دیا کہ وہ انہیں گھیر لینے پر قادر ہے اور ان کے کانوں کو بہرا کرنے اور آنکھوں کو اندھا کرنے پر قادر ہے، قدیر کے معنی قادر کے ہیں جیسے علیم کے معنی عالم کے ہیں۔

توحید والوہیت اور دلائل الوہیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲۱) الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا فرمایا اور ان لوگوں کو بھی پیدا فرمایا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت، اور اتارا آسمان سے پانی، پھر نکال دیا اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارے لیے رزق، لہٰذا مت بناؤ اللہ کے لیے مقابل، حالانکہ تم جانتے ہو۔

سورۃ البقرہ کے پہلے دو رکوع میں اہل ایمان، کافروں اور منافقوں کے احوال بیان کیے گئے، اہل ایمان کے احوال واعمال کا صلہ انہیں کامیابی کی صورت میں دینے کا اعلان کیا گیا، جب کہ کافروں کے اعمال واحوال کا صلہ انہیں عذاب عظیم کی صورت میں دینے کا اعلان کیا گیا، جب کہ منافقین کی دوغلی اور دورخی پالیسیوں کو عالم آشکار کیا گیا، ان کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا کچھ تذکرہ یہاں اور کچھ

دوسرے مقامات پر کیا گیا کہ یہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، یہاں اللہ تعالیٰ نے الناس کا لفظ ذکر فرما کر ان تینوں طبقات کو مخاطب فرمایا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ : اللہ تعالیٰ یہاں سارے انسانوں سے مخاطب ہیں، انہیں حکم دے رہے ہیں کہ اپنے پیدا کرنے والے کی بندگی بجالاؤ، جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا۔

ندائے قریب و بعید: عربی زبان میں بعید شخص اور دور والے کو ندا کرنے کے لیے " یا " کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور قریب والے اور نزدیک شخص کو ندا کرنے کے لیے " ای " کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات قریب شخص کو بعید کے قائم مقام کرکے اس کو بھی "یا" کے ساتھ ندا کی جاتی ہے، کبھی کسی کی عظمت کی وجہ سے اس کو بعید قرار دیتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اور کبھی اس اعتبار سے کہ واجب اور قدیم کے مقابلہ میں ممکنات اپنے حدوث اور امکان کی وجہ سے انتہائی پستی اور بعد میں ہیں جیسے قرآن مجید میں یا سماء، یا ارض، یا جبال، یا نار وغیرہ کی ندا ہے، اللہ تعالیٰ تمام لوگوں سے ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ فرمایا اس لیے کہ تمام لوگ اپنی غفلت یا اپنے امکان اور حدوث کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بعید ہیں۔ (تبیان القرآن)

لفظ اَلنَّاسُ عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں جن کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا اور خوف و عظمت کے پیش نظر نافرمانی سے دور رہنا (روح البیان)

اور لفظ رب کے معنیٰ پروردگار کے ہیں، پالنے والا، تربیت کرنے والا، آہستہ آہستہ کسی چیز کو پروان چڑھانے والا، معارف الفرقان کی جلد اول سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں شرح وبسط کے ساتھ رب کا مفہوم واضح کیا جا چکا ہے۔

یہاں پر لفظ رب کی جگہ لفظ اللہ یا اسماء حسنیٰ میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا مگر ان میں سے اس جگہ لفظ رب کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع و بصیر، عقل و ادراک والا ماہر انسان بنا دے اور اس کی بقاوارتقاء کے وسائل مہیا کرے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو اور اپنی بصیرت کو برباد کر چکا ہو جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے میں اسے ہرگز تامل نہیں ہو گا کہ یہ شان ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں اور انسان پر یہ مربّیانہ انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بت نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقاء میں اسی ذات واحد کے محتاج ہیں ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کر سکتا ہے ؟ اور اگر ظاہری طور پر کرے بھی تو وہ بھی درحقیقت اسی ذات کی تربیت ہو گی جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں (معارف القرآن)

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا معنی و مطلب جدا ہے مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو گناہ گار مسلمانوں کے لئے معنی یہ ہوئے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوئے کہ اپنی اطاعت وعبادت پر ہمیشہ قائم رہو اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان، معارف القرآن للمفتیؒ)

الَّذِی خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ: جو انسانی سراپا دکھائی دیتا ہے اس کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، اس سے پہلے جو لوگ پیدا کیے گئے وہ بھی اسی پروردگار کی قدرت کی کاریگری تھے، انسان کو وجود ملا، اس کے اندر قدرت کی بے شمار نعمتیں موجود ہیں، اس کا سراپا وجود ہی اللہ کی نعمت کا عظیم شاہکار

ہے، تین سو ساٹھ جوڑ اللہ کی قدرت کے واضح دلائل ہیں، پھر انسان جب نگاہیں دوڑاتا ہے تو اللہ کی بیش بہا قدرتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں اس میں رب کی وہ صفت بتلائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا پھر بطن مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل پاک وصاف انسان بنادینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں یہ سوائے اس ذات حق کے کس کا کام ہو سکتا جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ (معارف القرآن)

ختم نبوت کا ثبوت: اس آیت مبارکہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور گہرائی میں اتر کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ نبی کریم ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کی امت خاتم الامم ہے، جس عظمت والے نبی ﷺ پر یہ کتاب نازل ہوئی اور ان آیات کے جو لوگ اولین مخاطب ہیں ان سے کہا گیا کہ تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، حالانکہ اولین مخاطبین کے بعد جو لوگ قیامت تک آنے والے ہیں انہیں بھی اللہ ہی پیدا کرے گا، مگر اللہ نے تم سے پہلے کا ذکر کیا اور تم سے بعد والوں کا ذکر نہیں کیا، یہ باریک اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے بعد کوئی دوسری امت نہیں آئے گی، اس امت کے نبی آخر الانبیاء، خاتم الانبیاء ہیں تو یہ امت آخر الامم اور خاتم الامم ہے، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں بھیجا جائے گا اور نہ ہی آپ ﷺ کی امت کے بعد کوئی نئی امت ہو گی۔

الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا: جس زمین پر وہ قدم رکھتا ہے، جس زمین پر وہ چلتا ہے، جس زمین پر اس کے بیوی بچے چلتے پھرتے ہیں، جس زمین پر اس کے جانور چلتے اور چرتے ہیں، جس زمین پر اس کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہیں، جس زمین پر وہ گہری نیند پوری کرتا ہے اسے وجود دینے والا اکیلا اللہ ہی ہے، جس نے یہاں انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ زمین کو اس نے تمہارے لیے فرش بنایا ہے، بچھونا بنایا ہے، جس طرح تمہارے بستر تمہارے آرام کا ذریعہ ہیں اسی طرح یہ زمین تمہارے

لیے بچھونا ہے، اگر یہ نہ ہو تو تم اپنے بستر کہاں بچھا کر آرام کرو، اسی نے اس زمین کی حرکت کو روکنے کے لیے اس میں پہاڑوں کو میخیں بنا کر گاڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الذاریات میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس زمین کو بچھایا ہے ہم بہترین بچھانے والے ہیں، انسان دیکھے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو بستر بنایا ہے تاکہ حیوانات اس پر ٹھکانہ بنائیں، اس لیے کہ ٹھکانہ تو ایک ضروری چیز ہے، جو زمین پر رہائش پذیر ہیں ان کے لیے غذا کی ضرورت ہے تو تمام زمین ان کی غذا کے لیے نباتات کا محل بنا دیا گیا ہے، اہل زمین کو ایسی جائے سکونت کی ضرورت ہے جہاں وہ گرمی اور سردی میں سکون حاصل کریں، انہیں جائے دفن کی ضرورت ہے جہاں اذیت ناک چیزوں کی بدبو، مردار، متعفن اور بنی آدم اور ان کے علاوہ دوسری مخلوقات کے اجسام کو دفن کیا جاسکے جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ المرسلات میں ارشاد فرمایا کہ کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟

اللہ تعالیٰ نے زمین میں راستے بنائے تاکہ اللہ کی مخلوق اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ آ اور جاسکے، یہ تمام اصناف حیوانات، کھیتی باڑی اور نباتات کی نسل کے باقی رہنے کے لیے بچھائی گئی ہے، اس میں استقرار و ثبات بنایا، جیسا کہ سورۃ النازعات میں آگاہ فرمایا گیا کہ اس نے زمین سے ان کا پانی نکالا، ان کا چارہ اگایا، ان میں پہاڑ گاڑھے، یہ تمہارے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے ساز و سامان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے لیے ان کے مقصود کی تلاش والے سفر کو ممکن بنایا، ان کی راحت و آرام کے لیے بیٹھنا ممکن بنایا، ان کی پر سکون نیند و راحت کے لیے اسے ممکن بنایا، ان کے کام کاج کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ممکن بنایا، اگر یہ زمین بہت نرم ہوتی، حرکت کرتی تو یہ مخلوقات نباتات اور تمام تر کاریگریوں سے لطف اندوز نہ ہو سکتی اور نہ ہی زمین پر زندگی گزارنا ان کے لیے آسان ہوتا، نرمی کی صورت میں زمین ان کے نیچے سے پھسلتی۔

اس بات کا اندازہ اس وقت لگایا جاسکتا ہے جب زلزلوں کے جھٹکوں سے ہم لوگ ڈر جاتے ہیں اور کوئی کام بھی نہیں کر پاتے، یہ اگرچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرانے کے لیے ہوتے ہیں، لوگوں کو ظلم وزیادتی اور نافرمانی سے روکنے کے لیے ہوتے ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک خاص اندازے سے سرد خشک بنایا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس زمین کو پتھر کی مانند سخت بنادیتے تو اس پر کوئی ایسی جڑی بوٹی پیدا نہ ہوتی جو حیوانات کی زندگی کے لیے ضروری تھی، نہ ہی اس میں کھیتی اگنا ممکن تھی، اس قدر سخت زمین پر ہم مکانات بھی تعمیر نہیں کر سکتے تھے، زمین کو نرم بنایا تاکہ یہ کام اس کی پشت پر ہو سکیں، زمین کی پیدائش اور بنانے میں یہ حکمت بھی کار فرما تھی کہ اس کے شمالی حصہ کو بلند رکھا تاکہ جنوبی حصہ کی طرف پانی بہے، جو اسے سیراب کرے اور اسے تروتازگی بخشے، یہاں پر رہنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں اور بالآخر سمندر میں جا گرے۔ اگر زمین ایک طرف سے اونچی اور دوسری طرف سے نشیبی نہ ہوتی تو پھر پانی سطح زمین پر رک کر اس ساری کو سمندر بنادیتا، پھر اس صورت میں لوگ اپنا کام کاج نہیں کر سکتے تھے، گزرگاہیں اور راستے مسدود ہو جاتے تھے۔

ذرا دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں کس قدر معادن پیدا کیے اور اسے بھی دیکھیے کہ اس میں سے انواع واقسام کے مختلف جواہر نکلتے ہیں، ان کی منفعتوں اور ان کی رنگتوں کو دیکھیے، جیسے سونا، چاندی یاقوت، زمرد اور ان کے علاوہ دوسرے رنگ برنگے، صاف اور شفاف بہت سے پتھر اور ان کی دوسری اقسام جو انسانی کاموں کی درستگی اور خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہیں جیسے لوہا، تانبا، پیتل، سیسہ، گندھک، ہڑتال، سنگ مرمر، چونا، سیمنٹ وغیرہ ان تمام قدرتی شاہکاروں کو ہم اپنی ضروریات میں استعمال کرتے ہیں۔

پھر دیکھیے اگر زمین پہاڑ کی طرح سخت اور بلند ہوتی تو ہم اس سے فائدہ اور نفع نہیں اٹھا سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اسے مسطح اور ہموار، حسب ضرورت نرم، سرد اور خشک بنایا تاکہ ہم اس

سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھا سکیں، زمین کے پہاڑ کی طرح بلند و سخت ہونے میں کاشتکاری کے لیے اس کا استعمال مشکل تھا، کیونکہ کاشتکاری اسی زمین پر ہو سکتی ہے جو نرم اور ہموار ہو تا کہ ضرورت پر پانی کو پی سکے اور نرم ونازک پودے جب تناور درخت ہو کر زمین پر قائم ہوں تو درختوں کی جڑیں اور نرم ونازک رگیں زمین کی گہرائی میں چاروں طرف پھیل کر قائم رکھنے میں مدد گار ہوں اور اس کو سرسبز وشاداب کرنے میں زمین سے اپنی خوراک حاصل کر کے درخت کو سیر اب کر سکیں اور اس کو قائم رکھ سکیں۔

زمین کے نرم ہونے میں جہاں اور بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں آسانی سے جہاں ہم چاہتے ہیں کنویں کھود لیتے ہیں، اگر زمین پہاڑ کی طرح سخت ہوتی تو کنویں کھودنے میں بڑی دشواری ہوتی، اس طرح سے ہمارے سفر کرنے میں بھی بڑی دشواری ہوتی کیونکہ پتھروں میں راستوں کا بنانا بڑا سخت کام ہے اور راستوں کے موجود نہ ہونے سے اور ان کے متعین نہ ہونے سے ہمارے لیے سفر کرنا ناممکن ہو جاتا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا ہے، تم اس کے راستوں پر چلو، ایک مقام پر فرمایا کہ اس نے تمہارے لیے اس میں راستے بنائے کہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

زمین کے فوائد میں سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے مکانات کے بنانے میں اس کی مٹی کو بآسانی استعمال کر سکتے ہیں، اینٹیں بناتے ہیں، گارے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں اور برتن اور دوسری چیزیں تیار کرتے ہیں، جن مقامات پر زمین میں نمک، پھٹکری اور گندھک وغیرہ نکلتی ہے وہاں کی مٹی زیادہ نرم ہوتی ہے اور نرم زمین میں طرح طرح کی نباتات پیدا ہو سکتی ہے۔

سخت اور پہاڑی زمین میں یہ نہیں ہو سکتی اور زمین کے نرم ہونے سے بہت سے جانور اپنے رہنے کے ٹھکانے بناتے ہیں، حشرات الارض کے رہنے کے لیے سوراخ اور بل زمین ہی میں ہوتے ہیں اور یہ سب آسانی زمین کے نرم ہونے کی وجہ سے ہے، کانوں کا زمین کے اندر پیدا فرمانا اللہ تعالیٰ کی بڑی

حکمتوں میں سے ہے۔ (الحکمت للغزالی)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ: ، اللہ ہی کی بندگی بجالانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم لوگ متقی اور پرہیز گار بن جاؤ گے، جب انسان متقی اور پرہیز گار بن جاتا ہے تو وہ اپنے رب کا محبوب اور پسندیدہ بن جاتا ہے، وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے، اللہ کا دوست دنیا اور آخرت دونوں جہان میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ اس جملہ میں لفظ لَعَلَّ استعمال فرمایا ہے جو رجاء یعنی امید کے معنی میں آتا ہے اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کسی فعل کا وقوع یقینی نہ ہو حکم ایمان و توحید کے نتیجہ میں نجات اور جنت کا حصول وعدہ الٰہیہ کے مطابق یقینی ہے مگر اس یقینی شے کو امید و رجاء کے عنوان سے بیان کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں نجات و جنت کی قیمت نہیں بن سکتا بلکہ فضل خداوندی اس کا اصل سبب ہے ایمان و عمل کی توفیق ہونا اس فضل خداوندی کی علامت ہے علت نہیں۔ (معارف)

وَالسَّمَاءَ بِنَاءً: اللہ نے انسان کو عدم سے وجود بخشا، اسے بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا فرمایا، زمین کو اس کے لیے اگر بچھونا بنایا تو آسمان کو اس کے لیے چھت بنایا، سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے کہ ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا، سورۃ ق میں فرمایا کہ کیا یہ لوگ اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں دوڑاتے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا اور خوبصورتی عطا کی، اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے، اسی طرح سورۃ الطلاق میں ارشاد فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان بنائے۔

انسان جب اس کائنات پر غور و فکر کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ یہ کائنات ایک گھر کی طرح ہے، جس میں وہ تمام اشیاء رکھ دی گئی ہیں جو اس کی ضرورت ہیں، آسمان چھت کی طرح بلند ہے، زمین بچھونے کی مانند بچھائی گئی ہے، ستارے چراغوں کی طرح اس میں رکھ دیے گئے ہیں، جواہرات ذخیروں کی طرح اس میں محفوظ کیے گئے ہیں، غرضیکہ ہر چیز بڑے طریقے، سلیقے اور قرینے سے اس میں رکھ دی گئی ہے، جب کہ انسان اس کائنات میں مالک مکان کی طرح ہے، اس میں مالک مکان کی تمام ضروریات رکھی گئی ہیں، مختلف انواع و اقسام کی نباتات اس کے مقاصد پورے کرتی ہیں۔

حیوانات کی مختلف اقسام اس کے مصالح میں مصروف عمل ہیں، اللہ تعالیٰ نے آسمان کو پیدا فرمایا، آسمان کا رنگ اس قدر سخت بنایا جو نگاہوں کے موافق اور ان کی بصارت کے لیے باعث تقویت ہے، اگر آسمان میں شعاعیں اور تیز روشنیاں ہوتیں تو دیکھنے والے کی نگاہوں کے لیے نقصان دہ تھیں، کیونکہ سبزے اور نیلے رنگ کی طرف دیکھنا نگاہوں کے موافق ہے، انسانی نفوس آسمان کی وسعتوں اور کشادگیوں کی طرف دیکھنے میں نعمت اور راحت پاتے ہیں، خصوصاً جب ستارے غائب ہو جاتے ہیں اور چاند کی چاندنی بکھرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بادشاہ اپنی نشست گاہوں کو نقش و نگار سے مزین کرتے ہیں، کیونکہ اس کی طرف دیکھنے والے کو راحت اور انشراح قلب ہوتا ہے، لیکن جب دیکھنے والا ان کی طرف دیکھتا ہے اور بار بار دیکھتا ہے تو اکتا جاتا ہے اور ان کی طرف بار بار دیکھنے کی وجہ سے ان کی کشش اور جمال ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف آسمان کے قدرتی مناظر اور خوشنمائی اور اس کی وسعت اور ستاروں کی چمک دمک کو جتنا بھی دیکھا جائے طبیعت اس سے کبھی بھی نہیں گھبراتی بلکہ قدرت کی گوناگوں گلکاری اور اس کی صنعت کو دیکھ کر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے کمال و قدرت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور وہ دل کی گہرائی سے بے ساختہ پڑھنے لگتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا، اے ہمارے پروردگار! تو نے اسے بیکار و نکما پیدا نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ حکماء کہتے ہیں کہ جب تو رنجیدہ ہو تو آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صنعت میں اپنا دل بہلا کیونکہ یہ تیرے رنج و غم کو دور کرنے کے لیے کافی سامان ہے اور ستاروں کو دیکھ اور پھر ان کی برکتوں اور فائدوں پر نظر کر کہ دنیا والے کس طرح ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور سمندر کی تاریک اور اندھیری راتوں میں یہ ستارے مسافروں کی کیسی راہنمائی کرتے ہیں۔ بعض حکماء کہتے ہیں کہ ستاروں میں جانے کے لیے راستے بنے ہیں اور ایک سیارے کے باشندے دوسرے سیاروں کے باشندوں کے پاس آتے جاتے ہیں۔ (الحکمت فی مخلوقات اللہ للغزالی)

آسمان کی طرف دیکھنے کے فوائد: حضرت امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب الحکمت فی مخلوقات اللہ میں لکھتے ہیں کہ آسمان کی طرف دیکھنے کے دس فائدے ہیں۔ ① غم کا کم کرنا۔ ② وسوسوں کو کم کرنا۔ ③ وہم خوف کو دور کرنا۔ ④ اللہ کی یاد ⑤ دل میں اللہ کی عظمت کا پھیل جانا ⑥ ردی افکار کا جاتے رہنا۔ ⑦ سوداوی مرض کے لیے نافع ہے۔ ⑧ مشتاق کی تسلی۔ ⑨ محبین کا مونس ہونا۔ ⑩ دعا کرنے والوں کا قبلہ ہے۔

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً: اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا ہے، اس پانی میں بھی اس انسان کا بھلا اور فائدہ ہے، جسے رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کا عظیم شاہکار بنایا، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آسمان سے پانی اتارنے کا مطلب بادل نازل فرمانا ہے، اس وقت جبکہ لوگ اس کے پورے محتاج ہوں۔

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی، پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النمل میں فرمایا کہ ہم نے اس پانی کے ذریعے پر رونق باغ اگائے، تم ان درختوں کو نہیں اگا سکتے تھے۔ شیریں پانی دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان فرمایا ہے، روئے زمین پر رہنے والے حیوانات اور نباتات کی زندگی پانی کے ساتھ ہی ہے، اگر کوئی انسان پیاس کا ستایا ہوا ہو اور اسے پانی کی ضرورت پیش آئے اور اسے پانی نہ ملے تو وہ ہر ممکن طور پر خزانوں کے منہ کھول کر اس نعمت کا حاصل کرے، بندگان خدا اس نعمت سے غافل ہیں یہ بہت ہی تعجب والی بات ہے۔

اس نعمت کی قدر اس وقت انسان کو تڑپاتی ہے جب اس نعمت سے محرومی ہوتی ہے، پہاڑی علاقوں میں گرمی کے موسم میں اور ایسے موسم میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو جاتی ہے جس میں بارشیں نہیں ہوتیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود برف جب تک نہیں پگھلتی تب تک بہت سے علاقوں میں پانی کی بہت قلت ہوتی ہے، جس سے لوگ پریشان اور بے چین ہو جاتے ہیں، قدرت والا کسی نہ کسی شکل میں

ان کی ضرورت پوری تو کر ہی دیتا ہے مگر یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی بڑی حکمت یہ ہے اس نے اتنی ضروری چیز کو کیسی فراوانی اور افراط سے پیدا فرمایا کہ ہر انسان و حیوان ادنیٰ سی طلب کے بعد پانی حاصل کر سکے، اگر پانی دوسری اشیاء کی طرح ایک محدود مقدار میں ہوتا تو زندگی میں بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتیں بلکہ نظام عالم ہی منتشر ہو جاتا، پانی کی لطافت اور رقت پر نظر کیجیے کہ جوں ہی آسمان سے برس کر زمین پر آتا ہے درختوں کی جڑوں میں پہنچ کر ان کی غذا بن جاتا ہے اور سورج کی حرارت سے بخارات کی شکل میں اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنی لطافت ہی کی وجہ سے غذا کو معدے میں بآسانی لے جا کر ہضم میں مدد دیتا ہے ،پیاس کے وقت اس کے پینے میں کیسی لذت محسوس ہوتی ہے اور اس کو پی کر ہم تمام تھکان اور بے چینی کو بھول جاتے ہیں اور جسم میں ایک راحت کو محسوس کرنے لگتے ہیں

غسل کرنے میں ہم پانی استعمال کرتے ہیں، بدن کا تمام میل کچیل اس سے غسل کر کے دور کرتے ہیں، اپنے میلے کچیلے اور گندے کپڑے اسی سے دھو کر صاف کرتے ہیں، پانی مٹی میں آسانی سے مل جاتا ہے، جو ہمارے مکان بنانے میں کام آتی ہے اور ہر سوکھی اور خشک چیز کو ہم پانی کے ذریعہ نرم اور تر کر لیتے ہیں، طرح طرح کے مشروبات پانی ملا کر ہی تیار ہوتے ہیں، بڑی بڑی آگ لگنے پر ہم پانی کی مدد سے اس پر قابو پا لیتے ہیں اور پانی چھڑکتے ہی آگ کے بھڑکتے شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔

اسی طرح جب انسان انتہائی غصہ کی حالت میں ہوتا ہے تو پانی کے دو گھونٹ پی کر اس کا غصہ فرو ہو جاتا ہے اور آتش غضب سرد ہو جاتی ہے اور نزع کے عالم میں جب مسکرات کی تکلیف ہوتی ہے تو پانی پی کر اس میں کمی ہوتی ہے، ایک مزدور دن بھر کی سخت مشقت کر کے جب پانی سے غسل کرتا ہے اور ایک گلاس پانی پیتا ہے تو وہ تمام دن کی مشقت کو بھول جاتا ہے، ہمارے تمام کھانوں میں پانی کا استعمال ضروری ہے، اسی سے ہمارے کھانے تیار ہوتے ہیں، پینے کی وہ تمام چیزیں جو مرطوب ہیں مگر بغیر پانی کے تیار نہیں ہو سکتیں۔

اللہ کی اس بیش بہا نعمت کو دیکھیے کہ اس ذات نے کس افراط و فراوانی سے پانی پیدا فرمایا کہ آسانی سے ہم اسے حاصل کر لیتے ہیں اور اگر اتنی فراوانی سے اور آسانی سے یہ مہیا نہ ہو سکتا تو زندگی میں بڑی تنگی ہو جاتی اور ہمارا تمام عیش اور ساری راحت مکدر ہو جاتی۔ (الحکمت فی مخلوقات اللہ)

فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ : اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نیرنگیاں، بوقلمونیاں اور شاہکار ملاحظہ کرتے جایئے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے مختلف رنگتوں، مختلف ذائقوں اور مختلف خاصیتیں رکھنے والے پھل پیدا فرمائے، زمین سے طرح طرح کی چیزیں اگائیں تاکہ لوگ فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانور بھی۔

زمین و آسمان کی پیدائش اپنی جگہ قدرت کی کاریگری ہے، پھر آسمان کے نیچے اور زمین پر بسنے والی مخلوق کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پانی جیسی بیش قدر نعمت کا مہیا کرنا رب العالمین کا خاص فضل واحسان ہے، پھر پانی کے ذریعے زمین پر نباتات کا سلسلہ، اس کی سرسبزی و شادابی اور اس کی خوشنمائی کیسی عجیب معلوم ہوتی ہے، اس میں انسانوں اور دوسرے حیوانات کے لیے کس قدر فوائد و منافع اور اغراض پوشیدہ ہیں، پھر ان کی حفاظت کا سامان اس طرح کیا کہ بیج اور گٹھلی کو اس کی اصل قرار دیا اور اس کے اندر یہ ساری نباتات اس طرح سے محفوظ رکھ دی کہ انسانی عقل حیران ہے۔

زمین پر دکھائی جانے والی نباتات میں غلے بھی ہیں اور پھل پھول اور ترکاریاں، سبزیاں بھی ہیں جو انسانی کام آتی ہیں، گھاس اور چارہ بھی ہے جو جانوروں کی خوراک کا سامان ہے، اس میں جلانے اور عمارتوں کے کام آنے والی لکڑی بھی شامل ہے، اسی سے وہ لکڑی بھی حاصل ہوتی ہے جو جہاز اور کشتیوں کے بنانے میں کام آتی ہے اور کہاں تک اس کے فائدوں اور حکمتوں کا ذکر کیا جائے، اس نباتات کا ایک ایک حصہ پھل، پھول، شاخیں اور پتے یہاں تک کہ اس کی جڑیں تک کام میں لائی جاتی ہیں، بے شک اللہ نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی، اس نباتات سے عصاء سے لے کر جوشاندے، گوند اور طرح طرح کے عروق تیار کیے جاتے ہیں۔

اگر یہ پھل زمین پر ایک جگہ اکٹھے ہو جایا کریں اور اس طرح درختوں پر، شاخوں پر، بیلوں پر نہ آتے تو انسان کتنے بے شمار فائدوں سے محروم ہو جاتا اور زندگی کی کتنی ضروریات کی فراہمی میں رکاوٹ ہوتی نہ اس کو جلانے کے لیے ایندھن میسر آتا نہ عمارتوں کے لیے لکڑی دستیاب ہوتی نہ جانوروں کے لیے چارہ ملتا اور نہ دوا دارو وغیرہ ضرورتوں کے لیے دوسری چیزیں حاصل ہوتیں جو موجودہ شکل میں حاصل ہوتی ہیں۔

اس کی قدرت کو دیکھا جائے کہ ایک دانہ زمین میں ڈالیں تو سو دانہ حاصل کر لیں اور اس سے بھی زائد اس کی برکت ہے، حکمت ہے، اپنی ضرورتوں میں کام لیں، ضرورت سے بچ جائے تو آنے والے وقت کے لیے ذخیرہ کر لیں، اس کی مثال ایک بادشاہ کی سی ہے جو کسی مقام کو آباد کرنے کے ارادے سے وہاں کے باشندوں کو کچھ بیج بونے کے لیے دے دے اور یہ کہہ دے کہ ان کو بیجو اور اس سے جو کاشت ہو اس کو اپنی خوراک اور دوسری ضروریات میں خرچ کرو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر انعام فرمایا ہے اور زمین اور ملکوں کو بسا کر ان پر احسان عظیم کیا، یہ درخت اور نباتات بڑھتے ہیں اور پھل پھول لاتے ہیں پھر بوئے جاتے ہیں، یہ سلسلہ جاری وساری ہے اور یہی اس کی بقاء ودوام کا ضامن ہے، اگر اس طرح نہ ہوتا تو یہ نعمت بس ایک مرتبہ کے بعد تمام ہو جاتی اور جاری نہ رہ سکتی اس میں قدرت کی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

ان دانوں کی پیدائش اور اس کی صورت کو دیکھا جائے کہ کس خوبصورتی سے ایک قدرتی برتن میں ترتیب دے دیتے ہیں، گویا کہ دانوں سے قرینہ سے بھری ہوئی ایک تھیلی ہے جو اپنی زبان حال سے کاریگر کی قدرت کی شہادت دے رہی ہے، یہ دانوں سے بھری ہوئی تھیلی اپنے دانوں کو اس وقت تک محفوظ رکھتی ہے کہ وہ پختہ ہو کر استعمال کے قابل ہو جائیں، ٹھیک اس جھلی کی طرح جو بچہ کے مکمل ہونے تک پوری حفاظت کرتی ہے۔

یہ دانے ایک خاص قسم کے چھلکے میں بند ہوتے ہیں، جن کے سروں پر نیزوں کی طرح سے تیز

اور سخت چھلکے ہوتے ہیں گویا وہ پرندوں سے اپنے اندر کے خزانے کی حفاظت کر رہے ہیں، پس اللہ کی قدرت اور حکمت کو دیکھیں کہ اس نے نباتات کے اس تیار ذخیروں کو پرندوں کی دسترس سے کس طرح محفوظ کر دیا ہے، اگرچہ یہ غلہ پرندوں کی غذا ہے تاہم انسان کی ضرورت پہلے درجہ پر ہے۔

نباتات بھی انسان وحیوان کی طرح اپنے لیے غذا کے محتاج ہیں لیکن قدرت نے نباتات میں انتقال مکانی کی قوت نہیں بخشی جو اپنے لیے روزی تلاش کریں، اس لیے قدرت نے ان کی جڑوں کو زمین کی گہرائی میں مرکوز کر دیا ہے تاکہ وہ مٹی اور پانی ہر وقت حاصل کر سکیں اور اس طرح یہ جڑیں زمین سے تری حاصل کر کے شاخوں اور ٹہنیوں ، پھل ، پھول اور پتوں تک پہنچادیں گویا زمین ان کے لیے ایک پرورش کرنے والی مہربان ماں کی جگہ ہے اور ان کی جڑیں ان کے لیے منہ کے قائم مقام ہیں کہ گویا زمین سے رطوبت چوس کر اپنے سارے جسم کو قوت پہنچاتی ہیں، جس طرح ایک بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پی کر قوت حاصل کرتا ہے۔

آپ لوگ خیموں کو نصب ہوتے دیکھتے ہیں کہ ان کی طنابیں اور رسیاں جو چاروں طرف اس کو سادھے ہوئے رہتی ہیں کہ کسی ایک طرف کو جھکنے نہ پائے اور پورا خیمہ سیدھا اور درست رہے، اسی طرح نباتات کا حال ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں چاروں طرف اس طرح سے پھیلی ہوئی ہیں کہ اس کو گرنے اور کسی طرف جھکنے سے روکے رہیں اور ایسا نہ ہو تو بڑے بڑے اور اونچے درخت کس طرح سے اپنے کو قائم رکھ سکتے ہیں بالخصوص جب طوفانی ہوائیں چلتی ہوں یہ اس خالق کی بڑی حکمت ہے کہ اس نے اس طرح سے انتظام قائم کیا ہے اور پھر اس قدرتی نظام کو دیکھ کر انسان اپنے اعمال میں اس کی پیروی کرتا ہے اور اپنے بگڑے ہوئے کاموں کو بنالیتا ہے۔

کسی درخت کے ایک پتہ کو لے لیں اور اس پر غور وفکر کریں اس میں باریک اور موٹی نسیں دکھائی دیں گی کچھ لمبائی میں اور کچھ چوڑائی میں کچھی ہوئی ہیں اور ان نسوں کا کیسا جال ایک پتہ میں بچھا ہوا ہے انسان میں یہ طاقت کہاں کہ وہ اس طرح سے کام انجام دے سکے، ایک ہی پتہ کے نقش ونگار

میں طویل عرصہ کی ضرورت ہو گی پھر بھی نقل ہو گی جو اصل کے مطابق نہ ہو گی یہ قدرت کا کام ہے اس کے ایک اشارے پر کروڑوں پتوں پر، پھولوں پر گل کاریاں نظر آتی ہیں اور نہ کسی قلم کی ضرورت اور نہ کسی دوسرے آلہ کی ضرورت اور پھر اس کثرت کے ساتھ پہاڑ جنگل میدان کوئی جگہ باقی نہیں جہاں پھول پتوں پر یہ گل کاریاں نہ ہوں اور یہ خالی نقش و نگار محض حسن و جمال نہیں بلکہ پتہ کی پرورش میں بڑا کام انجام دیتے ہیں۔

ان رنگوں کے ذریعہ یہ پتے میں رطوبت اور مادہ کو پہنچانے میں مدد دیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کہ ایک انسان اور حیوان کے جسم میں رگوں اور نسوں کا ایک جال بچھا ہوتا ہے اور وہ ہر ہر عضو کو غذا پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ پتہ میں جو موٹی نسیں ہوتی ہیں وہ پتہ کو سادھے رہتی ہیں تاکہ وہ اپنے کو قائم رکھ سکے ورنہ نرم اور ہلکا ہونے کے باعث وہ اپنے کو قائم نہیں رکھ سکتا اور ہوا کے تیز جھونکے اس کو پاش پاش کر دیں گے۔

اب گھٹلی اور اس کی حکمت پر غور فرمایئے پھل کے درمیان اس کو محفوظ کیا ہے، اگر کسی آفت ارضی اور سماوی سے درخت ضائع ہو جائیں تو یہ گھٹلی ان کا قائم مقام ہو اور پھر سے درختوں کے لگانے اور پیدا کرنے کا سامان مہیا کر دے، یقیناً یہ اس نظریہ سے نہایت قیمتی اور قابل حفاظت چیز ہے کہ اس کے ذخیروں کو محفوظ کر لیا جائے یہ گھٹلی اگرچہ خود سخت جسم رکھتی ہے مگر نرم پھلوں میں بھی کسی طرح سے چسپاں اور ملی ہوئی ہوتی ہے اگر اس طرح نہ ہوتی تو پھر پھلوں کے پختہ ہونے سے قبل ہی اس میں خرابی پیدا ہو کر پھل کو بھی ضائع کر دیتی۔

بعض گھٹلیاں کھانے کے کام میں بھی آتی ہیں، ان سے تیل بھی کشید کیے جاتے ہیں اور کھانوں میں اور دیگر اشیاء کے استعمال میں لایا جاتا ہے گھٹلی کے اوپر کس طرح سے ایک ہلکا سا ورق چڑھا ہوتا ہے اور کس حکمت سے وہ اس میں محفوظ ہوتی ہے اور اس میں کیسی کیسی لذت اور فائدے مضمر ہیں یقیناً قدرت کی بڑی کاریگری کا پتہ چلتا ہے۔

اس گھٹلی میں جو خاصیتیں اور اثرات قدرت نے ودیعت فرمائے ہیں، جس طرح منی کے ناپاک قطرہ میں انسانی تخلیق کے راز کو پوشیدہ کر دیا ہے یہ سب راز اور حکمتوں کا جاننے والا وہی خدا ہے جس نے ان کو بنایا ہے۔

اس گھٹلی پر ایک سخت قسم کا غلاف چڑھا کر قدرت نے کتنی عظیم حکمت کا پتہ دیا کہ کہیں اگر گر جائے تو اس غلاف کی وجہ سے گھٹلی خراب نہیں ہوتی، اگر اس کو ذخیرہ کیا جائے تو بھی جلد فاسد نہیں ہوتی بلکہ اس غلاف کی وجہ سے کچھ دن محفوظ رہتی ہے، گویا وہ غلاف ایک صندوق یا بکس ہے جس کے اندر ایک قیمتی جوہر محفوظ ہے۔

ایک گھٹلی کو جب زمین میں رکھیں اور پانی دیں تو اس میں سے نسیں نکلتی ہیں، ٹہنی نکلتی ہے اور جوں جوں اس میں بالیدگی ہوتی ہے نیچے سے نسیں اور جڑیں زمین کے اندر مرکوز ہو جاتی ہیں، جس سے یہ درخت مضبوطی سے اپنے تنے پر قائم رہتا ہے اور انہیں جڑوں کے واسطے سے درخت اپنی غذا حاصل کرتا ہے، اس طرح سے زمین کے نیچے تری، رطوبت اوپر کی شاخوں، ٹہنیوں، پھلوں، پھولوں اور پتوں تک پہنچتی ہے اور نہایت انصاف سے یہ تقسیم ہوتی ہے گویا قدرت اپنی حکمت و انداز سے جس کو جس قدر پانی اور رطوبت درکار ہوتی ہے اتنا ہی اس کو پہنچاتی ہے اور پھر ہر ایک کو اس کے مناسب غذا پہنچتی ہے، اسی رطوبت سے پھولوں میں رنگ، خوشبو، پھلوں میں ذائقہ، لذت یہ سب کچھ قدرت کے نظام سے مکمل ہوتا ہے۔

پھلوں کے آنے سے پہلے قدرت پتوں کو پیدا کرتی ہے، نازک پھل اپنی حفاظت کے لیے ان پتوں کے محتاج ہیں تاکہ سخت ہواؤں کے جھونکوں اور سورج کی گرمی سے ان کی حفاظت ہو اور پھل ضائع نہ ہو جائے، سردی اور گرمی کی شدت کے اثر سے پھلوں کی حفاظت ان پتوں سے کی جاتی ہے اور پھر سردی گرمی، ہوا، دھوپ یہ سب چیزیں پتوں سے چھن چھن کر پھلوں تک پہنچتی ہیں اور پھلوں کے پختہ ہونے میں مدد دیتی ہیں، پھل کو اپنی پختگی کے لیے ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے اور یہی

چیزیں پھلوں کو سڑنے گلنے اور خراب ہونے سے روکتی ہیں۔

دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے درختوں، پھلوں اور پھولوں کو کس بہتر طریقہ سے مرتب کیا ہے ان کے مختلف رنگ اور گوناگوں شکل وصورت اور طرح طرح کے ذائقے اوران کی قسم قسم کی بھینی بھینی خوشبوئیں، پھر کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا اور کوئی درمیانی نہ زیادہ تیز اور نہ زیادہ ہلکا، اسی تناسب سے ان کے مختلف ذائقے کوئی میٹھا ہے کوئی ترش، کوئی شیریں کوئی تلخ، ان کی خوشبو بھی کیسی بھینی بھینی اور اچھی ہوتی ہے اور ہر پھول اور پھل کی خوشبو ایک دوسرے سے مختلف۔ (الحکمت فی مخلوقات اللہ)

پھر پروردگار عالم کے ان اسرار ورموز کو دیکھیے جو اس نے ان درختوں، پھلوں، پھولوں اور دیگر چیزوں میں رکھے ہیں، ان کے مشاہدے کے وقت دلوں کی میل دور ہوتی ہے، انہیں دیکھنے سے دلوں میں انشراح ومسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، ان کے حسن وجمال کو دیکھ کر دل خوش ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں مختلف التاثیر منافع رکھے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا، ان فوائد میں ایسے بھی ہیں جو دل کو مضبوط کرتے ہیں، ان میں کچھ وہ ہیں جو غذا بنتے ہیں، جن سے زندگی کی حفاظت ہوتی ہے، اللہ نے انہیں کھانے کی لذیذ چیزیں بنایا ہے۔

انسان ذرا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں غور وفکر کرے، جس میں فرمایا کہ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِلْآكِلِينَ [المؤمنون: ۲۰] اس پانی سے ہم نے زیتون کا درخت پیدا فرمایا جو طور سیناء میں بہت پایا جاتا ہے، جو اگتا ہے تیل لیے ہوئے اور کھانے والوں کے لیے سالن لیے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے پتھر اور پانی کے بیچ میں سے صاف اور نفع بخش زیتون نکالا، جس طرح گوبر اور خون کے بیچوں بیچ اللہ نے دودھ نکالا، کون سی ہستی ہے جس نے شہد کی مکھی کے پیٹ سے مختلف رنگتوں کا شہد نکالا، جس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے، اگر ان چیزوں کو کسی ٹھہرنے والی جگہ میں جمع کیا جائے تو نہروں کی طرح ہو جائیں اور یہ ساری چیزیں بندوں کے نفع کے لیے ہیں، اس میں ارباب فکر کے لیے

عبرت کا سامان ہے، سوچنے کا مقام ہے۔

زمین کی گہرائی سے جڑوں، نسوں اور شاخوں کے ذریعہ درخت کی اونچی اور بلند شاخوں تک پانی کا پہنچنا کیسا حیرت انگیز کرشمہ قدرت ہے، اس طرح غذا کے پہنچانے میں ایک تناسب یہ بھی ملحوظ ہے کہ بیج میں وہی جزو پہنچیں جو اس کے مناسب ہیں اور پھل میں وہ جو اس کے مناسب ہو، شاخوں، ٹہنیوں میں وہ جو اس کے وجود اور قیام کے مناسب ہو۔

کھجوروں پر نظر کیجیے، ابتدا میں وہ نہایت کمزور حالت میں ہوتی ہیں، کس عجیب حکمت سے ان کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہونے سے محفوظ ہیں، ان پر ایک غلاف کا پردہ چڑھا دیا کہ ان کی حفاظت ہو اور جب وہ پختہ اور کامل ہوں تو پھر وہ غلاف تدریجی طور پر پھٹ کر پھل ظاہر ہو جائے اور اس طرح کہ ہوا اور سورج کی گرمی، سردی برداشت ہو سکے، یہی نظام قدرت ہے اور عجیب حکمت تمام درختوں اور ان کے پھلوں، پھولوں میں کارفرما ہے۔

انار کے پھل پر غور کیجیے کس عجیب حکمت سے اس کے اندر دانوں کو ترتیب دیا، آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی پیشانی پر گودے کا ڈھیر لگا ہوا ہے، نیچے سے موٹا اور اوپر سے پتلا، دانوں کو الگ الگ خانوں میں کس طرح سجا دیا ہے، پھر ان پر ہلکے پھلکے پردے حفاظت کے لیے ہیں، ایک موٹے اور نرم گودے میں وہ دانے جڑے ہوئے ہیں، نیچے سے موٹا اور اوپر سے باریک غلاف میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ وہ ایک مقام پر مرتب رہ کر پرورش پا سکیں اور کسی ضرب پڑنے سے وہ بکھر کر خراب نہ ہوں، دیکھیے یہ سب کچھ بندوں کے نفع کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انتظامات کیے ہیں، اس میں غذا بھی ہے اور دوا بھی اور پھر ذخیرہ کے رکھنے کی صلاحیت و قابلیت بھی تاکہ بے موسم ضرورت پڑنے پر کام آ سکیں۔

جس زمانہ میں درخت پر پھل نہیں آتے گویا اس طرح ان کی حفاظت کا سامان کر دیا، انار کی اس شاخ کو دیکھیے جس میں انار لگا ہوتا ہے جب تک انار پختہ ہو کر کھانے کے قابل نہیں ہوتا اس وقت تک یہ شاخ انار کو روکے رہتی ہے۔

اس نباتات کو دیکھیے جو زمین کی سطح پر پھیلتی ہیں جیسے بیلیں ان کی شاخیں نرم اور کمزور ہوتی ہیں، ان کو ہر وقت تری کی ضرورت ہے وہ پھلوں کو اٹھانے کی متحمل نہیں ہوتی قدرت نے ان کو اس طرح بنایا ہے کہ یہ زمین پر ہی پھیلتی ہیں ورنہ پھلوں کے زمانہ میں بڑی مشکل ہوتی اور پھر یہ پھل ایسے موسم میں آتے ہیں جب طبیعت ان کی خواہش مند ہوتی ہے، اگر یہ ٹھنڈے پھل سردی کے زمانہ میں آتے تو ایک طرف طبیعت اس سے متنفر ہوتی اور ایسے وقت اس کے کھانے سے نقصان ہوتا۔

کھجور میں نر و مادہ پیدا کیے، اس لیے کہ جب یہ دونوں موجود نہ ہوں تو کھجور کا درخت پھل نہیں دیتا، یہ اللہ کی قدرت ہے کہ انسان و حیوان کی طرح سے اس درخت میں نر و مادہ کو ملحوظ رکھا تاکہ اس سے قدرت مزید آشکار ہو، ان نباتات میں جڑی بوٹیاں بھی شامل ہیں اور وہ کیسے کیسے عظیم منافع و فوائد اپنے اندر پوشیدہ کیے ہوئے ہیں۔

ان کے خواص و اثرات پر نظر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی قدرت معلوم ہوتی ہے، ظاہر میں وہ جنگل کی گھاس معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ انسانی امراض کے دور کرنے کے لیے بیش بہا دواؤں کا خزانہ ہے، اگر کوئی دوا بدن کے تمام فضلات کو نکالنے کے کام آتی ہے تو دوسری صفراء کے دور کرنے کے لیے، تیسری ریاح خارج کرنے کے لیے اور چوتھی طبیعت کے سکون اور ٹھہرانے کے لیے کوئی مسہل ہے تو کوئی قابض، کوئی قے لانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے تو کوئی تسکین طبیعت کے کام آتی ہے، دیکھیے قدرت نے کیسے کیسے راز پوشیدہ کیے ہیں اور یہ سب انسانی فائدے کے لیے ہیں۔ (حکمت)

فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ: جب پیدا کرنے والا اکیلا اللہ ہے، جب زمین اور آسمان کو وجود دینے والا اکیلا اللہ ہے، جب آسمان سے بارش برسانے والا، بارش سے پھل پھول، میوے اور غلے اگانے والا اکیلا اللہ ہے، انسان کو ان سے فائدہ پہنچانے والا اکیلا اللہ ہے، انسان کے جانوروں کو نفع دینے والا اکیلا اللہ ہے تو پھر اکیلا وہی اللہ ہے جو مستحق بندگی اور عبادت ہے، اس کے سوا کوئی بندگی اور عبادت کے لائق نہیں ہے، اس کا جگہ جگہ اس نے ذکر فرمایا کہ لا الہ الا اللہ، الہ وہی اکیلا ہے۔

معبود وہی اکیلا ہے، پرستش کے لائق وہی اکیلا ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، کیونکہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت اور بندگی کرنا شرک ہے اور شرک ایسی بیماری ہے جو کسی صورت میں معاف نہیں کی جاسکتی، اللہ نے واضح طور پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ شرک کے علاوہ جو گناہ ہوں گے وہ رب معاف فرمادے گا مگر شرک کو معاف نہیں کرے گا، شرک بہت بڑا گناہ ہے، شرک بہت بڑی گمراہی ہے، اسی لیے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔

شرک کی حساسیت کو جانتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ یارسول اللہ! سب سے بڑا کون سا گناہ ہے؟ اس کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا، وَهُوَ خَلَقَكَ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تمہارا خالق ہے کسی کو شریک ٹھہرانا۔ (بخاری و مسلم) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشاد فرمایا کہ أَتَدْرِي مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى عِبَادِهِ؟ أَنْ يَعْبُدُوهُ لَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں۔ (بخاری و مسلم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشاد ہے لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ فُلَانٌ، وَلَكِنْ لِيَقُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں کہے جو کچھ اللہ اکیلا چاہے، پھر اس کے بعد فلاں چاہے۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت طفیل بن سخبرہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہؓ کے سوتیلے بھائی فرماتے ہیں میں نے خواب میں چند یہودیوں کو دیکھا اور ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہودی ہیں، میں نے ان سے کہا کہ تم اچھے لوگ ہو اگر تم عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا نہ کہو تو، یہودیوں نے کہا کہ تم بھی اچھے لوگ ہو اگر تم یہ نہ کہو کہ جو اللہ چاہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں، پھر میں عیسائیوں کے ایک گروہ کے پاس سے گزرا تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی ہیں، میں نے ان سے کہا کہ تم اچھے لوگ ہو اگر تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا نہ کہو تو، انہوں نے کہا کہ تم بھی اچھے لوگ ہو اگر تم یہ نہ کہو کہ جو اللہ چاہے

اور جو حضرت محمد ﷺ چاہیں۔

جب صبح ہوئی تو میں نے اپنے اس خواب کا ذکر کچھ لوگوں سے کیا، پھر دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے بھی یہی خواب بیان کیا۔ آپ نے پوچھا کیا کسی اور سے بھی تم نے اس کا ذکر کیا ہے؟ میں نے کہا ہاں، حضور ﷺ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا طفیل نے ایک خواب دیکھا اور تم میں سے بعض کو بیان بھی کیا میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں لیکن فلاں فلاں کاموں کی وجہ سے میں اب تک نہ کہہ سکا۔ یاد رکھو، اب ہرگز ہرگز مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ، وَلٰكِنْ قُولُوا: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اللہ چاہے اور محمد چاہے کبھی نہ کہنا بلکہ یوں کہو کہ صرف اللہ تعالیٰ اکیلا جو چاہے (ابن مردویہ، ابن ماجہ، تفسیر ابن کثیر)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا ؟ قُلْ: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے یوں کہہ جو اللہ تعالیٰ اکیلا چاہے (ابن مردویہ) یہ اور اس طرح کے تمام کلمات لانے کا مقصد اللہ کی توحید والوہیت کی حفاظت کرنا ہے، شرک سے بچانا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ حکم دے رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کرنے والا ہے، اس میں تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی عبادت کرو یعنی اس کی توحید کے پابند ہو جاؤ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ شرک نہ کرو، فرمایا کہ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ عَلَى صَفَاةٍ سَوْدَاءَ فِي ظُلْمَةِ اللَّيْلِ شرک

اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف پتھر پر چل رہی ہو، بندہ یوں کہتا ہے کہ قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی زندگی کی، یہ بھی شرک ہے، انسان کا یہ کہنا کہ اگر یہ کتیانہ ہوتی تو چور رات کو ہمارے گھر میں گھس آتے یہ بھی شرک ہے۔ آدمی کا یہ قول کہ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چوری ہو جاتی یہ بھی شرک کا کلمہ ہے کسی کا اپنے ساتھی کو یہ کہنا کہ جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں یہ بھی شرک ہے، کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں نہ ہوتا، اللہ کے ساتھ فلاں کو لانا یہ سب کلمات شرک ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں انداد کے معنی بہت سے شریک اور بہت سے برابری کرنے والے کے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم دیکھتے اور جانتے ہو کہ تورات اور انجیل میں ہے کہ انداد کا معنیٰ شریک کے ہیں، تم جانتے ہو کہ اللہ اکیلا معبود ہے، اکیلا الٰہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ باتوں کا حکم: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو، قریب تھا کہ وہ اس میں غفلت کریں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پر خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو۔ لہٰذا یا تو آپ کہہ دیجئے یا میں پہنچا دوں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت لے گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ دیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں پس یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا، جب مسجد بھر گئی تو آپ اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر کے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ خود بھی عمل کریں تم سے بھی ان پر عمل کراؤں، ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے اور غلام کام کاج کرے لیکن جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے کسی اور کو دے دے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا

ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا، تمہیں روزی دینے والا، تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

② دوسری یہ کہ نماز کو ادا کرو اللہ تعالیٰ کی نگاہ بندے کی طرف ہوتی ہے، جب تک کہ وہ نماز میں ادھر ادھر منہ پھیرے جب تم نماز میں ہو تو خبردار اِدھر اُدھر توجہ نہ کرنا۔

③ تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہوئی ہو جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں، یاد رکھو روزے دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔

④ چوتھا حکم یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیئے گردن مارنے کے لئے لے جانے لگے تو وہ کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لو اور مجھے چھوڑ دو چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے کر اپنی جان چھڑا لی۔

⑤ پانچواں اس کا حکم یہ ہے کہ بہ کثرت اس کے نام کا ذکر کیا کرو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑتا آتا ہے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن وامان پا لیتا ہے اسی طرح بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت شیطان سے بچا ہوا ہوتا ہے یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا اب میں بھی تمہیں پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا حکم جناب باری نے مجھے دیا ہے۔

فرما کہ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا اللہ اور اس کے رسول اور مسلمان حاکم وقت کے احکام سننا اور جاننا ہجرت کرنا اور جہاد کرنا، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يُرَاجِعَ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر نکل جائے گویا وہ اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اتار پھینکے گا ہاں یہ اور بات ہے کہ رجوع کر لے، جو شخص جاہلیت کی

پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اگرچہ وہ روزے دار اور نمازی ہو فرمایا اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو، مسلمانوں کو ان کے ان ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکھے ہیں مسلمین مومنین اور عباد اللہ۔ (مسند احمد بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مسند حمد کی یہ روایت اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بھی یہی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہیں روزی دیتا ہے پس عبادت بھی اسی کی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ علامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت میں توحید باری تعالیٰ کا پورا خیال رکھنا چاہیے کسی اور کی عبادت نہ کرنی چاہیے ہر ایک عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر استدلالات

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے زمین اور آسمان کی مختلف شکل وصورت، مختلف رنگ، مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات، ان میں سے ہر ایک کا نفع بخش ہونا اور خاص حکمت کا حامل ہونا ان کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت، حکمت، زبردست سطوت اور سلطنت کا ثبوت ہے۔

وجود باری پر بدو کی دلیل: کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی موجودگی کی کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا یَا سُبْحَانَ اللّٰہِ، إِنَّ الْبَعْرَۃَ لَتَدُلُّ عَلَی الْبَعِیرِ، وَإِنَّ أَثَرَ الْأَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَی الْمَسِیرِ، فَسَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَأَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ وَبِحَارٌ ذَاتُ أَمْوَاجٍ؟ أَلَا یَدُلُّ ذٰلِكَ عَلَی وُجُودِ اللَّطِیفِ الْخَبِیرِ؟ سبحان اللہ! مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے، نشان ہائے قدم کسی گزرنے والے کا پتا دیتے ہیں، برجوں والا آسمان، راستوں والی زمین، متلاطم اور موجیں مارتے دریا کیا اللہ تعالیٰ کا پتا نہیں دیتے؟

وجود باری پر امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ہارون الرشید نے وجود باری

تعالیٰ پر دلیل مانگی تو انہوں نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا، آوازوں کا جداگانہ ہونا، نغموں کا الگ ہونا، یہ سب کچھ وجود باری تعالیٰ پر دلالت ہے۔

وجود باری پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے وجود باری تعالیٰ کے بارے میں کچھ زندیقوں نے پوچھا تو امام صاحب رحمہ اللہ نے انہیں جواب دیا کہ چھوڑو میں کسی اور سوچ میں ہوں، لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بہت بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں نہ کوئی اس کا نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے باوجود اس کے وہ برابر آجا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گزر جاتی ہے، ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے، چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے نہ اس کا کوئی ملاح ہے نہ منتظم، سوال کرنے والے زندیقوں، دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عقلمند ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی اتنے بڑے نظام کے ساتھ متلاطم سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان و زمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اور ان کا مالک حاکم خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکا بکا ہو گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے تو دہریوں (منکرین خدا) کی مسلح جماعت آپ پر حملہ آور ہونے لگی تاکہ انہیں شہید کر دیا جائے، آپ رحمہ اللہ نے فرمایا مجھے ایک مسئلہ کا جواب دو اس کے بعد تم جو چاہو کرو، کہنے لگے پوچھو، فرمایا تم اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہو جو کہے میں نے کشتی دیکھی جس پر لوگ سوار تھے، بوجھ سے مالا مال اور وہ سمندر کی موجوں میں ہے اور ہوائیں بھی مخالف چل رہی تھیں، لیکن وہ صحیح راستہ پر چل رہی تھی حالانکہ چلانے والا نہ ملاح ہے اور نہ ہی کوئی اور محافظ ہے، کیا عقل اسے ممکن مانتی ہے؟ کہنے لگے اسے عقل ہرگز قبول نہیں کرتی۔

فرمایا سبحان اللہ جب عقل ایسی کشتی کو نہیں مانتی کہ وہ سمندر میں بغیر محافظ و ملاح کے چلتی

ہو تو وہ اس ساری دنیا کا قیام باوجود یکہ اس کے حالات مختلف، اس کے اعمال میں تغیر، اس کی اطراف میں وسعت اور اس کے کناروں میں تخالف ہے عقل بغیر کسی صانع اور محافظ کے کیسے مان لے گی؟ اس پر تمام دہریے رونے لگے اور کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں، اپنی تلواریں نیام میں کر کے توبہ کرلی۔ (تفسیر کبیر) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے وجود باری پر یہ دلیل بھی دی کہ ایک باپ چاہتا ہے کہ اسے بیٹا ملے مگر بیٹے کی جگہ بیٹی ہو جاتی ہے، ایک باپ بیٹی چاہتا ہے مگر اس کا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ (کبیر)

وجود باری پر امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی وجود باری تعالیٰ پر سوال ہوا تو آپ رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ هَذَا وَرَقُ التُّوتِ طَعْمُهُ وَاحِدٌ تَأْكُلُهُ الدُّودُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْإِبْرَيْسِمُ، وَتَأْكُلُهُ النَّحْلُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْعَسَلُ، وَتَأْكُلُهُ الشَّاةُ وَالْبَعِيرُ وَالْأَنْعَامُ فَتُلْقِيهِ بَعْرًا وَرَوَثًا، وَتَأْكُلُهُ الظِّبَاءُ فَيَخْرُجُ مِنْهَا الْمِسْكُ وَهُوَ شَيْءٌ وَاحِدٌ

توت کے پتے ایک ہی ہیں، ایک ہی ذائقہ کے ہیں، کیڑے اور شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں ہرن وغیرہ سب اس کو چباتے کھاتے اور چرتے چگتے ہیں اسی کو کھا کر ریشم کا کیڑا ریشم تیار کرتا ہے، مکھی شہد بناتی ہے، ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں بکریاں مینگنیاں کرتی ہیں، کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اسی کو ہم اللہ تبارک و تعالیٰ مانتے ہیں وہی موجد اور صانع ہے۔ وجود باری تعالیٰ پر امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ دلیل سن کر سترہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔

وجود باری پر امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ سنو یہاں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں، نہ کوئی راستہ ہے بلکہ سوراخ تک نہیں باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے، اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف سے بالکل بند ہے ہوا تک اس میں نہیں جا سکتی۔

اچانک اس کی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک جاندار آنکھوں کانوں والا خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا چلتا پھرتا نکل آتا ہے، بتاؤ اس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں ؟ اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر اور اس کی قدرت غیر محدود ہے یا نہیں ؟ آپ کا مطلب یہ تھا کہ انڈے کو دیکھو چاروں طرف سے بند ہے پھر اس میں پروردگار خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے، یہی دلیل ہے اللہ کے وجود پر اور اس کی توحید پر۔

وجود باری پر امام جعفر صادق رحمہ اللہ کی دلیل: کسی زندیق نے حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے پاس اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیا، تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے ؟ وہ کہنے لگا کہ ہاں، آپ رحمہ اللہ نے پوچھا کہ کیا تو کبھی اس کے طوفان میں گرا ؟ اس نے کہا کہ ہاں، ایک دن ایسی مہلک ہوا چلی کہ اس نے کشتیاں توڑ دیں اور ملاحوں کو غرق کر دیا، میں کشتی کے تختہ کے ساتھ لٹک گیا پھر وہ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو میں سمندر کی اچھلتی کودتی موجوں میں چلا گیا، انہوں نے مجھے سمندر کے کنارے پر پھینک دیا، آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پہلے تیرا اعتماد اور بھروسہ کشتی و ملاح پر تھا، اس کے بعد تختہ پہ کہ وہ تجھے نجات دے گا۔

جب یہ تمام چیزیں ڈوب گئیں تو کیا اس کے بعد تو نے اپنے کو ہلاکت کے سپرد کر دیا یا سلامتی کا امیدوار رہا؟ اس نے کہا کہ میں سلامتی کا امیدوار تھا، آپ رحمہ اللہ نے پوچھا کہ تو نے کس سے امید وابستہ کی ؟ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گیا، تو امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا صانع، بنانے والی وہی ذات ہے، جس سے اس وقت تو نے امید باندھی تھی اور اسی نے غرق ہونے سے تجھے بچالیا، امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے یہ بات کہنا تھی کہ وہ شخص آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ (مفاتیح الغیب)

وجود باری پر ابو نواس رحمہ اللہ کے اشعار: حضرت ابو نواس رحمہ اللہ سے جب وجود باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بے ساختہ ان اشعار میں اس کا جواب دیا اور کہا

تَأَمَّلْ فِي نَبَاتِ الْأَرْضِ وَانْظُرْ ..... إِلَى آثَارِ مَا صَنَعَ الْمَلِيكُ

عُيُونٌ مِنْ لُجَيْنٍ شَاخِصَاتٌ ..... بِأَحْدَاقٍ هِيَ الذَّهَبُ السَّبِيكُ

عَلَى قُضُبِ الزَّبَرْجَدِ شَاهِدَاتٌ ..... بِأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ لَهُ شَرِيكُ

زمین کی پیداوار پر ذرا غور کرو، ان نشانات پر نگاہ ڈالو جو مالک کائنات نے پیدا کیے ہیں، آسمان سے بارش برسنا، اس سے درختوں کا پیدا ہونا اور ان ہری ہری شاخوں پر خوش ذائقہ میووں کا لگنا ہی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی کافی دلیل ہے۔

وجود باری پر ابن المعتز کے اشعار: ابن المعتز نے وجود باری تعالیٰ پر بہت ہی مختصر اشعار میں کہا کہ

فَيَا عَجَبًا كَيْفَ يُعْصَى الْإِلَهُ ..... أَمْ كَيْفَ يَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ ..... تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدُ

افسوس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی تکذیب پر لوگ کیسے دلیر ہو جاتے ہیں حالانکہ ہر چیز اس پروردگار کی موجود اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے۔

وجود باری پر اہل دانش کا فرمان: علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں وجود باری پر دلائل دیتے ہوئے اہل دانش کا یہ فرمان بھی نقل فرمایا کہ

مَنْ تَأَمَّلَ هَذِهِ السَّمَاوَاتِ فِي ارْتِفَاعِهَا وَاتِّسَاعِهَا وَمَا فِيهَا مِنَ الْكَوَاكِبِ الْكِبَارِ وَالصِّغَارِ الْمُنِيرَةِ مِنَ السَّيَّارَةِ وَمِنَ الثَّوَابِتِ، وَشَاهَدَهَا كَيْفَ تَدُورُ مَعَ الْفَلَكِ الْعَظِيمِ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ دُوَيْرَةٌ وَلَهَا فِي أَنْفُسِهَا سَيْرٌ يَخُصُّهَا، وَنَظَرَ إِلَى الْبِحَارِ الْمُلْتَفَّةِ لِلْأَرْضِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ، وَالْجِبَالِ الْمَوْضُوعَةِ فِي الْأَرْضِ لِتَقَرَّ وَيَسْكُنَ سَاكِنُوهَا مَعَ اخْتِلَافِ أَشْكَالِهَا وَأَلْوَانِهَا

کون ہے جو آسمانوں کی بلندی، آسمانوں کی وسعت، ان کے چھوٹے بڑے درخشاں اور روشن ستاروں پر غور کرے، ان کے چمکنے دمکنے، ان کے چلنے پھرنے، ان کے ٹھہرنے، ان کے ظاہر ہونے اور چھپ جانے پر غور کرے، روزانہ دن رات میں ان کی گردش پر غور کرے۔

کون ہے جو سمندروں کی اچھلتی کودتی موجیں دیکھے، کون ہے جو مضبوط پہاڑوں پر غور و حوض کرے جو زمین میں پیوست ہیں، جو زمین کو ہلنے نہیں دیتے، اس پر رہنے والوں کی شکلوں اور رنگتوں کے اختلاف کے باوجود انہیں تھامے ہوئے ہیں۔

قدرت کی بوقلمونی: قدرت کی نیرنگی اور بوقلمونی کا شاہکار ملاحظہ فرمایئے، سورۃ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے کیسی عجیب نقشہ کشی فرمائی ہے،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۲۷) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ (۲۸) (فاطر)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے رنگ برنگ کے پھل اگائے؟ اور پہاڑوں میں بھی ایسے ٹکڑے ہیں جو رنگ برنگ کے سفید اور سرخ ہیں اور کالے سیاہ بھی اور انسانوں میں اور چوپایوں میں اور جانوروں میں ایسے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔

بارش کو دیکھیے کہ وہ قدرت کا شاہکار ہے، اس کی قدرت کا اظہار ہے، نوع بنوع، طرح طرح کی مخلوقات پر نگاہ ڈالیے، لہلہاتے اور سرسبز و شاداب کھیتیوں پر نگاہ دوڑایئے، ان کے بیچوں بیچ رواں دواں نہروں کے حسن و جمال کو دیکھیے، کھیتوں میں پھل اور پھول، مزیدار میوہ جات کی روئیدگی دیکھیے، انہیں سینچنے اور سیراب کرنے والا پانی ایک ہی ہے، مگر ان ساری چیزوں کی رنگتیں اور ذائقے جدا جدا ہیں، ان کے فوائد اور منافع الگ ہیں، یہ ساری اشیاء انسان کو بتا رہی ہیں کہ واقعی انہیں وجود دینے والا، انہیں پیدا کرنے والا کوئی ہے، یہ ساری چیزیں بزبان حال ہمیں بتا رہی ہیں کہ ہمارا خالق اور پیدا کرنے والا کوئی ہے، یہ سب کچھ اس ذات عالی کی توحید، اس کی الوہیت اور اس کی ربوبیت کی واضح دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ نے بہت ہی مختصر الفاظ میں دریا بکوزہ کر دیا ہے، الفاظ مختصر ہیں مگر اس کی تفصیل اور تشریح عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

بارش آسمان سے یا بادلوں سے برستی ہے؟

سوال قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے قرآن کریم کے ایک قاری کو، ایک حافظ قرآن کو، ایک عالم دین کو یا ایک عام پڑھنے والے شخص کو ایسی بہت سی آیات جن کی تعداد اکیس کے قریب ہے ان میں دکھائی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف سے بارش اتارتے ہیں، جب کہ پانچ چھ مقامات ایسے بھی ہیں جن کی تلاوت کے دوران پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بادلوں سے بارش برساتے ہیں، آسمان کی طرف سے بارش کے لیے مَاءٌ (پانی) کا لفظ واضح دکھائی دیتا ہے، جب کہ بادلوں کے لیے کہیں سَحَابٌ (بادل) کہیں مُزنٌ (پانی بھرا ہوا سفید بادل) اور کہیں مُعصِرَاتٌ (وہ بادل جن کے برسنے کا وقت قریب آگیا ہو) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تو بارش اور بادل والی ان آیات کے درمیان تعارض دکھائی دیتا ہے، جب کہ اللہ علیم، خبیر، علام الغیوب ذات کی کلام میں اس طرح تعارض نہیں ہونا چاہیے، آپ اس تعارض کو کس طرح دیکھتے ہیں اور اسے کیسے دور کر سکتے ہیں؟ یا مفسرین کرام نے اس بارے میں کوئی وضاحت کی ہو تو بیان فرمائیں۔ ہم ذیل میں وہ آیات جن میں تصریح ہے کہ بارش آسمان کی طرف سے برستی ہے وہ اور وہ آیات جن میں صراحت ہے کہ بارش بادلوں سے برستی ہے دونوں قسم کی آیات الگ الگ یہاں نقل کر رہے ہیں، ان کا جواب مطلوب ہے۔

قرآن کریم کی وہ آیات جن میں ذکر ہے کہ بارش آسمان کی طرف سے برستی ہے۔

① وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (البقرہ ۲۲) اور اس نے آسمان سے پانی اتارا۔ ② وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (البقرہ ۱۶۴) اور اللہ نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعے زمین کی ویرانی کے بعد اسے آباد کیا۔ ③ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (الانعام ۹۹) وہ وہ ذات ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے ہر چیز کی پیداوار نکالی۔

④ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ

النَّاسُ وَ الْأَنْعَامُ (یونس ۲۴) دنیوی زندگی کی مثال تو کچھ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے زمین سے اگنے والی وہ چیزیں خوب گھنی ہو گئیں جو انسان اور مویشی کھاتے ہیں۔

⑤ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا (الرعد ۱۷) اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہنے لگے پھر بہتے ہوئے پانی نے اپنے اوپر جھاگ کو اٹھایا جو پانی پر بلند ہے۔

⑥ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ (ابراھیم ۳۲) اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے رزق نکالا۔

⑦ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ (الحجر ۲۲) اور وہ ہوائیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، ہم نے بھیجی ہیں، پھر آسمان سے پانی ہم نے اتارا ہے، پھر اس سے تمہیں سیر اب ہم نے کیا ہے اور تمہارے بس میں یہ نہیں ہے کہ تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھ سکو۔

⑧ وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (النحل ۶۵) اور اللہ نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعے زمین کو اس کی ویرانی کے بعد آباد کیا۔

⑨ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ (الکھف ۴۵) اور ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی یہ مثال بھی بیان کر دو کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، تو اس سے زمین کا سبزہ خوب گھنا ہو گیا، پھر وہ ایسا ریزہ ریزہ ہوا کہ اسے ہوائیں اڑا لے جاتی ہیں۔

⑩ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْ نَبَاتٍ شَتَّى (طٰہٰ ۵۳) اور اس نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ذریعہ مختلف قسم کے نباتات پیدا کئے۔ ⑪ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ

السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً (الحج ۶۳) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، جس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟

⑫ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ (المؤمنون ۱۸) اور ہم نے آسمان سے ٹھیک اندازے کے مطابق پانی اتارا، پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا۔ ⑬ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا (الفرقان ۴۸) اور ہم نے ہی آسمان سے پاکیزہ پانی اتارا ہے۔ ⑭ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (النمل ۶۰) اور تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا؟ پھر ہم نے اس پانی سے بارونق باغ اگائے۔

⑮ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا (العنکبوت ۶۳) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے زمین کے بے آباد ہونے کے بعد اسے آباد کیا؟

⑯ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الروم ۲۴) اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی لگتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور آسمان سے پانی برساتا ہے، جس کے ذریعے وہ زمین کو اس کے بے آباد ہو جانے کے بعد آباد کرتا ہے۔

⑰ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (لقمان ۱۰) اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس (زمین) میں ہر قابل قدر قسم کی نباتات اگائیں۔ ⑱ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا (فاطر ۲۷) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے رنگ برنگ کے پھل اگائے؟

⑲ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ (الزمر ۲۱) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اسے زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا۔

⑳ وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ (الزخرف ۱۱) اور جس نے آسمان سے ایک خاص اندازے سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے ایک مردہ علاقے کو نئی زندگی دے دی، اسی طرح تمہیں (قبروں سے) نکال کر نئی زندگی دی جائے گی۔ ㉑ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ (ق ۹) اور ہم نے آسمان سے برکتوں والا پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے باغات اور وہ اناج کے دانے اگائے جن کی کٹائی ہوتی ہے۔

بادلوں سے بارش کا برسنا: قرآن کریم کی وہ آیات جن میں بادلوں سے بارش برسنے کا ذکر ہے

① وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۷) (الاعراف) اور وہی (اللہ) ہے جو اپنی رحمت (یعنی بارش) کے آگے آگے ہوائیں بھیجتا ہے جو (بارش کی) خوشخبری دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ زمین کی طرف ہنکالے جاتے ہیں، پھر وہاں پانی برساتے ہیں، اور اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو بھی زندہ کرکے نکالیں گے۔ شاید (ان باتوں پر غور کرکے) تم سبق حاصل کرلو۔

② أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ (النور ۴۳) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ بادلوں کو ہنکاتا ہے، پھر ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے، پھر انہیں تہہ بر تہہ گھٹا میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش اس کے درمیان سے برس رہی ہے۔

③ اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ (الروم ۴۸) اللہ ہی وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، چنانچہ وہ بادل کو اٹھاتی ہیں، پھر وہ اس (بادل) کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے، اور اسے کئی تہوں (والی

گھٹا) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تب تم دیکھتے ہو کہ اس کے درمیان سے بارش برس رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے وہ بارش پہنچاتا ہے تو وہ اچانک خوشی منانے لگتے ہیں۔

④أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ (٦٨) أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ (٦٩)(الواقعه) اچھا یہ بتاؤ کہ یہ پانی جو تم پیتے ہو۔ کیا اسے بادلوں سے تم نے اتارا ہے، یا اتارنے والے ہم ہیں؟

⑤وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا (١٤) لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا (١٥) وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا (١٦) (النباء) اور ہم نے ہی بھرے ہوئے بادلوں سے موسلا دھار پانی برسایا تاکہ اس سے غلہ اور دوسری سبزیاں بھی اگائیں اور گھنے باغات بھی۔

جواب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان کتاب ہے، اس کا بیان اور اس طرز کلام بہت ہی اعجازی صفات کا حامل ہے، اس لیے اس میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو انسانی کلام کی طرح ہو، انسانی کلام میں غلطیوں کا سو فیصد امکان ہوتا ہے، سالوں، مہینوں اور دنوں کے بعد اور قرب کے لحاظ سے کلام انسانی میں تعارض پایا جا سکتا ہے بلکہ یقینی طور پر مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے، اس لیے کہ انسان کو اپنے ماضی اور اپنے لمحہ موجود کی ساری باتیں ازبر نہیں رہ سکتیں کہ اس نے جو بات آج سے دس سال پہلے کہی تھی وہ آج کے حالات کے تناظر میں اسی طرح ہو، لیکن کلام الٰہی جس عظیم ذات کا ہے اس کے لیے ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں میں علم کی کمی بیشی کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا، اس لیے اس کے کلام میں تعارض نہیں ہو سکتا۔

اہل علم نے ان مذکورہ آیات میں بظاہر دیکھے جانے والے تعارض کے تین جوابات دیے ہیں، علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر روح المعانی میں اور علامہ محمد انور گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب انوار الدرایہ میں تین جوابات دیے ہیں

① پہلی آیات میں سماء سے مراد سحاب ہے، ہر اس شے کو جو جہت علو میں ہوتی ہے سماء سے تعبیر کر دیا

جاتا ہے، جیسے مکان کی چھت وغیرہ، کہا جاتا ہے کُلُّ مَا عَلَاكَ فَهُوَ سَمَاءٌ ہر وہ شے جو تیرے اوپر ہے وہ آسمان ہے پس چونکہ سحاب بھی جہت علو میں ہوتا ہے اس لیے اس کو سماء سے تعبیر کر کے اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً کہہ دیا گیا ورنہ در حقیقت بارش بادلوں ہی سے ہوتی ہے اس لیے ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

② بارش تو بادلوں ہی سے ہوتی ہے مگر اس کا سبب تاثیرات سماویہ ہیں چنانچہ سورج جو کہ آسمان میں ہے اس کی شعاعیں سمندروں پر پڑتی ہیں جن کی حرارت سے پانی بخارات بن کر اٹھتا ہے پھر وہ بخارات ہوا کے طبقہ ثالثہ میں پہنچ کر جمع ہو جاتے ہیں اور جب زیادہ بوجھل ہو جاتے ہیں تو قطرات بن کر برسنے لگتے ہیں پس جب تک وہ بخارات جمع رہتے ہیں ان کو بادل کہا جاتا ہے اور جب برسنے لگتے ہیں تو بارش کہتے ہیں، تو چونکہ بادلوں سے بارش برسنے کا سبب آسمانی تاثیرات ہیں اس لیے مجازاً آسمان کی طرف نسبت کر دی گئی، پس پہلی آیات مجاز پر اور اخیر کی آیات حقیقت پر محمول ہیں، پس تعارض نہ رہا۔

③ بارش آسمان سے ہوتی ہے اور بادل درمیان میں واسطہ ہیں، اولاً پانی آسمان سے بادلوں پر نازل ہوتا ہے پھر بادل کے سوراخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر برستا ہے، حق تعالیٰ نے بادلوں کو بارش کے لیے چھلنی بنا دیا ہے لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں، اس توجیہ کی تائید حضرت کعب رحمہ اللہ کے ارشاد سے ہوتی ہے لَوْلَا السَّحَابُ حِيْنَ يَنْزِلُ الْمَطَرُ مِنَ السَّمَاءِ لَاَفْسَدَ مَا يَقَعُ عَلَيْهِ مِنَ الْاَرْضِ کہ جس وقت آسمان سے بارش برستی ہے اگر درمیان میں بادل نہ ہوتے تو پانی زمین کے جس مقام پر بھی گرتا ہے اس کو تباہ کر دیتا ہے یعنی آسمان سے پانی موٹی دھار بن کر نہایت تیزی کے ساتھ گرتا ہے مگر بادل اس کو روک لیتے ہیں، پھر وہ بادل کے سوراخوں سے چھن چھن کر ہلکی رفتار کے ساتھ قطرات بن کر اور باریک باریک دھار بن کر برستا ہے اگر بادل نہ ہوتے اور پانی کی موٹی دھار بن کر پوری تیزی کے ساتھ براہ راست زمینوں اور مکانوں وغیرہ پر گرتا تو سب چیزوں کو ہلاک و تباہ کر ڈالتا، یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے درمیان میں بادلوں کو واسطہ بنا دیا۔ (صاوی، انوار الدرایہ)

اعجاز قرآنی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۳) فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۲۴) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے محمد ﷺ پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاؤ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو۔ پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے جو قرآن پاک اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر اتارا ہے اسے اگر تم ہمارا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب مل کر پورا قرآن نہیں صرف ایک سورت تو اس جیسی بنا لاؤ، جب تم ایسا نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیوں شک کرتے ہو؟ اپنے ہم فکر اور مددگار سب کو جمع کرو تو بھی تم سب ناکام رہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے انہیں بھی بلالو اور ان سے بھی مدد چاہو پھر اس جیسی ایک سورت ہی تو بنا لاؤ۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم اپنے حاکموں اور اپنے زبان دان فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی مدد لے لو۔ قرآن پاک کے اس معجزے کا اظہار اور ایسا انداز خطاب کئی جگہ ہے سورۃ قصص میں ہے قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (القصص ۴۹) یعنی اگر تم سچے ہو تو ان دونوں سے (یعنی توریت و قرآن سے) زیادہ ہدایت والی کوئی اور اللہ کی کتاب لاؤ تو

میں بھی اس کی تابعداری کروں گا۔ سورۃ اسراء میں فرمایا قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (الاسراء ۸۸)
یعنی اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو کر اور ہر ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ یہ چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو بھی ان کے امکان میں نہیں سورۃ ہود میں فرمایا اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ھود: ۱۳) یعنی کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود اس پیغمبر نے گھڑ لیا تم کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم سب مل کر اور اللہ کے سوا جنہیں تم بلا سکتے ہو بلا کر اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤ۔

سورۃ یونس میں ہے وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۳۷) یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی طرف سے گھڑا ہوا نہیں بلکہ یہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور کتاب تفصیل ہے جس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں جو رب العالمین کی طرف سے ہے۔

کیا یہ لوگ اسے خود ساختہ کہتے ہیں ان سے کہو کہ اللہ کے سوا ہر شخص کو بلا کر اس قرآن کی سینکڑوں سورتوں میں سے ایک چھوٹی سی سورت جیسی سورت تو بنا لاؤ تاکہ تمہارا سچ ظاہر ہو۔ یہ تمام آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اہل مکہ کو اس کے مقابلہ میں عاجز ثابت کر کے پھر مدینہ شریف میں بھی اس مضمون کو دہرایا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر) قرآن کے مقابلہ سے ہمیشہ عاجز رہیں گے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ: اس آیت میں فرمایا ہے کہ تم ہرگز قرآن کے مقابلہ میں اس جیسی کوئی سورت بنا کر نہیں لا سکتے ہو اور کبھی بھی نہ لا سکو گے اس میں رہتی دنیا تک کے لیے قرآن کے دنیا میں باقی رہنے کی پیشین گوئی کے ساتھ یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ اس جیسا کوئی بھی جماعت یا کوئی فرد نہیں بنا سکتا۔

یہ دونوں پیشینگوئیاں صادق ہیں، سچی ہیں، سب کے سامنے ہیں چونکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت عام ہے تمام افراد انسانی جب تک بھی دنیا میں رہیں ان پر فرض ہے کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کا دین قبول کریں، چونکہ سارے انسانوں کے لیے، سارے زمانوں اور سارے مکانوں میں آپ کی دعوت ہے اور یہ دعوت قیامت آنے تک ہے اس لیے کسی ایسے معجزہ کی بھی ضرورت تھی جو ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے یہ معجزہ قرآن مجید ہے جو اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کے لیے تمام انسان اور جنات افراد اور جماعتیں عاجز ہیں اور عاجز رہیں گے۔ (تفسیر انوار البیان)

قرآن موجود ہے اس کی دعوت عام ہے اس کی حقانیت اور سچائی واضح ہے پھر بھی کفر میں اور شرک میں بے شمار قومیں کروڑوں افراد مبتلا ہیں قرآن سنتے ہیں اور اس کو حق جانتے ہیں لیکن مانتے نہیں، عناد، ضد اور تعصب قومی اور مذہبی نے ان کو دعوت قرآن کے ماننے سے اور اسلام قبول کرنے سے روک رکھا ہے، سب کچھ جانتے ہوئے پھر اسلام قبول نہ کرنا اپنے لیے عذاب آخرت مول لینا ہے۔

اسی لیے ارشاد فرمایا کہ اگر تم قرآن کے مقابلہ میں کوئی سورت نہیں لاسکتے اور ہرگز نہیں لاسکو گے تو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ یعنی قرآن لانے والے کی رسالت اور دعوت کے منکر ہو کر عذاب دائمی کے مستحق نہ بنو اور دیکھتے بھالتے دھکتی ہوئی آگ کا ایندھن نہ بنو، اس آگ کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر ہیں، انسان تو وہی ہیں جو اس کے منکر میں اور ایمان لانے کو تیار نہیں اور پتھروں کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ پتھر جن کی دنیا میں مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، دوزخ میں ہوں گے، سورۃ الانبیاء میں فرمایا: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ بیشک تم اور وہ جن کی تم عبادت کرتے ہو، دوزخ کا ایندھن ہوں گے، تم اس پر وارد ہونے والے ہو۔ (تفسیر انوار البیان مؤلفہ مفتی عاشق الٰہی مرحوم)

ایک سورت، مکمل قرآن کریم یا دس آیات لانے کا چیلنج؟

سوال اپنی عرب دانی، اپنی زبان دانی، اپنی فصاحت وبلاغت پر ناز وفخر کرنے والے عربوں نے جب قرآن کریم کے بارے میں موشگافیاں کیں تو انہیں قرآن کریم نے کئی بار چیلنج کیا، اس چیلنج کا قرآن کریم کے کئی مقامات پر ذکر ہے، سورۃ البقرہ میں یہاں فرمایا گیا کہ اگر تمہیں اس کتاب میں شک ہے تو تم لوگ اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ، سورت یونس میں چیلنج دیا گیا کہ اگر تم لوگ یہ کہتے ہو کہ نبی ﷺ نے یہ قرآن کریم خود ہی بنالیا ہے تو پھر تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ۔

سورت ھود میں چیلنج دیا گیا کہ اگر یہ لوگ کہتے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ قرآن کریم خود ہی بنالیا ہے تو پھر انہیں چاہیے کہ یہ لوگ اس جیسی دس سورتیں ہی لے کر آجائیں، سورت اسراء میں چیلنج دیا گیا کہ اگر جنات اور انسان سبھی جمع ہو جائیں اور اس قرآن کی طرح کوئی کتاب لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے، سورت طور میں چیلنج دیا گیا کہ اگر منکرین سچے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ اس قرآن کی طرح کوئی کتاب لے آئیں۔

سورت البقرہ، سورت یونس دو مقامات پر سورت لانے کا چیلنج ہے، سورت ہود میں دس آیات لانے کا چیلنج ہے، سورت اسراء میں قرآن کریم کے مثل لانے کا چیلنج ہے، سورت طور میں قرآن کریم کو حدیث فرما کر اس کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا، یا حدیث کے معنیٰ مطلق بات کہ قرآن جیسی کوئی ایک بات مثلاً چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ پیش کر دو، تو ان آیات میں تعارض دکھائی دیتا ہے، اس تعارض کو کیسے دور کیا جائے؟

جواب اس تعارض کے اہل علم نے دو جوابات دیے ہیں ① حق تعالیٰ شانہ نے اولاً تو پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا چیلنج کیا جب لوگ اس سے عاجز رہ گئے اور مثل پیش نہ کر سکے تو فرمایا اچھا اگر تم پورے قرآن کا مثل پیش نہیں کر سکتے تو قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر دکھا دو پھر جب لوگ اس سے

بھی عاجز رہے تو قرآن کی شانِ اعجاز کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے فرمایا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ کہ اگر دس سورتیں نہیں بنا سکتے تو کم از کم ایک سورت کا مثل پیش کر کے دکھادو۔

اور سورت کو معرف باللام لانے کے بجائے نکرہ لا کر اس طرف اشارہ کیا کہ قرآن کی کسی بھی سورت کا یعنی چھوٹی سورت کا مثل پیش کر کے دکھادو مگر تم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں بنا سکتے اور اگر فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ میں حدیث سے مراد مطلق ایک آیت یا ایک جملہ ہو تو شان اعجاز قرآنی کی مزید در مزید توضیح کرتے ہوئے چیلنج ہو گا کہ اگر ایک چھوٹی سی سورت پیش نہیں کر سکتے تو چلو اچھا کم از کم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ ہی بنا کر دکھادو مگر تم سے ایک چھوٹی سی آیت بھی نہیں بن سکتی، پس جان لو کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے بلکہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے۔ (انوار الدرایہ)

② دوسرا جواب یہ ہے کہ اختلاف زمان ہی پر محمول ہے مگر صورت اول کے برعکس ہے چنانچہ ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولاً ایک سورت پیش کرنے کا چیلنج فرمایا پھر دس سورتیں پیش کرنے کا، امام مبرد رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سورۃ یونس جس طرح تلاوت میں سورت ہود پر مقدم ہے اسی طرح نزول کے اعتبار سے بھی مقدم ہے۔

علامہ ابن الضریس رحمہ اللہ نے بھی فضائل القرآن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی نقل کیا ہے مگر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ایک سورت کے چیلنج کے بعد دس سورتوں کا چیلنج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ فِي الْبَلَاغَةِ وَالْاِشْتِمَال عَلَى مَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ مِنَ الْاَخْبَارِ عَنِ الْمَغِيْبَاتِ وَالْاَحْكَامِ وَاَخَوَاتِهَا ہے اور فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ کا مطلب بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ فِي النَّظْمِ فقط ہے یعنی اولاً تو یہ کہا گیا کہ ایک ایسی سورت بنادو جو الفاظ و معانی فصاحت و بلاغت میں قرآن کے مثل ہو نیز جس طرح قرآن غیب کی خبروں، احکام، مواعظ، وعدہ و وعید وغیرہ پر مشتمل

ہے اسی طرح تمہاری بنائی ہوئی سورت بھی ان مذکورہ امور پر مشتمل ہونی چاہیے مگر جب لوگ ان شرائط کے ساتھ سورت پیش کرنے سے عاجز رہ گئے تو فرمایا اچھا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ایسی پیش کر دو جو صرف الفاظ میں قرآن کے مثل ہوں اگرچہ ان میں وہ تمام امور مذکورہ نہ ہوں جن پر قرآن مشتمل ہے مگر تم ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ (روح المعانیؒ)

اعجاز القرآن سے کیا مراد ہے؟

سوال اعجاز القرآن الکریم سے کیا مراد ہے؟

جواب اعجاز کا معنیٰ ہے معجز نما، انتہائی فصاحت وبلاغت، اسی لفظ سے معجزہ ہے، جس کا مطلب وہ مافوق العادت چیز جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کی نبوت ورسالت کے ثبوت کے لیے نبی سے ظاہر کروائی جائے اور غیر نبی اس پر قادر نہ ہو، اس کا ایک معنیٰ ہے عجیب وغریب چیز۔

علم اعجاز القرآن کی اہمیت

اعجاز القرآن ایک جلیل القدر علم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی شکل میں جو عظیم الشان معجزہ عطا فرمایا یہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، یہ نبی کی روانگی کے ساتھ ختم ہونے والا معجزہ نہیں ہے، جس طرح سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا کیے جانے والے معجزات انبیاء کرام علیہم السلام کی دنیا سے روانگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے، یہ ایسا وقتی یا عارضی معجزہ نہیں ہے بلکہ دائمی اور لازوال معجزہ ہے۔

جب قرآن کریم دائمی معجزہ ہے تو پھر اس اعجاز کی معرفت ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح فرمایا کہ ہم نے یہ کتاب آپ ﷺ پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو اس قرآن کریم کے ذریعے اندھیروں سے نکال کر اُجالوں کی طرف لائیں، عزیز الحمید کے سیدھے راستے کی طرف لائیں۔ (ابراہیم ۱) اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجیے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے امن کی جگہ

پہنچا دیجیے۔ (آیت ۶) اگر قرآن کریم کا سننا مشرکین کے لیے حجت نہ ہوتا تو انہیں سنانے کی ضرورت نہیں تھی، ان پر حجت قائم کرنا یہ قرآن کریم کا معجزہ ہی ہے، پھر ان کی طرف سے یہ کہا جانا کہ آپ ﷺ پر کیوں آیات ان کے رب کی طرف سے نہیں اتاری گئیں، درست نہیں ہے، اللہ فرماتے ہیں، فرما دیجیے کہ آیات اللہ ہی کی طرف سے ہیں، میں تو تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں، کیا ان لوگوں کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔ (العنکبوت ۵۰، ۵۱) یہاں کتاب کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، یہ دلالت کے طور پر کافی ہے، یہ معجزات کے قائم مقام ہے۔

معجزات دلائل نبوت ہوتے ہیں، اس لیے حق تعالیٰ اپنے تمام پیغمبروں علیہم السلام کو معجزات قاہرہ دے کر مبعوث فرماتا ہے، تاکہ قدرتِ خداوندی کی یہ نشانیاں دیکھ کر لوگوں کی گردنیں انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے لیے خم ہو جائیں، انبیاءِ بنی اسرائیل کو معجزات بالعموم وہ دیے گئے جو محسوس اور مشاہد تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ عصا، ید بیضا، سمندر میں عصا مارنے سے بارہ راستے پیدا ہو جانا اور پتھروں سے بارہ چشموں کا نکل پڑنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادرزاد نابیناؤں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دینا، مردوں کا زندہ کرنا، پرندوں کی صورت بنا کر انہیں اڑا دینا اور یہ بتا دینا کہ لوگوں کے گھروں میں کیا ذخیرہ ہے اور وہ کل کیا کھائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے دہکتی ہوئی آگ کا برد و سلام ہو جانا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہے کا نرم موم کی طرح بن جانا۔

یہ سب معجزات حسیّہ بنی اسرائیل کو دیے گئے کیونکہ ان قوموں میں بلادت وحماقت غالب تھی، فہم ودانائی اور بصیرت کا اکثر میں نام ونشان نہ تھا، اس لیے ایسے معجزات دیے گئے کہ آنکھوں سے نظر آسکیں اور بلید سے بلید آدمی کو بھی گنجائش وتردد نہ رہے، اس کے برعکس امت محمدیہ کے لیے معجزات عقلیہ دیے گئے جن کا تعلق فہم وبصیرت اور عقل سے تھا کیونکہ اہل عرب جو وحی کے اولین مخاطب تھے، وہ عقل ودانائی اور فکر وتدبر میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے، اس لیے ان کو

معنوی اور روحانی معجزے دکھائے گئے اور جو ان میں سابقین کی طرح کند ذہن واحمق اور کوڑھ مغز تھے ان کی خاطر حسی معجزات بھی معنوی معجزات کے ساتھ جمع کر دیے گئے۔ (منازل العرفان،)

نبی کریم ﷺ یہ عظیم الشان کتاب ان لوگوں کی طرف لے کر تشریف لائے جو بہت زیادہ فصیح وبلیغ تھے، بڑے قادرالکلام خطباء تھے، زبان وکلام پر ید طولیٰ اور دسترس رکھنے والے لوگوں کو آپ ﷺ سے چیلنج کروایا گیا کہ اس جیسی کوئی چیز لے کر آؤ، دوسال تک انہیں اس پر مہلت بھی دی گئی، مگر وہ لوگ ایسی چیز لانے پر قادر نہ ہوسکے۔

آقائے دوجہاں ﷺ نے عرب کے ان قادرالکلام، فصیح وبلیغ لوگوں کو قرآن کریم کے ذریعے چیلنج کیا یہ آپ ﷺ نے اس وقت کیا جب ان لوگوں کی زبانیں کھلیں کہ سنایا جانے والا یہ کلام تو انہوں نے خود تراشا اور بنایا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ اگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اسے تراشا وبنایا ہے تو انہیں فرمادیجیے کہ اس کی مثل دس سورتیں لے کر آؤ، جب یہ لوگ دس سورتیں لانے سے عاجز ہوئے تو قرآن کریم نے انہیں کہا کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ تم لوگ اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ، پھر اس چیلنج کو دہرایا جاتا رہا۔

پھر فرمایا کہ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ اگر تم اس چیز میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو تم اس جیسی ایک سورت ہی لے کر آؤ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جیسا کلام لے کر آؤ، عربوں میں بڑے بڑے قادرالکلام، زبان دان، مسجع ومقفیٰ عبارتوں سے مجالس گرمانے والے اور داد تحسین سمیٹنے والے خطیبوں کی کمی نہیں تھی، ان سب کو چیلنج دیا گیا، مگر وہ ایک چھوٹی سی سورت بھی اس عظیم الشان کلام جیسی بنا کر نہ لاسکے تو پھر قرآن کریم نے اپنے چیلنج کا دائرہ پھیلاتے ہوئے اعلان کیا کہ قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً میرے حبیب ! فرمادیجیے کہ اگر انسان اور جنات سب اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن کریم جیسا کلام لے کر آئیں تو وہ اس

جیسا کلام نہیں لاسکتے اگر ان میں سے ایک دوسرے کے حمایتی اور مددگار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ نے اس قرآن کریم کے ذریعے انہیں چیلنج کیا مگر وہ اس جیسا کلام لانے سے عاجز رہے، اگر وہ اس جیسا کلام لانے پر قدرت رکھتے تو وہ ضرور ایسا کلام لاکر پیش کرتے، سرعام سناتے اور دادِ تحسین سمیٹتے، وہ جواب نہ دے سکے تو کبھی عناد کا اظہار کرتے، کبھی ٹھٹھا مزاح کرتے، کبھی آپ ﷺ کو جادوگر اور آپ ﷺ کے کلام کو جادوئی کلام کہتے، کبھی اس عظیم اور خوبصورت کلام کو شعر وشاعری کی طرف منسوب کرتے، کبھی کہتے کہ یہ کلام ربانی نہیں ہے بلکہ پہلے لوگوں کے قصے قصے اور کہانیاں ہیں۔

یہ لوگ اپنی زبانوں سے نشتر زنی کرتے رہے، الزامات اور اتہامات کے تیر برساتے رہے مگر قرآن کریم کی طرف سے دیے گئے چیلنجز کا جواب نہ دے سکے، باوجودیکہ وہ لوگ اپنی فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز وفخر کرتے تھے، وہ لوگ اپنے سوا کسی کو فصیح وبلیغ نہیں سمجھتے تھے۔

اگر انہیں علم ہو جاتا کہ کسی مقام پر کوئی شخص فصاحت وبلاغت میں ان سے اوپر کے درجے کا ہے تو وہ اس کی خوب خبر لیتے تھے، اس پر تنقیدی نشتر چلاتے تھے، اس پر چوٹیں کرتے تھے، اگر ان کے پاس قرآن کریم کے چیلنج کا جواب ہوتا تو مکرر سہ کرر اعلانات کے باوجود وہ کبھی چپ سادھ کر بیٹھ نہیں سکتے تھے، تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اپنی زبان دانی پر ناز کرنے والے، اپنی فصاحت وبلاغت پر اکڑنے والے اس عظیم الشان کتاب کے مقابلے سے عاجز اور قاصر تھے۔

عربوں کی بے بسی کے چند واقعات

اہل علم وعرفان نے اپنی مایہ ناز کتب میں ایسے ایسے عجیب وانوکھے واقعات قلمبند فرمائے جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عرب کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء اور اپنی زبان دانی پر ناز کرنے والے قرآن کریم کی اعجاز بیانی سے کس قدر عاجز تھے، وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اور شبانہ روز اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم عمل رہتے تھے۔

① **ولید بن مغیرہ:** حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل، بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا اور اس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا اور حج کا موسم آیا تو قریش مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اطرافِ عرب سے حجاج آئیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام سنیں گے تو فریفتہ ہو جائیں گے اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے اس کے انسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا۔

اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے ان میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے سب نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطراف ملک سے لوگ آئیں گے اور ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلایئے کہ ہم سب وہ بات کہہ دیں ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہو جائے ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہیے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ مجنون ہیں، ان کا کلام مجنونانہ بڑ ہے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا کیونکہ یہ لوگ جب ان کے پاس جائیں گے اور ان سے ملاقات و گفتگو کریں گے اور ان کو فصیح و بلیغ عاقل انسان پائیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ شاعر ہیں ولید نے اس سے بھی منع کیا اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے وہ تو شعر و شاعری کے ماہر ہیں انہیں پتا چل جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ سب لوگ تمہیں جھوٹا سمجھیں گے پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں، جو شیاطین وجنات سے سن کر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں، ولید نے کہا یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمہیں جھوٹا سمجھیں گے۔

اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے ان کو ان الفاظ میں بیان کیا، خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اشعار عرب سے میرے برابر واقف نہیں، خدا کی قسم! اس کلام میں خاص حلاوت ہے اور ایک خاص رونق ہے جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا۔

پھر ان کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے پھر ہم کیا کریں؟ اور ان کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم ان کو ساحر کہو کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں، قوم اس پر مطمئن اور متفق ہو گئی اور سب نے یہی کہنا شروع کیا مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا؟ اطراف عرب کے لوگ آئے قرآن سنا اور بہت سے مسلمان ہو گئے اور اطراف عرب میں اسلام پھیل گیا۔ (خصائص کبریٰ)

② **نضر بن حارث:** اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا، اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد ﷺ تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے اور تم سب ان کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے اور انہوں نے ایک بے مثال کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادو گر کہنے لگے خدا کی قسم! وہ جادو گر نہیں ہم نے جادو گروں کو دیکھا اور برتا ہے ان کے کلام سنے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے وہ بالکل اس سے مختلف ہیں اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ کاہن بھی نہیں ہم نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا اور ان کے کلام سنے ہیں ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں ہم نے خود شعر شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا ان کی بکواس سنی ہے ان کے مختلف اور مختلط کلام سنے ہیں یہاں یہ کچھ نہیں اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں۔

③ **انیس شاعر:** حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی فرماتے ہیں کہ میرا بھائی اُنیس ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اس نے واپس آکر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے کوئی کاہن بتلاتا ہے کوئی جادوگر کہتا ہے، میرا بھائی اُنیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا اس نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں ان کا کلام نہ شعر ہے نہ کہانت ہے نہ مجنونانہ کلمات ہیں بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے، ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سن کر میں نے مکہ کا سفر کیا اور مسجد حرام میں آکر پڑ گیا، تیس روز میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی نہ کوئی ضعف محسوس کیا واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے روم اور فارس کے فصحاء وبلغاء کے کلام بہت سنے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور حمیر کے مقالات بہت سنے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثال میں نے آج تک نہیں سنی تم سب میری بات مانو اور آپ کا اتباع کرو، چنانچہ فتح مکہ کے سال میں ان کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہنچ کر مسلمان ہوگئے۔ (خصائص کبریٰ ص ۱۱۶: ج ۱)

④ **ابوجہل واخنس بن شریق:** اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل اور اخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سنا کرتے اور اس کے عجیب و

غریب بے مثل و بے نظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے ؟ تو ابو جہل کا جواب یہ تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اب وہ یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ہم اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا۔ (خصائص الکبریٰ بحوالہ معارف القرآن)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا بلکہ اس کی مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی، قرآن اور پیغمبر قرآن کے مقابلہ میں جان و مال، اولاد و آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہو گئے مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال و افعال کے باوجود منصف مزاج تھے جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے جب انہوں نے قرآن کو سن کر یہ سمجھ لیا کہ جب در حقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لا سکتے تو محض دھاندلی اور کٹ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھا کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کر دی تو پورے عرب کے فصحاء و بلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کر دیں گے اور خواہ مخواہ رسوائی ہو گی اسی لئے پوری قوم نے سکوت اختیار کیا اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انہوں نے صاف طور پر اقرار و تسلیم بھی کیا جس کے کچھ وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ (معارف القرآن)

⑤ اسعد بن زرارہ: اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اسعد بن زرارہ نے آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے اقرار کیا کہ: ہم نے خواہ مخواہ محمد ﷺ کی مخالفت کر کے اپنے رشتے ناتے توڑے اور تعلقات خراب کئے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں ہرگز جھوٹے نہیں اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ (خصائص)

⑥ قیس بن نسیبہ: قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسمّٰی قیس بن نسیبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ سے قرآن سنا اور چند سوالات کئے جن کا جواب آنحضرت ﷺ نے عطا فرمایا تو یہ اسی وقت مسلمان ہو گئے اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے تو لوگوں سے کہا: میں نے روم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سنے ہیں بہت سے کاہنوں کے کلمات سننے کا تجربہ ہوا ہے حمیر کے مقالات سنتا رہا ہوں مگر محمد ﷺ کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا تم سب میری بات مانو اور ان کا اتباع کرو، انہیں کی تحریک و تلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہو گئے۔ (خصائص ص ۱۱۶)

یہ اقرار و تسلیم صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانبدار تھے بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

⑦ ابو جہل، ابو سفیان اور اخنس: یک مرتبہ ابو جہل اور ابو سفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے نکلے کہ چھپ کر رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنیں ان میں ہر ایک علیحدہ علیحدہ نکلا ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی اور علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپ کر قرآن سننے لگے تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گذر گئی جب صبح ہوئی تو سب واپس ہوئے اتفاقاً راستہ میں مل گئے اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سنا تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ بری حرکت کی

اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہو گی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ سن کر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے اگلی رات آئی تو پھر ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹیس اٹھی کہ قرآن سنیں اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سنا یہاں تک کہ رات گذر گئی اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور اس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذت و حلاوت نے انہیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا پھر پہنچے اور رات بھر قرآن سن کر لوٹنے لگے تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کر لیں کہ آئندہ ہم ہر گز ایسا نہ کریں گے۔

چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے صبح کو اخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہنچا کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا تو اخنس نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے اس کے بعد وہ ابوجہل کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمد کے کلام کو کیسا پایا؟

ابوجہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنو عبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آتی ہے قوم کی سیادت و قیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں انہوں نے سخاوت و بخشش کے ذریعہ قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے ان سے بڑھ کر یہ کام کر دکھایا انہوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں، ان حالات میں ان کے خاندان سے یہ آواز اٹھی کہ ہمارے میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں اس لئے ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ ہم زور

اور طاقت سے ان کا مقابلہ کریں گے اور ہر گز ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ (خصائص ص ۱۱۵ ج ۱، معارف القرآن ج ۱)

⑧ عتبہ بن ربیعہ: عتبہ بن ربیعہ قریش کے سربر آوردہ لوگوں میں سے تھا، بڑے اثر ورسوخ کا مالک تھا، یہ بدر کی لڑائی میں مارا گیا تھا، ایک بار قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، جب کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں ایک جگہ الگ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے، عتبہ اہل مجلس کی مشاورت سے آنحضرت ﷺ کے پاس مصالحت کی گفتگو کرنے آیا، اس کا ارادہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو مال وزر کا لالچ دے کر دعوت اسلام سے روکے، عتبہ نے گفتگو کی، جب گفتگو ختم کر چکا تو آپ ﷺ نے سورۃ حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی آیات اس کے سامنے تلاوت فرمائیں، وہ ہمہ تن گوش سنتا رہا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے آیت سجدہ پر سجدہ کیا تو عتبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کیے اور دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگالی، نہایت خاموشی سے سنتا رہا، آیت سجدہ پر سجدہ کے بعد عتبہ سے نبی کریم ﷺ نے پوچھا ابو الولید! اب بھی تم اپنے اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟

عتبہ یہ سن کر بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر سیدھا ان لوگوں کی طرف چلا گیا، قرآن کریم سننے کا اثر اس کے چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا، لوگ اس کے پاس گفتگو کا نتیجہ معلوم کرنے آئے تو اس نے کہا إِنِّي وَاللهِ قَدْ سَمِعْتُ قَوْلاً مَّا سَمِعْتُ بِمِثْلِهِ قَطُّ، وَاللهِ مَا هُوَ بِالشِّعْرِ، وَلَا السِّحْرِ، وَلَا الْكَهَانَةِ اللہ کی قسم! محمد ﷺ نے مجھ کو ایسا کلام سنایا کہ میرے کانوں نے تمام عمر ایسا کلام نہیں سنا، اللہ کی قسم! یہ کلام نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کاہن یا نجومی کا قول ہے، میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں کیا جواب دوں؟ اے قریشیو! تم میری بات مان لو (الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۱۵ وحی الٰہی، علوم القرآن)

⑨ شاہ حبش نجاشی: شاہ حبش نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورۃ مریم کی تلاوت فرمائی، شاہ حبش اس تلاوت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی لڑی اس کے رخساروں پہ بہنے لگی، کہ اس کی داڑھی آنسوؤں کی برسات میں تر ہو گئی، پھر کہنے لگا کہ خدا کی قسم! یہ

کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق نجاشی نے سورۃ مریم کی تلاوت حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی زبانی سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور قسم کھا کر کہا کہ وَاللّٰہِ مَا زَادَ عَلٰی مَا قَالَ اللّٰہُ فِی الْاِنْجِیْلِ مِثْلَ ھٰذَا اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انجیل میں فرمایا ہے اس کی مثل، اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، مستدرک حاکم، وحی الٰہی)

⑩ حضرت ضماد: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ضماد رضی اللہ عنہ جو کہ أَزْدِ شَنُوءَۃ سے تھے، ضماد رضی اللہ عنہ جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے، ایک مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے، ضماد رضی اللہ عنہ یہ خیال کر کے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علاج کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے مختصر سی حمد

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ مَنْ یَھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُولُہٗ

اور کلمہ شہادت پڑھا، ضماد پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اعادہ کروایا اور پھر کہا لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْکَھَنَۃِ، وَقَوْلَ السَّحَرَۃِ، وَقَوْلَ الشُّعَرَاءِ، فَمَا سَمِعْتُ مِثْلَ کَلِمَاتِکَ ھٰؤُلَاءِ، وَلَقَدْ بَلَغْنَ نَاعُوسَ الْبَحْرِ میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں، ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کلمات تو سنے ہی نہیں یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جائے گا، اس کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ھَاتِ یَدَکَ أُبَایِعْکَ عَلَی الْإِسْلَامِ اپنا دست مبارک لائیے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پر بیعت کر لی۔ (صحیح مسلم، وحی الٰہی)

⑪ قبیلہ بنو سلمہ کے حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ بڑے نامی گرامی سردار تھے، ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کر کے واپس آئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا ہے؟ معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۃ فاتحہ صراط مستقیم تک پڑھ کر سنائی، تلاوت سن کر عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

پر بڑا گہرا اثر ہوا، کہنے لگے یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے، کیا آپ کا سارا کلام ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ ہے، اس کے بعد عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے۔ (شرح زرقانی ۵)

⑫ لبید بن ربیعہ: لبید بن ربیعہ عرب کے مشہور شاعر تھے جن کا ایک قصیدہ سبعہ معلقہ میں بھی شامل ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا تھا، صرف ایک دو شعر منقول ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنر کو پیغام بھیجا کہ وہ لبید سے دریافت کریں کہ زمانہ اسلام میں کوئی نیا شعر کہا ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے شعر کی بجائے سورۃ البقرہ اور آل عمران عطا فرمائی ہے۔ لبید کی اولاد نہیں تھی، اس کی صرف دو بیٹیاں تھیں، اس نے بڑی لمبی عمر پائی ہے، کہتے ہیں کہ اس نے ایک سو پنتالیس سال عمر پائی ہے، ایک قول کے مطابق لبید نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات پائی ہے، ایک قول کے مطابق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات پائی ہے۔ (دیوان لبید بن ربیعہ)

لبید زمانہ جاہلیت میں پیکر شرافت تھا اور زمانہ اسلام میں بھی، بنو جعفر کا وفد جس زمانہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اسی زمانہ میں لبید بن ربیعہ بھی خدمتِ اقدس میں پیش ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔ (اسد الغابہ، حرف اللام) یہ مؤلفۃ القلوب میں سے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے پانچ سو عطیہ میں اضافہ کر دیا تھا، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی کوئی خدمت کرنا چاہی تو انہیں فرمانے لگے کہ اب تو وقت رحلت قریب ہے میں اسے لے کر کیا کروں گا، چنانچہ ان سے وصولی نہیں فرمائی اور کچھ ہی عرصہ بعد رحلت فرمائی، لبید کی رحلت پر ولید بن عقبہ نے ان کے گھر بیس اونٹ روانہ کیے جو ذبح کیے گئے۔ (اسد الغابہ)

⑬ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ: حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کس عظیم مرتبے کے شاعر تھے، کعب بن مالک، عبد اللہ بن رواحہ، طفیل بن عمرو، کعب بن زہیر، شماس، اسود بن سریع اور ان کے علاوہ عربوں

میں کتنے بڑے بڑے نامی گرامی شعراء تھے، مگر قرآن کریم کے اعجاز کا پرچم بلند رہا اور ان لوگوں کی شاعری کا سر خم رہا، قرآنی اعجاز کے سامنے کسی کی فصاحت، بلاغت اور شاعری کا سکہ نہیں چل سکا۔

⑭ حضرت عمر فاروقؓ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا بہادر، دلیر اور شجاع انسان اسلام قبول کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ کے تعاقب میں اپنے گھر سے نکلتا ہے، فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے تعاقب میں اسلام قبول کرنے سے پہلے نکلا، میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے مسجد میں تشریف لے گئے ہیں، میں آپ ﷺ کے پیچھے کھڑا ہو گیا، آپ ﷺ نے سورۃ الحاقہ کی تلاوت شروع کر دی، مجھے تالیف قرآن سے تعجب ہونے لگا، میں نے کہا کہ واللہ! یہ تو شاعر ہے جیسے قریش کہتے ہیں، آپ ﷺ نے نے آیت مبارکہ پڑھی کہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ بلاشبہ یہ قرآن کلام ہے ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا، یہ شاعر نہیں ہے، بہت تھوڑے ہیں تم میں جو ایمان لاتے ہیں۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے کہا کہ یہ کاہن ہے تو آپ ﷺ نے تلاوت کی وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ تَنزِيلٌ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ اور وہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے تم بہت کم سمجھتے ہو، یہ اتارا ہوا ہے رب العالمین کی طرف سے اور اگر یہ شخص ہمارے ذمہ کچھ باتیں لگا لیتا، تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اس کے دل کی رگ کاٹ دیتے، پھر تم میں سے کوئی اسے سزا سے بچانے والا نہ ہو گا، آپ ﷺ نے سورۃ کے اختتام تک تلاوت فرمائی، یہی وہ وقت تھا کہ جب اسلام میرے دل میں مکمل طور پر جاگزیں ہو چکا تھا۔ (احمد، مسند العشرۃ من المبشرین بالجنۃ، دعاوی الطاعنین فی القرآن)

زشام ما بروں آور سحر را — بہ قرآن باز خواں اہل نظر را
تُو مے دانی کہ سوزِ قرأت تُو — دگر گوں کرد تقدیر عمرؓ را

⑮ جبیر بن مطعمؓ: جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بدر کے قیدیوں کو چھڑانے آئے تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نبی کریم ﷺ کو نماز مغرب میں سورۃ الطور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ ﷺ آیت

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُسَيْطِرُونَ پر پہنچے، (ترجمہ: کیا یہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں، یا یہ خود اپنے خالق ہیں، یا انہوں نے ہی زمین و آسمان بنائے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یقین ہی نہیں کرتے، کیا تمہارے پروردگار کے خزانے ان ہی کے قبضہ میں ہیں یا یہ کوئی حکمران ہیں) تو ایسے لگا کہ كَادَ قَلْبِي أَن يَطِيرَ ، قریب ہے کہ میرا دل اڑا جارہا ہے، امام زہری رحمہ اللہ کی روایت میں ہے فَكَانَ ثَمَّا صُدِعَ قَلْبِي حِينَ سَمِعْتُ الْقُرْآنَ میرا دل پھٹا جارہا ہے اور ایک روایت میں ہے یہ پہلا موقع ہے کہ اسلام میرے دل میں مضبوط ہوا۔ (بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب الطور)

⑯ نصاریٰ کا وفد: جب رسول کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں آپ ﷺ کا اور صحابہ کرام کا مطمئن ہو جانا معلوم ہوا اور مہاجرین حبشہ نے مدینہ طیبہ جانے کا عزم کیا تو نجاشی شاہ حبشہ نے ان کے ساتھ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء مشائخ کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا، جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھا، جن میں باسٹھ حضرات حبشہ کے اور آٹھ شام کے تھے، یہ وفد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک درویشانہ اور راہبانہ لباس میں ملبوس حاضر ہوا، رسول اللہ ﷺ نے ان کو سورۃ یسین پڑھ کر سنائی، یہ لوگ سنتے جاتے تھے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، سب نے کہا کہ یہ کلام اس کلام کے کتنا مشابہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا اور یہ سب کے سب مسلمان ہو گئے، ان کی واپسی کے بعد حبشہ نجاشی نے بھی اسلام کا اعلان کر دیا اور اپنا ایک خط دے کر اپنے صاحبزادے کو ایک دوسرے وفد کا قائد بنا کر بھیجا، مگر سوء اتفاق سے یہ کشتی دریا میں غرق ہو گئی، الغرض حبشہ کا بادشاہ اور حکام و عوام نے اسلام

اور مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شریفانہ اور عادلانہ سلوک کیا بلکہ بالآخر خود بھی مسلمان ہو گئے۔ (معارف القرآن)

⑰ ولید بن مغیرہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ولید بن مغیرہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن کریم کے بارے میں پوچھنے آیا، جب آپ نے اسے قرآن کریم کے بارے میں بتلایا تو وہ قریش کی طرف چلا گیا اور جا کر کہنے لگا کہ اے تعجب! ابن ابی کبشہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے پر، اللہ کی قسم! نہ یہ شعر ہے نہ ہی جادو ہے نہ ہی جنون کی طرح کوئی ہذیان ہے، اس کا قول تو اللہ کا کلام ہے۔ (مسند ابن جریر)

⑱ عثمان بن مظعون: عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے سورۃ النحل کی آیت مبارکہ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (النحل) سنی تو فرمانے لگے کہ اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزیں ہو گیا اور میں نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ (وحی الٰہی) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، عبیدہؓ بن الحارث بن عبد المطلب، عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، ابو سلمہ بن عبد الاسد رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دارِ ارقم میں تشریف نہیں لے گئے تھے اور ابھی تک وہاں دعوتی سلسلہ شروع نہیں فرمایا تھا۔ ان تمام لوگوں نے ایک ہی ساعت میں اکٹھے اسلام قبول کیا۔ (طبقات ابن سعد) حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی، زمانہ جاہلیت میں ہی شراب اپنے اوپر حرام قرار دی تھی، آپ زمانہ اسلام میں رات کے عبادت گزار اور دن کے روزہ دار تھے، گھر کے قریب الگ سے عبادت گاہ بنائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ مجھے رہبانیت کے لیے نہیں بھیجا گیا۔

⑲ طفیل بن عمرو الدوسیؓ: حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ مکہ مکرمہ آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے، قریش کے لوگ میری طرف آئے، طفیل شریف آدمی تھے،

چوٹی کے شاعر بھی تھے، ان لوگوں نے ان سے کہا کہ طفیل آپ ہمارے شہر میں آئے ہیں اور یہ شخص (نبی کریم ﷺ) جو ہمارے بیچ میں ہے اس نے ہماری جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، ہمارے معاملات کو بکھیر دیا ہے، اس کی باتیں جادو ہیں، جو باپ اور بیٹے کے درمیان تفریق ڈال دیتا ہے، بھائی بھائی کے درمیان تفریق پیدا کر دیتا ہے، بیوی اور خاوند کے درمیان پھوٹ ڈال دیتا ہے، ہمیں تیرا اور تیری قوم کا ڈر لگا ہوا ہے اس لیے آپ نہ اس شخص سے بات کریں اور نہ ہی اس کی کوئی بات سنیں۔

حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں اس کی بات بالکل نہیں سنوں گا، نہ اس سے بات کروں گا، چنانچہ میں نے اپنے کانوں میں روئی کا ٹکڑا ڈال دیا، اس خوف سے کہ میرے کانوں میں اس کی کوئی بات پہنچے، طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کعبہ کے قریب کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، میں بھی آپ ﷺ کے قریب کھڑا ہو گیا، اللہ تعالیٰ مجھے ان کی بات سنانا چاہتے تھے۔

چنانچہ میں نے آپ ﷺ کا بہت عمدہ کلام سنا، پھر میں نے کہا کہ میری ماں مجھے گم پائے، اللہ کی قسم! میں ایک شاعر ہوں، مجھ سے شعر کا حسن و قبح پوشیدہ نہیں ہے، تو میرے لیے کون سی چیز رکاوٹ ہے کہ میں اس شخص کی بات نہ سنوں جو وہ کہتا ہے، اگر تو جو کچھ وہ کہتا ہے اچھا ہے تو میں اسے قبول کروں گا، اگر برا ہے تو میں اسے چھوڑ دوں گا، کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ان کے گھر آنے تک وہاں ٹھہرا رہا، پھر میں آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل دیا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔

پھر میں نے کہا کہ اے محمد! ﷺ آپ ﷺ کی قوم نے مجھے یہ یہ باتیں کہی ہیں، اللہ کی قسم! وہ مجھے مسلسل آپ کے بارے میں ڈراتے رہے یہاں تک کہ میں نے اپنے کان روئی کے گالوں سے بند کر لیے تاکہ آپ کی بات نہ سن پاؤں، مگر اللہ مجھے آپ ﷺ کی بات سنانا چاہتے تھے تو میں نے

آپ ﷺ کی بہت اچھی بات سنی ہے، اس لیے مجھ پر اپنا معاملہ پیش فرمایئے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے مجھ پر اسلام پیش فرمایا اور میرے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، حضرت طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں فَلَا وَاللّٰہِ مَا سَمِعْتُ قَوْلًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ، وَلَا أَمْرًا أَعْدَلَ مِنْهُ، اللہ کی قسم! میں نے کبھی بھی اس سے خوبصورت کلام نہیں سنا، میں نے اس سے زیادہ انصاف والا کلام نہیں سنا، چنانچہ پھر میں مسلمان ہو گیا اور حق کی گواہی دی۔ (شرح الزرقانی علی مواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ) طفیل رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کے بعد گھر تشریف لائے تو اپنے والد کو مسلمان کیا، پھر بیوی کو مسلمان کیا۔

⑳ عبد الرحمٰن بن خالد عدوانی: حضرت عبد الرحمٰن بن خالد عدوانی فرماتے ہیں کہ میرے والد خالد عدوانی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو ثقیف کے مشرق میں دیکھا جب کہ آپ ﷺ کمان یا عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ ان کے پاس نصرت طلب کرنے آئے تھے، خالد عدوانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس وقت میں نے آپ ﷺ کو سورۃ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ پڑھتے ہوئے سنا، آپ ﷺ نے پوری سورت مکمل پڑھ لی، میں نے زمانہ جاہلیت میں مشرک ہوتے ہوئے یہ یاد کر لی تھی، پھر میں نے اس سورت کو زمانہ اسلام میں پڑھا، مجھے ثقیف نے بلایا اور پوچھنے لگے کہ تم نے اس آدمی سے کیا سنا؟ پھر میں نے انہیں سورۃ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ پڑھ کر سنائی، انہوں نے کہا کہ قریش میں سے ان کے پاس کون تھا؟ کیونکہ ہم اپنے آدمی کو اچھی طرح جانتے ہیں، اگر ہم اس کے کہے کو سچا جانتے تو ہم اس کی پیروی کرتے۔ (احمد، سیرت النبویہ، الھدی والرشاد)

یہ چند ایمان افروز واقعات ہم نے یہاں نقل کیے ہیں، ورنہ کتابوں کے سینے ان جیسے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے اسلافِ صالحین کو جزائے خیر دے جنہوں نے شبانہ روز کاوشیں بروئے کار لا کر قرآن کریم کی خدمت کی اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کو روشنی کا سامان بہم پہنچایا۔

قرآنی تاریخ میں بہت ہی ایمان افروز واقعات محفوظ ہیں، عرب دنیا کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، ادباء اور شعرا قرآنی فصاحت، بلاغت اور ادب کے سامنے سرنگوں ہوگئے، وہ قرآنی اثر انگیزی کا قولی اور عملی ہر اعتبار سے اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے اور اعجاز قرآنی پر ایسے تاریخی جملے صادر کیے جو آج بھی عقول وفحول اور خرد مندانِ دنیا کی عقلوں کو ورطہ حیرت میں ڈال رہے ہیں۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب علوم القرآن میں لکھا ہے کہ بعض غیر مسلم مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کسی نے قرآن کریم کے مقابلے پر کوئی کلام پیش کیا ہو لیکن ہم تک اس کا کلام نہ پہونچ سکا ہو، علامہ ابو سلیمان خطابی (متوفیٰ ۳۸۸ھ) نے جو بڑے پایہ کے محدث ہونے کے علاوہ لغت اور ادب کے بھی امام ہیں، اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ "یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لیے کہ ابتدا سے عام اور خاص لوگوں کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ وہ اہم واقعات کو ضرور نقل کرکے آئندہ نسلوں کے لیے بیان کر جاتے ہیں، بالخصوص وہ واقعات جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہوں۔

یہ معاملہ (قرآن کریم کا چیلنج) تو اس وقت چار دانگ عالم میں شہرت پا چکا تھا، اگر اس کا کوئی مقابلہ کیا گیا ہوتا تو اس کا ہم تک نہ پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، اگر یہ بات ممکن ہو سکتی ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور نبی یا بے شمار انبیاء مبعوث ہوئے ہوں، ان پر کتابیں اتری ہوں اور ان میں شریعت محمدی کے علاوہ کوئی اور شریعت بیان کی گئی ہو اور یہ واقعات ہم تک نہ پہنچے ہوں، اگر یہ بات ناقابل تصور ہے تو قرآن کریم کے معارضہ کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ (علوم القرآن ص ۲۵۳)

حمقاءِ دنیا کی اَحمقانہ عبارات

قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کا، قرآن کریم کے تحدی و چیلنج کا مقابلہ کرنے سے زبانیں اور دماغ گنگ ہوگئے، کوئی بھی جب مقابلہ نہ کر سکا تو ان لوگوں نے اپنی زبانیں کھولنا شروع کیں اور طبع آزمائی کی تاکہ دنیا میں وہ یہ بات بتلا سکیں کہ ہم نے قرآن کریم کا مقابلہ کیا ہے، مگر ان تمامی

شیاطین کو اہل علم نے مسکت اور دَندان شکن جوابات دیے ہیں اور خود ان کی عبارتیں بولتی ہیں کہ یہ کلام الٰہی نہیں ہے، یہ آسمانی کلام نہیں ہے، یہ رحمانی کلام نہیں ہے بلکہ یہ شیطانی کلام ہے، یہ شیطانی وساوس ہیں، ان میں سے چند لوگوں کی عبارتیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، مگر یہ عبارتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کا ترجمہ کیا جائے کیونکہ ان عبارتوں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو انسانی منفعت کی ہو، انسانی فائدہ کی ہو، ان میں مغلظات، ہفوات اور قائلین کا ہذیان ہے۔

① مسیلمہ کذاب جو نبوت کا جھوٹا دعویدار تھا، اس نے سورۃ الکوثر کے مقابلے میں چند کلمات جوڑے ہیں۔ اس کی حماقت ملاحظہ کیجیے إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْجَوَاهِرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَهَاجِرْ إِنَّ شَانِئَكَ هو الكافر (البرهان فی علوم القرآن)

② اسی طرح مسیلمہ کذاب کی یہ ہفوات ملاحظہ فرمایئے وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا، وَالعَاجِنَاتِ عَجْنًا، فَالخَابِزَاتِ خَبْزًا، وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا، وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا۔ اس میں اس نے آٹا چھاننے والیوں، آٹا گوندھنے والیوں، روٹیاں پکانے والیوں، ثرید بنانے والیوں اور لقمے توڑنے والیوں کی نقشہ کشی کی ہے۔ (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام)

③ ایک اور احمقانہ کلام ملاحظہ فرمایئے، والمُبَذِّرَاتِ زَرْعًا، وَالحَاصِدَاتِ حَصْدًا، وَالذَّارِيَاتِ قُمْحاً، وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا، وَالعَاجِنَاتِ عَجْنًا، وَالخَابِزَاتِ خُبْزًا، وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا، وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا، إِهَالَةً وَّسَمْنًا لَقَدْ فُضِّلْتُم عَلَى أَهلِ الوَبَر، وَمَا سَبَقَكُم أَهلَ المَدَرِ، ريفكم فامنعوه، والمُعتر فآووه، والباغي فناوئوه (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام مولفه: جواد علی)

④ وَالشَّاءِ وَأَلْوَانُهَا، وأعجبها السود وألبانها، والشاة السوداء، واللبن الأبيض، إنه لعجب محض، وقد حم المذق فما لكم لا تمجعون. (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام)

⑤ اَلفِيلُ مَا الفِيلُ، وَمَا أَدرَاكَ مَا الفِيلُ، لَهُ ذَنَبٌ وَبِيلٌ، وَخُرطُومٌ طَوِيلٌ (طبری) بعض کتب میں یہ الفاظ ہیں لَهُ مِشفَرٌ طَوِيلٌ وَذَنَبٌ اَثِيلٌ وَمَاذَاكَ مِن خَلقِ رَبِّنَا القَلِيلُ

(ثلاثہ رسائل فی اعجاز القرآن، علوم القرآن للعثمانی)

⑥ ان یاوہ گو لوگوں کی مزید ہفوات ملاحظہ فرمایئے، سجاح نامی ایک عورت تھی جو پکی عیسائی تھی، یہ عبارات اس کے لیے اس وقت بولی گئی ہیں جب مسیلمہ نے اس کے ساتھ ہمبستری کا ارادہ کیا لَقَد أَنعَمَ اللهُ عَلَى الحُبلٰى، أَخرَجَ مِنهَا نَسمَةً تَسعَى، مِن بَين صَفاق وحشى (طبری)

⑦ ألم ترَ عَلَى رَبِّك كَيفَ فَعَلَ بالحُبلَى، أَخرَجَ مِنهَا نَسمَةً تَسعَى، مِن بَين صَفَاق وحشى

⑧ سجاح نے جب اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا أوحى إلىّ: أنَّ اللهَ خَلَقَ النِّسَاءَ أَفرَاجًا، وَجَعَلَ الرِّجَالَ لَهُنَّ أَزوَاجًا، فَنُولِجُ فِيهِنَّ قُعسًا إِيلَاجًا، ثُمَّ نُخرِجُهَا إِذَا نَشَاءُ إِخرَاجًا، فَينتجن لنا سخالا انتاجا، یہ گندی اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کہنے والا وہ شخص تھا جو مدعی نبوت تھا، اس کی یہ مسجع و مقفیٰ عبارت سن کر سجاح نے اس سے کہا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ تو اللہ کا نبی ہے، اس نے اس سے پوچھا کہ کیا میں تیرے ساتھ شادی کر سکتا ہوں؟ اس نے کہا کہ ہاں، پھر مسیلمہ نے اس کے سامنے یہ اشعار کہے

ألا قومى إلى النيك ... فقد هُيى لك المضجع

وإن شئت ففى البيت ... وإن شئت ففى المخدع

وإن شئت سلقنالكِ ... وإن شئت على أربع

وإن شئت بثلثيه ... وإن شئت به أجمع

یہ اشعار سنانے کے بعد مسیلمہ سجاح سے کہنے لگا کہ یہی اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے، عربی دان لوگ بہتر جانتے ہیں کہ ان عبارات سے کس قدر غلاظت ٹپکتی ہے، اس گفت وشنید کے بعد تین دن تک سجاح مسیلمہ کے پاس رہی پھر اپنے لوگوں کی طرف لوٹ گئی، ان لوگوں نے سجاح سے پوچھا کہ تیرے پاس کیا خبر ہے؟ اس نے کہا کہ مسیلمہ حق پر تھا اس لیے میں اس کی پیروکار بن گئی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔

لوگوں نے سجاح سے پوچھا کہ کیا اس نے تجھے مہر دیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، لوگوں نے سجاح سے کہا کہ تو واپس مسیلمہ کی طرف چلی جا، تیری جیسی عورتیں بری ہوتی ہیں جو مہر کے بغیر لوٹتی ہیں، چنانچہ وہ مسیلمہ کے پاس لوٹ گئی، جب مسیلمہ نے سجاح کو واپس ہوتے دیکھا تو قلعے کا دروازہ بند کر دیا اور پوچھنے لگا تجھے کیا ہوا؟ سجاح نے کہا کہ مجھے مہر دے دو، مسیلمہ نے اس سے پوچھا کہ تیرا وکیل مہر کون ہے؟ اس نے کہا کہ شبث بن ربعی الریاحی، مسیلمہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ آیا تو اس نے کہا کہ اپنے لوگوں میں اعلان کر دو کہ مسیلمہ بن حبیب، اللہ کا رسول ہے، جس نے تم سے دو نمازیں کم کر دی ہیں جو محمد ﷺ تمہارے لیے لائے تھے، ایک عشاء کی نماز ہے اور دوسری فجر کی نماز ہے۔ (طبری)

⑨ سجاح کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مسیلمہ کے خیمہ میں داخل ہوئی تو اس سے کہنے لگی کہ مجھے بتاؤ جبریل تمہارے پاس کیا لائے؟ اس نے کہا کہ یہ سورت سنو، انکن معشر النساء خلقن أمواجًا، وجعل الرجال لکن أزواجًا، یولجن فیکن إیلاجًا، لا ترون فیه فتوراً ولا إعوجاجًا، ثم یخرجونه منکن إخراجاً، یہ ہفوات بھری عبارت سننے کے بعد سجاح نے جواب دیا کہ تو نے سچ کہا ہے، اللہ کی قسم! تو اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے۔ (طبری)

⑩ مسیلمہ کذاب ملعون کی ہفوات بھری ایک اور عبارت ملاحظہ فرمایئے وہ کہتا تھا کہ میرے اوپر یہ آیات نازل ہوئی ہیں والنازعات نزعاً، و الزارعات زرعاً، و الحاصدات حصداً، والذاریات ذرواً، فالطاحنات طحناً، والنازلات نزلًا، فالجامعات جمعاً، و العاجنات عجنًا، فالخابزات خبزًا، والثاردات ثردًا، فالآکلات أکلًا، والماضغات مضغًا، فالبالعات بلعًا (طبری)

⑪ یہ بدبخت قرآن کریم کے مقابلے میں یہ عبارت سناتا تھا کہ اللہ نے جس کی سن لی اس کی سن لی، اور اسے خیر کا لالچ دیا جب اس نے لالچ کیا، سمع الله لمن سمع، وأطمعه بالخیر إذ طمع، ولا زال

أمره فی کل ما سرّ نفسه یجتمع. رآکم ربکم فحیاکم، ومن وحشة خلاکم، و یوم دینه أنجاکم، فأحیاکم علینا من صلوات معشر أبرار، لا أشقیاء ولا فجّار، یقومون اللیل ویصومون النهار، لربکم الکبار، رب الغیوم والأمطار (طبری)

⑫ اسی بدبخت نے حسیناؤں کے حسن وجمال کے بارے میں اللہ پر یہ جھوٹ بولا کہ اللہ نے یہ وحی بھیجی ہے لَمَّا رَأَیتُ وُجُوهَهُم حَسُنَت، وَأَبشَارَهُم صَفَت، وَأَیدِیَهُم طَفَلَت، قُلتُ لَهُم: لَا النِّسَاء تَأتُونَ، وَلَا الخَمرَ تَشرَبُونَ، وَلٰکِنَّکُم مَعشَرُ أَبرَار تَصُومُونَ یَومًا، وَتکلفون یومًا، فسبحان الله! إذا جَاءَت الحَیَاة تحیون، وَإلی ملك السماء تَرقُون! فلو أنها حَبَّةُ خَردَلَة، لَقَامَ عَلَیهَا شَهِیدٌ یَعلَمُ مَا فِي الصُّدُورِ، وَلاَ کثرُ النَّاسِ فِیهَا الثُّبُور. (طبری)

⑬ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بحرین کی طرف روانہ کیا، پھر آپ ﷺ کا انتقال ہو گیا جب کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ زندہ رہے، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسیلمہ کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے امان دی پھر نبی کریم ﷺ کے بارے میں نازیبا بات کہی تو میں نے اس سے کہا کہ تو یہ الفاظ واپس لے لے، تو بدبخت مسیلمہ کذاب نے ان جملوں کو قرآن کریم کے مقابلے میں اپنی وحی قرار دیا یاضفدع بنت ضفدین نقی ماتنقین، نصفك فی الماء ونصفك فی الطین، لاالماء تکدرین ولاالشارب تمنعین۔ (اعجاز القرآن والبلاغة النبویة)

⑭ مسیلمہ کذاب نے ان جملوں کو بھی اپنے اوپر آنے والی وحی بنا کر پیش کیا، ملاحظہ کیجیے، یاوبرة یدان وصدر وسائر خلقك حقر بقر پھر اس نے یہ عبارت بھی وحی بنا کر پیش کی واللیل الآدم والذیب الأهجم پھر اس نے یہ عبارت بھی وحی بنا کر پیش کی واللیل الدامس والذیب الهامس ما حرمة رطب إلا کحرمة یابس قوما فلا أری علیکما فیما صنعتم بأسا، یہ عبارت سن کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کی قسم! تو بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ تو جھوٹے لوگوں میں سے ایک ہے۔ (فضائل القرآن للمستغفری)

جاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں ضفدع (مینڈک) کے ذکر کے دوران لکھا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مسیلمہ کو مینڈک کے ذکر پر کس چیز نے ابھارا؟ اوراس کے بارے میں اس نے اپنی بری رائے کیوں قائم کی؟ کہ اس پر یہ وحی آئی۔ مصطفے صادق الرافعی فرماتے ہیں کہ مسیلمہ کا تمامی کلام اسی طرز پر واہیات، لچر، بے ہودہ، پھسپھسا اور کمزور ہے۔ (اعجاز القرآن)

⑮ ان ہی افترا پردازوں اور جھوٹوں میں ایک شخص عبہلہ بن کعب تھا جسے اسود عنسی کہا جاتا ہے، جس کا لقب خمار تھا، یہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس گدھے والا آتا ہے، یہ بہت فصیح و بلیغ شخص تھا، کاہن مشہور تھا مسجع اور مقفیٰ عبارتیں بولتا تھا، خطابت، شعر اور نسب دانی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اس نے نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا، یہ اس بات کا دعویدار تھا کہ اس پر وحی آتی ہے، مگر اس کا کلام کہیں دستیاب نہیں ہے کہ یہ کیا ہرزہ سرائی اور ہفوات گوئی کرتا تھا۔ (البلاغۃ النبویہ، اعجاز القرآن)

⑯ طلیحہ اسدی نامی ایک کذاب اور جھوٹا یہ کلام وحی بنا کر سناتا تھا إن الله لا يصنع بتعفير وجوهكم ولا بتقبيح أدباركم شيئاً، فاذكروا الله اَعِفَّةً قياماً فان الرغوة فوق الصريح (فتوح البلدان ج ا ص ۱۶) عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے طلیحہ اسدی سے پوچھا تھا کہ تو ہی وہ جھوٹا اور کذاب ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر یہ وحی نازل کی ہے؟ اس کے قبیح کلام کے کچھ جملے یہ ہیں، والحمام واليمام والصرد الصوام، قد ضمن من قبلكم أعوام ليبلغن ملكنا العراق والشام والله لانسحب ولا نزال نضرب حتى نفتح أهل يثرب. (المنتظم فی تاریخ الامم والملوک)

⑰ طلیحہ اسدی ہی وہ بدبخت انسان تھا جس نے نماز میں رکوع اور سجود کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان الله لم يأ مران تمرغوا وجوهكم فى التراب اوان تقاسوا ظهوركم فى الصلاة (تاریخ الخلفاء الراشدین، الفتوحات والانجازات السیاسیة)

⑱ پھر نزول قرآن کے کافی عرصے بعد عربی کے مشہور ادیب اور انشاء پرداز عبداللہ بن المقفع مترجم

کلیلہ ودمنہ متوفیٰ ۱۴۲ھ نے قرآن کریم کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسی دوران کسی بچے کو یہ آیت پڑھتے سنا کہ وَقِيلَ يَاأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَاسَمَاءُ اقْلِعِي تو پکار اٹھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا معارضہ ناممکن ہے اور یہ ہرگز انسانی کلام نہیں۔ (اعجاز القرآن للباقلانی)

اہل علم وفضل کو اچھی طرح معلوم ہو چکا ہو گا کہ ان خبیثانِ عالم نے کس طرح کے خبیث اور گندے کلمات والفاظ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا، اپنے طور پر انہوں نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کی ناپاک کوشش کی مگر ادنیٰ سا قرآنی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ان حمقائے دنیا کا کلام کس قدر گندہ، متعفن اور آلائش دنیا سے آلودہ ہے، کہیں شہوت انگیزی ہے اور کہیں صنف نازک کی تعریف وستائش ہے اور کہیں ان اشتہاء انگیز اشیاء کا برملا اظہار ہے جن کا قرآن کریم نے اشاروں کنایوں میں بھی ذکر مناسب نہیں سمجھا۔

قرآن کریم نے ہمیشہ ان چیزوں کو پوشیدہ رکھا جن سے بے حیائی وفحاشی عام ہونے کا اندیشہ تھا، مگر ان شہوت پرست جھوٹے، مکار، دغاباز، جعلساز، کذاب اور دروغ گو لوگوں نے اپنی جھوٹی اور خانہ ساز نبوت کی طرح وحی الٰہی کو بھی بدنام کرنے کی ناپاک سعی کی، رہے وہ لوگ جنہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا، جنہیں اپنی فصاحت وبلاغت پر فخر وغرور تھا، جو خانہ کعبہ کے دروازے پر اپنے اشعار معلق کر دیا کرتے تھے ان میں سے کسی کو کلام اللہ کے مقابلے میں دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی، جن لوگوں نے سعی لاحاصل کی یہ بیوپاری اور کاروباری لوگ تھے، جنہوں نے اپنی شہرت، حب جاہ اور طلب مال کی خاطر اس طرح کی بھونڈی حرکت کی، اللہ ان پر کروڑوں لعنتیں نازل فرمائے۔

وجوہ اعجاز قرآن

اہل علم وفضل نے اپنے اپنے ادوار میں قرآن کریم کے وجوہ اعجاز پر عظیم الشان تحریریں لکھی ہیں، تیس سے زیادہ کتب ہیں جن میں اعجاز قرآنی پر مدلل اور مفصل گفتگو کی گئی ہے، ہم بھی یہاں

اپنے اسلاف کی تحریروں سے چند وجوہات بیان کریں گے۔

① علوم و معارف کا خزانہ: قرآن کریم معجز نما کتاب ہے، یہ نبی کریم ﷺ کا عظیم الشان دائمی معجزہ ہے اور کیوں یہ معجزہ نہ ہو کہ اس میں بڑے بڑے علوم و معارف سموئے ہوئے ہیں، یہ ایسے علوم و معارف کی جامع کتاب ہے جنہیں دنیائے کتب میں سے کسی کتاب میں جمع نہیں کیا گیا، اس میں جو جو علوم ہیں ان کا کسی نے قلیل الفاظ کے ساتھ اور معدود حروف کے ساتھ احاطہ نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ہم نے کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور ارشاد فرمایا وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ، ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔

رحمت دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ أَلَا إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ خبر دار! عنقریب فتنے ظاہر ہوں گے، آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! ان فتنوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ ان فتنوں سے بچنے کا طریقہ اللہ کی کتاب ہے جس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں ہیں اور تمہارے بعد والوں کی خبریں اور تمہارے باہمی تنازعات کے فیصلے ہیں۔ (ترمذی، باب فضل القرآن)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مَن أَرَادَ عِلمَ الأَوَّلِينَ وَالآخِرِينَ فَلْيُثَوِّرِ الْقُرْآنَ، جو شخص اگلوں اور بعد والوں کے علم کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ قرآن کریم میں غور و فکر کرے۔ (دیلمی)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا إِذَا أَرَدْتُمُ الْعِلْمَ فَأَثِيرُوا الْقُرْآنَ، فَإِنَّ فِيهِ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ اگر تم لوگ علم چاہتے ہو تو قرآن کریم میں غور و فکر کرو کیونکہ اس میں پہلوں اور بعد والوں کے علوم ہیں۔ (الزہد والرقائق لابن المبارک)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَعَلَيْهِ بِالْقُرْآنِ، فَإِنَّ فِيهِ خَبَرَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ (شعب الایمان) جو شخص علم چاہتا ہے وہ قرآن کریم کو لازم

پکڑے کیونکہ اس میں اگلوں اور پچھلوں کی خبریں ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ علم سے مراد یہاں اصول علم ہیں۔ (معترک الاقران فی اعجاز القرآن)

حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَعْلَمَ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَعِلْمَ الْآخِرِينَ وَعِلْمَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَقْرَأْ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ (مصنف ابن ابی شیبہ، حلیۃ الاولیاء) جسے یہ بات اچھی لگے کہ وہ اولین وآخرین، علم دنیا اور علم آخرت سیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ سورۃ الواقعہ پڑھے۔ اندازہ فرمائیے کہ جب سورۃ الواقعہ سے اگلوں پچھلوں، دنیا اور آخرت کے علوم کے چشمے بہہ رہے ہیں تو پورے قرآن کریم سے تو پھر علم و معارف کے دریا اور سمندر بہہ رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم حربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رَأَيْتُ أَحْمَدَ كَأَنَّ اللهَ جَمَعَ لَهُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو دیکھا تو یوں لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اگلوں پچھلوں کے علوم ان میں یکجا کر دیے ہیں۔ حضرت سعید الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے زیادہ کسی کالے بالوں والے شخص کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حافظ نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص دیکھا جو اس کے معانی کو بہت زیادہ جاننے والا ہو، جب کسی دریا و سمندر کے قطرے کے علم و فضل کا یہ عالم ہے تو اس دریا اور سمندر کا اپنا کیا عالم ہو گا۔ (مسند احمد فضل فی اقبالہ علی العلم)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنزَلَ اللهُ مِائَةَ كِتَابٍ وَأَرْبَعَةَ كُتُبٍ، أَوْدَعَ عُلُومَهَا أَرْبَعَةً مِنْهَا: التَّوْرَاةُ، وَالإِنْجِيلُ، وَالزَّبُورُ، وَالْفُرْقَانُ، ثُمَّ أَوْدَعَ عُلُومَ الثَّلَاثَةِ فِي الْفُرْقَانِ اللہ تعالیٰ نے ایک سو صحیفے اور چار کتابیں نازل فرمائیں، ان سب کے علوم و معارف اللہ تعالیٰ نے چار میں رکھ دیے، وہ چار تورات، انجیل، زبور اور فرقان ہیں، پھر ان تین کے علوم فرقان حمید یعنی قرآن مجید میں رکھ دیے۔ (بیہقی، معترک الاقران فی اعجاز القرآن)

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جَمِيعُ مَا تَقُولُهُ الْأُمَّةُ شَرْحٌ لِّلسُّنَّةِ، وَجَمِيعُ السُّنَّةِ شَرْحٌ لِّلْقُرْآنِ، جو کچھ امت کہتی ہے وہ سارے کا سارا سنت محمدیہ کی شرح ہے اور سنت محمدیہ ساری کی

ساری قرآن کریم کی شرح ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جَمِيعُ مَا حَكَمَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهُ مِنَ الْقُرآنِ، جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا وہ وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے سمجھا۔ (معترک الاقران)

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان گرامی سے بھی ہوتی ہے جسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن کبریٰ میں نقل فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لَا أُحِلُّ إِلَّا مَا أَحَلَّ اللهُ فِي كِتَابِهِ، وَلَا أُحَرِّمُ، إِلَّا مَا حَرَّمَ اللهُ فِي كِتَابِهِ میں وہی چیز حلال کرتا ہوں جسے اللہ کی کتاب نے حلال قرار دیا ہے اور میں اسی چیز کو حرام کرتا ہوں جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے۔ (معترک الاقران فی اعجاز القرآن)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جامعیت اور کاملیت کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ جس بات کی میں تمہیں خبر دوں گا اس کی تصدیق اللہ کی کتاب سے کرواؤں گا۔ (ابن ابی حاتم)

ایک سوال کیا گیا کہ احکام تو ابتداً سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتے ہیں؟ اس کا جواب امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے معرکۃ الاقران فی اعجاز القرآن میں یہ دیا کہ سنت درحقیقت کتاب اللہ سے ماخوذ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع واجب کی ہے تو ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے راہنمائی حاصل کریں۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک بار مکہ مکرمہ میں لوگوں سے کہا کہ مجھ سے تم جو چاہو سوال کرو میں تمہیں اس کے بارے میں کتاب اللہ سے جواب دوں گا، تو ان سے سوال کیا گیا کہ محرم شخص اگر بھڑ (زنبور) کو قتل کر دے تو اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت کے بعد یہ آیت پڑھی وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا جو کچھ تمہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیں وہ لے لو اور جس چیز سے تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روکیں اس سے رک جاؤ۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرنا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے محرم کو حکم دیا تھا کہ وہ بھڑ (زنبور) کو مار دے۔ (معترک)

بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بال گودھنے والی، گدھوانے والی اور پیشانی سے بال اکھیڑنے اور اکھڑوانے والی اور حسن و جمال کے لیے دانتوں کے درمیان فاصلہ کروانے والی عورتوں پر لعنت کی ہے، جو اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں، جب یہ بات بنی اسد کی ایک عورت تک پہنچی تو اس نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے پوچھا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تو یوں یوں اور ایسے ایسے لعنت کرتا ہے تو عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس عورت کو جواب دیا کہ میں کیوں نہ ان عورتوں پر لعنت کروں جن پر رسول کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اور وہ کتاب اللہ میں موجود ہے، وہ عورت بولی کہ میں نے دو لوحوں کے درمیان جو کچھ لکھا ہوا پایا ہے اس میں تو یہ نہیں ہے، جو آپ کہتے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو پڑھنا چاہتی ہے تو پڑھ لے گی، بہر حال اس نے یہ آیت وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا پڑھ لی تو بولی کہ ہاں! عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

سراقہ نے حضرت ابو بکر بن مجاہد رحمہ اللہ سے کتاب الاعجاز میں نقل کیا ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو، تو ان سے پوچھا گیا کہ خانات (مسافر خانہ، سرائے) کا ذکر قرآن کریم میں کہاں ہے؟ تو انہوں نے کتاب اللہ سے اسے جواب دیا کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ، تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہو جاؤ ان میں تمہارے لیے ساز و سامان ہے۔ یہی تو خانات کا ذکر ہے۔

ابن برجان رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہا کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہو یا اس چیز کی اصل قرآن کریم میں بیان ہو گی، اس کے قریب قریب ہو گی یا بعید ہو گی، اس سے جو سمجھدار ہو گا وہ سمجھ جائے گا، جو اس سے اندھا رہا وہ اندھا

رہے گا، اسی طرح ہر وہ چیز جس کا حکم دیا گیا یا جس کا فیصلہ کیا گیا اسے جستجو کرنے والے اپنی کوشش وسعی، اپنی گنجائش اور اپنی وسعت فہم کی بقدر پالیں گے۔

اسی طرح اہل علم میں سے ایک نے فرمایا کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ااستخراج واستنباط وہ لوگ نہ کر سکیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم وفراست سے نوازا ہے، یہاں تک کہ بعض اہل علم نے تو قرآن کریم کی اس آیت وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا سے نبی کریم ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ سال کا استخراج واستنباط کیا ہے۔ کیونکہ اس سورت کا نزول بھی ۶۳ ویں نمبر پر ہوا ہے اس کے بعد سورۃ التغابن کا نزول ہوا ہے۔

ابن ابو الفضل مرسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے اولین وآخرین کے علوم اس طرح جمع کیے کہ ان کا حقیقی علم اسی ذات کے پاس ہے جو علم دینے والی اور اس کی بات کرنے والی ہے، پھر نبی کریم ﷺ کو اس کا علم ہے سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص کر لیا، پھر ان علوم کے وارث بڑے بڑے صحابہ کرام اور حضرات خلفاء راشدین کو بنایا، جیسے خلفاء اربعہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، انہوں نے یہاں تک فرمایا کہ اگر میرے اونٹ کی ایک رسی بھی گم ہو گی تو میں اسے اللہ کی کتاب میں پالوں گا، پھر حضرات تابعین نے یہ علوم وراثت میں پائے، پھر ان کے بعد ہمتیں جواب دے گئیں، حوصلے پست ہو گئے، اہل علم کمزور پڑ گئے اور صحابہ کرام اور تابعین نے جن علوم اور فنون کا بیڑہ اٹھایا تھا انہیں حاصل کرنے میں سستی دکھائی۔

پھر قرآنی علوم ومعارف کی اقسام اور انواع مرتب کی گئیں، ہر گروہ وطبقہ نے قرآنی فنون وعلوم میں سے ہر فن پر کام کیا، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآنی لغات محفوظ کیں، اس کے کلمات لکھے، قرآنی حروف کے مخارج پر محنت کی، اس کے کلمات، اس کی آیات اس کی سورتوں، اس کے احزاب، اس کے نصف، اس کے ربع، اس کے سجدوں کو شمار کیا، متشابہ اور متماثل آیات

کو اس طرح شمار کیا کہ ان کے معانی، مفاہیم و مطالب میں کسی قسم کا تعارض نہ رہے، جن لوگوں نے اس میدان میں جانفشانی کی انہیں قراء (قرآن کریم کے قاری) کا نام دیا گیا۔

اہل نحو نے قرآن کریم سے معرب مبنی تلاش کیے، اسماء افعال اور حروف عاملہ کو مرتب کیا، اسماء اور اسماء کے توابع کو وسعت دی، افعال کی اقسام، لازم و متعدی، رسوم الخط اور اس کے تمام متعلقات کو جمع کیا، بعض نے اعراب پر محنت کی یہاں تک کہ بعض نے اس کے مشکل اعراب اور بعض نے ایک ایک کلمہ پر اعرابی محنت کی۔

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس کے الفاظ پر محنت کی، اس جستجو اور تلاش کے دوران انہیں قرآن کریم میں سے ایسے الفاظ ملے جن میں سے کوئی لفظ ایک معنیٰ پر دلالت کرتا ہے اور کوئی لفظ دوسرے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے، ایسے الفاظ بھی تلاش کیے گئے جو دو دو معانی پر دلالت کرتے ہیں اور کوئی لفظ بے شمار معانی پر دلالت کرتا ہے، ترجیحی معانی پر حکم جاری کیا اور جن الفاظ میں خفاء اور پوشیدگی تھی ان کا خفاء دور کیا، دو معانی اور دو سے زیادہ معانی والے الفاظ کے محتملات کی ترجیح پر محنت کی، ان لوگوں نے اپنی تمام تر فکریں اس پر مرکوز کر دیں۔

اصولیوں نے عقلی دلائل و شواہد اصلیہ و نظریہ پر محنت کی، یہاں تک کہ قرآنی آیات جس میں فرمایا گیا کہ اگر اس کائنات میں دو معبود ہوتے تو کائنات کا نظام تباہ ہو جاتا، پر خوب عقلی دلائل پیش کیے، اس طرح کی بے شمار آیات ہیں، ان لوگوں نے ان آیات میں سے اللہ کی وحدانیت، وجود، اللہ تعالیٰ کا قدم (قدیم ہونا) بقاء، اللہ کی قدرت و علم، اللہ کی تنزیہ اور تقدیس پر دلائل کا استنباط کیا، اس علم کو علم اصول الدین کہا جاتا ہے۔

ایک جماعت نے قرآنی خطابات کے معانی پر محنت کی، ان حضرات نے ان خطابات میں سے عموم اور خصوص کے تقاضے واضح کیے، انہوں نے حقیقت و مجاز کے احکامات کا استنباط کیا، انہوں

نے تخصیص واخبار، نص، ظاہر، مجمل، محکم، متشابہ، امر، نہی، نسخ، قیاس کی اقسام، استصحاب حال اور استقراء کے بارے میں محنت کی، اس فن کو فن اصول فقہ کہا جاتا ہے۔

ایک جماعت نے حلال، حرام اور تمام احکامات کی صحیح النظر اور صادق الفکر کو مضبوط کیا، ان حضرات نے اس کے اصولوں کی بنیاد رکھی، اس کی فروعات قائم کیں، عمدہ طریقہ سے ان کی بساط بچھائی ان حضرات نے اس علم کا نام فروع اور فقہ رکھا۔

ایک طبقہ نے پہلی امتوں کے قصص اور گزری ہوئی امتوں کے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے اوران کے احوال نقل کیے ہیں، ان کے آثار وو قائع کو مدوّن کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے ابتدائے دنیا کا ذکر تک کیا ہے، سب سے پہلے کون سی چیز وجود میں آئی اس کا بھی ذکر کیا ہے، اس علم کا نام تاریخ اور علم قصص رکھا گیا ہے، کچھ ارباب علم نے اس میں موجود حکمتوں، عبرت ناک واقعات اور مواعظ کا تذکرہ کیا ہے جو انسانی دلوں پر دستک دیتے ہیں، ایسے عبرت ناک واقعات اور مواعظ جو پہاڑوں کو گرا کر سطح زمین کے ساتھ برابر کردیں، اہل علم نے انہی میں سے وعدہ، وعید، تحذیر (لوگوں کو دوزخ سے ڈرانا) تبشیر (جنت کی خوشخبری سنانا) ذکر موت، یاد آخرت، قبروں سے اٹھنے اور میدان محشر میں جمع ہونے، حساب کتاب، جزا وسزا اور جنت ودوزخ کے تذکرے میں فصلیں قائم کی ہیں، زواجر کی فصلیں قائم کی ہیں، ان کا نام خطباء اور وعاظ ہے۔

اہل علم وفضل کے ایک گروہ نے قرآن کریم میں سے اُصولِ تعبیر کا استنباط کیا ہے، یہ اصول انہوں نے سورۃ یوسف میں موجود حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں موجود موٹی گائیوں، رویائے یوسفی میں موجود ارباب زِنداں کے خوابوں، آفتاب، ماہتاب اور ستاروں کو خواب میں سجدہ کرتے دیکھا، ان سے انہوں نے اس علم کا استنباط کیا ہے، ہر خواب کی تعبیر انہوں نے کتاب سے پیش کی ہے، اگر انہیں یہاں مشکل پیش آئی تو انہوں نے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خوابوں کی تعبیر بیان کی، کیونکہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی شرح ہے، اگر یہاں بھی مشکل پیش آئی تو حکم وامثال سے

تعبیریں بیان کیں، پھر اپنے مخاطبات میں عوامی اصطلاحات اور عرفِ عام سے خوابوں کی تعبیریں بیان کیں، جن کی طرف قرآن کریم نے وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ سے اشارہ کیا ہے، کچھ لوگوں نے قرآن کریم کی آیات المواریث سے میراث میں وارثوں کے حصص کا استنباط کیا ہے، اس علم کا نام علم الفرائض رکھا گیا، ان لوگوں نے آیات میراث سے نصف، ثُلث، ربع، سُدس اور ثمن کا میراث میں حساب لگایا ہے، خاندانی مسائل کا ذکر کیا ہے، وصیتوں کے احکامات کا استخراج واستنباط کیا ہے۔

اہلِ علم وعرفان کے ایک طبقہ کی نگاہ صرف اس بات پر مرکوز رہی کہ انہوں نے گردش شام وسحر، آفتاب، ماہتاب کی منزلیں، ستارگانِ فلک اور برجوں پر کام کیا، ایسی محنت وجانفشانی سے کام لیا کہ انہوں نے انہی میں غور وفکر کرتے ہوئے اوقات مقرر کیے، شعراء اور اہلِ فن نے قرآن کریم میں نگاہیں مرکوز کیں تو انہوں نے اس کے الفاظ کی عمدگی، نظم کے نرالے پن، سیاق کے حسن، مبادی ومقاطع، اسلوب خطاب کی تبدیلی، مطالب، معانی، مفاہیم سے زائد الفاظ اور اختصارِ کلام سے علم معانی، علم بیان اور علم بدیع کا استنباط کیا۔

ارباب اِشارات اور اَصحاب حقیقت نے جب اپنی گہری نظریں قرآنی الفاظ، معانی اور اس کے دقائق پر مرکوز کیں تو انہوں نے انہیں ایسے نشانات بنادیا جن پر اصطلاحات کی عمارت کھڑی کی گئی، جیسے فناء، بقاء، حضور، خوف، ہیبت، انس، وحشت، قبض اور بسط اور ان کے ساتھ ملتے جلتے نشانات، یہ وہ فنون ہیں جن سے ملت اسلامیہ نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

قرآن کریم میں اوّلین کے دیگر علوم بھی شامل ہیں، جیسے طب، جدل، ہئیت، ہندسہ، جبر، مقابلہ اور علم نجوم وغیرہ، رہی طب تو اس کا مدار نظام صحت کی حفاظت اور قوت کے اِستحکام پر ہے اور صحت متضاد کیفیات میں مزاج کے اعتدال سے قائم رہتی ہے، اگر قرآن کریم کی طرف توجہ کی جائے تو اس نے علم طب کو صرف اس ایک جملہ وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا میں جمع کر دیا ہے، ہمیں صحت کی خرابی کے بعد اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ صحت کے لیے نظام اِعتدال کس قدر مفید ہے، بدن کی بیماری

کے بعد شفاء کے حصول کے لیے ہمیں قرآن کریم بتاتا ہے کہ شفاء کس سے ملے گی، قرآن کریم کی سورۃ النحل بتاتی ہے شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ. قرآن کریم بدن کی بیماری کے بعد دلوں کی بیماری کا علاج بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ اس میں دلوں کی شفاء ہے۔

علم ہیئت کی طرف نگاہ دوڑائیے، کتنی ہی سورتوں کے بین السطور اور آیات کے حواشی میں آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان عالم علوی اور سفلی میں مخلوقات ہیں ان کا ذکر ہے، علم ہندسہ کو انْطَلِقُوا إِلَى ظِلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ میں ملاحظہ کیجیے، علم جدل کو دیکھیے کہ کتنی آیات نے براہین، مقدمات، نتائج اور بہت سی اشیاء کا ذکر ہے، علم مناظرہ کو دیکھیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو کس طرح شکست فاش دی، اسی سے علم مناظرہ کی بنیاد پڑی۔

پورے قرآن کریم پر عمیق نگاہ ڈالتے جائیے، اس بحر کی موجوں میں تیرتے جائیے، اس سمندر کی تہہ میں اترتے جائیے خود ہی اندازہ ہوتا جائے گا کہ واقعی یہ معجز نما کتاب ہے، کسی انسان کے بس میں نہیں کہ اس جیسا کلام لائے، یہ واقعی علوم و معارف کا موجزن دریا ہے، یہ علوم و معارف کا بحر ناپیدا کنار ہے، کسی انسانی بساط میں نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکے یا قرآنی چیلنج کا جواب دے سکے۔

علم جبر، علم مقابلہ، ایام، سال، امم سابقہ کی تاریخ، اس امت کے باقی رہنے کی تاریخ، مدت دنیا کی تاریخ، کتنی گزر چکی اور کتنی باقی ہے، علم نجوم، صنائع بدائع، خیاطہ، حدادہ، تعمیرات، پیشہ نجاری، غزل، نسج، فلاحت، شکار، غوطہ زنی، صیاغت ورنگریزی، زجاجت ومصباح سازی، فخاری وملاحت، کتابت، خبازی، طباخی، غسل وقصارت، جزارت، بیع وشراء، چٹانوں میں نقاشی، کیلی، موزونی، عددی، تیر اندازی، مسلح تیاری، اسماء الآلات، اقسام ماکولات ومشروبات، مناکحات، حساب کتاب کی گنتی، جمع، تقسیم، ضرب، مضاعف، تالیف، تصنیف، مناسبت، حتی کہ جو کچھ کائنات میں ہے قرآن کریم میں اس کائنات کے بنانے والے اور قرآن کریم اتارنے والے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی

نہیں چھوڑی ہے۔ یہی قرآن کریم کی اعجاز کی ایک واضح دلیل ہے، اس کتاب میں الفاظ قلیل اور معانی کثیر پائے جاتے ہیں، انسانی عقلیں انہیں شمار کرنے سے قاصر وعاجز ہیں، دنیوی آلات ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، اس طرف اللہ تعالیٰ نے ان سنہری کلمات وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ میں اشارہ فرمادیا ہے۔

قرآن کریم وہ چاند ہے جب چاندنی بکھیرتا ہے تو ہر دیکھنے والی آنکھ اسے دیکھ لیتی ہے، قرآن مجید ایسا آفتاب عالمتاب ہے جس کی عالمگیر کرنیں جب بکھرتی ہیں تو مشارق ومغارب کو اپنی شعاعوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

كَالْبَدْرِ مِنْ حَيْثُ الْتَفَتَّ رَأَيْتَهُ ... يُهْدِي إِلَى عَيْنَيْكَ نُورًا ثَاقِبًا

كَالشَّمْسِ فِي كَبِدِ السَّمَاءِ وَضَوْءُهَا ... يَغْشَى الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَّمَغَارِبًا

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ اے موسیٰ! آسمان سے اتاری گئی کتابوں میں کتاب احمد (قرآن کریم) کی حیثیت اس برتن کی ہے جس میں دودھ رکھا گیا ہو، جب بھی آپ اسے بلوئیں گے تو مکھن نکال لیں گے۔ (ابو نعیم، معرکۃ الاقران فی اعجاز القرآن) حضرت قاضی ابو بکر بن عربی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب قانون التاویل میں اور امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں قرآن کریم کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ ہزارہا علوم کا مجموعہ ہے، لیکن تمام شمار کنندگان کی بے بسی کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ کوئی ان علوم ومعارف کو شمار نہیں کر سکتا، کوئی ان کی گنتی نہیں کر سکتا، ان کی اصل تعداد ایک اللہ ہی کی ذات ہے جو جانکار ہے، ہاں علوم قرآنی کی تکمیل تین علوم سے ہوتی ہے، ان میں ایک توحید ربانی ہے، دوسرا تذکیر اور تیسرا احکام۔

توحید میں مخلوقات کی معرفت، اللہ تعالیٰ کے اسماء، اس کی صفات اور اس کے افعال داخل ہیں، تذکیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق کے ساتھ کیے گئے وعدے، مخلوق کی طرف سے نافرمانی اور سرکشی کی صورت میں وعیدات داخل ہیں، ظاہر وباطن کا تصفیہ بھی اس میں داخل ہے، جب کہ

احکام میں مکلفین کے احوال، نافع اور ضار، امر و نہی، مستحب و مندوب سب داخل ہے، سورۃ الفاتحہ کو اسی لیے اُمّ القرآن کہا گیا ہے کیونکہ اس میں یہ تینوں اقسام شامل ہیں، جب کہ سورۃ الاخلاص کو تہائی قرآن کریم کہا گیا ہے کیونکہ اس میں ان تین اقسام میں سے ایک قسم توحید والی پائی جاتی ہے۔

علامہ عزالدین بن عبد السلام رحمہ اللہ اپنی کتاب الامام فی ادلۃ الاحکام میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی اکثر آیات ایسی ہیں جو آداب حسنہ اور اخلاق جلیلہ پر مشتمل ہیں، پھر قرآن کریم کی کچھ آیات ایسی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ احکام بیان کیے گئے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں بطریق استنباط احکام بیان کیے گئے ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب معرکۃ الاقران فی اعجاز القرآن میں اعجاز قرآنی کی وجوہات کے ذیل میں بہت ہی خوبصورت اور فرحت انگیز تحریر پیش کی ہے۔

② محفوظیت کامل: قرآن کریم کا کامل محفوظ ہونا اس کا اعجاز ہے، قرآن کریم زیادت اور نقصان سے محفوظ کتاب ہے، تبدل و تغیر سے محفوظ صحیفہ آسمانی ہے، اتنا طویل ترین زمانہ گزرنے کے باوجود اس میں آج تک کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی اور یہ امتیازی شان اسی کتاب الٰہی کا حاصل ہے، باقی کتب سماویہ میں تغیر و تبدل اور تحریف کی گئی ہے، اس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے، مگر قرآن کریم کی شان اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جبریل امین علیہ السلام کے ذریعے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اتارا، ان کے سینے میں محفوظ فرمایا اور قیامت تک اس کی حفاظت اپنے ذمہ لیتے ہوئے واضح ارشاد فرمایا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، ہم ہی نے اس ذکر (قرآن کریم) کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اُستاذِی المکرم علامہ خالد محمود سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں اگر کوئی کتاب اتنی ضخامت کے باوجود ابتدائے ظہور سے آخر تک ایک جم غفیر میں محفوظ رہی ہے تو وہ صرف قرآن کریم ہے، جس طرح اس مقدس کتاب نے علم و ادب کے بڑے بڑے نمایندوں کو اپنی نظیر

پیش کرنے سے عاجز کر دیا، اسی طرح اس کی بے مثل حفاظت بھی تاریخ کو اپنی مثال پیش کرنے سے عاجز کرتی ہے۔ (آثار التنزیل ج ا ص ۴۰۹)

③ حسن تالیف، ترکیب کلمات، فصاحت وبلاغت: عرب لوگ کلام کے شہسوار تھے، زبان دان، قادِرالکلام تھے، وہ الفاظ جوڑنے میں مہارت رکھتے تھے، کلمات کی تراکیب پر ید طولیٰ رکھتے تھے، بڑے فصیح، بلیغ، ادیب اور انشاء پرداز تھے، قرآن کریم جب رحمت دوعالم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوا تو یہ عربوں کے اُسلوب نگارش اور اُسلوب بیان سے بالکل مختلف تھا، ان کے نظم ونثر کی طرز کے بالکل مخالف تھا، جس کی نظیر اس سے پہلے بھی نہیں تھی اور اس کی مثال اس کے بعد بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد وضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے جو شعر سے کہیں زیادہ حلاوت اور لطافت کا حامل ہے، انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک ایسی لذت اور حلاوت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوتی، اگر آپ اس لذت اور حلاوت کے سبب پر غور فرمائیں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا راز درحقیقت لفظوں کی اس ترتیب میں مضمر ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، عربی، فارسی اور اردو کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جب ایک ہی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑتے ہیں تو اس سے ذوق سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے اور پھر جب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل ہو جاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر مصرعوں کے بیچ بیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرفی اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہو جائے جیسا کہ مرصع اشعار میں ہوتا ہے تو یہ لذت اور بڑھ جاتی ہے۔ (علوم القرآن للشمانی)

قرآن کریم نثر ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے اور صرف اہل عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اسے سن کر معمولی لذت اور تاثیر محسوس کرتے ہیں، یہیں سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض کفار عرب نے قرآن کریم کو کس بناء پر شعر قرار دیا تھا؟

ظاہر ہے کہ شعر کی معروف تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی اور کفار عرب اپنی ہزار گمراہیوں کے باوجود اتنی حس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں تمیز کر سکیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لیے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے، جو قرآن کریم میں مفقود ہے، اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم کو شعر اس بناء پر قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انہوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وزن اور قافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجدان کے لیے وہ جمالیاتی لذت بدرجہ اتم موجود ہے جو اوزان و قوافی کی جکڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ (علوم القرآن للعثمانی)

④ آیات قرآن میں مناسبت اور باہمی ربط: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس کی سورتوں اور آیات کے درمیان مناسبت اور باہمی ربط ہے، خواہ مضامین متعدد ابواب اور مختلف موضوعات کے ذکر کیے جارہے ہوں لیکن اس کے باوجود ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ گویا ایک لڑی میں نہایت ہی لطیف ترتیب اور تناسب کے ساتھ یہ تمام موتی پروئے ہوئے ہیں، دنیا حیران اور عاجز ہے کہ کیسی خوبی اور لطیف پیرائے کے ساتھ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف کلام منتقل ہو رہا ہے اور پھر مزید خوبی یہ کہ ان مضامین متعددہ و مختلفہ کے لیے نہ ابواب باندھے جارہے ہیں اور نہ فصول قائم کی جارہی ہیں باوجودیکہ تیئیس برس کی مدت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف اوقات واحوال اور مقامات میں یہ قرآن نازل ہوا لیکن ربط و مناسبت از اول تا آخر برابر قائم ہے، یہ دوسری بات ہے کہ یہ مناسبت و ربط کسی مقام پر لطیف ہو اور سطحی نظر رکھنے والوں کو اس کا احساس یا اس کی خوبی کا علم نہ ہو۔ (منازل العرفان ص ۳۳۶)

مناسبت لغت میں باہمی مشاکلت اور مقاربت کو کہا جاتا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ متعدد آیات کو ایک معنٰی اور ایک ہی غرض کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا جائے کہ وہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی معلوم ہونے لگیں اور اس غرض و مضمون کے واسطے ان میں سے ایک ایک جملہ ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے اور استحکام و تکمیل کا باعث ہے۔ (منازل العرفان) اس طرح قرآن کریم نے اپنے نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے، بہت سے علماء کرام نے قرآن کے نظم کی توضیح کے لیے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ (علوم القرآن للعثمانی)

⑤ لفظی اعجاز: قرآن کریم میں لفظی اعجاز بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اس میں ایک مفہوم کے لیے معمولی معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لیے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے جو عبارت کے سیاق، معنٰی کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، زمانہ جاہلیت میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے۔

مثلاً ① مَوتٌ ② هِلَاكٌ ③ فِنَاءٌ ④ حَتفٌ ⑤ شَعُوبٌ ⑥ حِمَامٌ ⑦ مَنُونٌ ⑧ سَامٌ ⑨ قَاضِيَةٌ ⑩ هَمِيغٌ ⑪ نَيطٌ ⑫ قَودٌ ⑬ مِقدَارٌ ⑭ جَبَازٌ ⑮ قَيتَمٌ ⑯ حَلَّاقٌ ⑰ طَلَاطِلُ ⑱ طَلَاطِلَةٌ ⑲ عَولٌ ⑳ ذَامٌ ㉑ كَفتٌ ㉒ جَدَاعٌ ㉓ حُزرَةٌ ㉔ خَالجٌ

لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہل عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، چونکہ وہ لوگ معاد و آخرت اور حساب و کتاب کے قائل نہیں تھے، اس لیے انہوں نے

موت کے لیے جتنے نام تجویز کیے ان سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے، باطل نظریہ سے کسی درجہ میں موافقت کا شبہ ہو سکتا تھا۔

چنانچہ جس جگہ موت کی حقیقت بیان کرنی تھی، وہاں موت کے مفہوم کے لیے قرآن نے مذکورہ چوبیس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے اور وہ لفظ ہے تَوَفّٰی جس کے لغوی معنیٰ کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا۔ اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے ان میں دوبارہ روح کو لوٹا سکتا ہے، موت کے لیے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا (یتیمۃ البیان للبنوری، علوم القرآن للعثمانی)

⑥ وجوہ باعتبار مقاصد: قرآن کریم مقاصد کے اعتبار سے بھی درجہ اعجاز رکھتا ہے، مقاصد قرآن مبدء و معاد کی تحقیق انسان کے معاد و معاش کی بہتری، دنیا و آخرت کے فلاح و نجاح کے اصول، اصلاح عقائد اعمال و اخلاق اور معاملات کے طریقے، صانع عالم اور خالق کائنات کی معرفت اس کی ربوبیت و توحید کی تعلیم، دلائل نبوت کا بیان اور یہ کہ خالق حقیقی کی اطاعت انسانی فطرت کا صحیح تقاضا ہے جس فطرت سلیم پر انسان کی تخلیق ہے، عبادت و بندگی کی ترغیب اور نافرمانی پر وعید، دنیا کی بے ثباتی، جزا و سزا کا معیار غرض ان مقاصد کو قرآن نے ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ ادا کیا ہے کہ دنیا کا کوئی بلیغ سے بلیغ کلام ایسے پاکیزہ مؤثر اور محیر لعقول تعبیرات کے ساتھ ادا کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔

قرآن نے مقاصد کو کہیں ایجاز و اختصار اور کہیں تفصیل و توضیح اور کسی جگہ تمثیل و تشبیہ اور کنایات اور کسی مقام پر دلائل و براہین کے انداز میں کچھ اس طرح سے بیان کر دیا ہے کہ عقل و انصاف سے نظر کرنے والے مخاطبین کے لیے ایک ایک آیت ہی قلب و دماغ کو ان مقاصد

کے رنگ میں رنگ دینے کے واسطے بہت کافی ہے، مثلاً ایک مقام پر ارشاد فرمایا حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو نقل کرتے ہوئے جب کہ وہ اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کو سمجھا رہے ہیں

يَاصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (یوسف ۴۰)

کہ اے میرے دونوں قید خانہ کے ساتھیو! بتاؤ کہ متفرق اور بہت سے معبود بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار؟ نہیں عبادت کرتے ہو تم اس معبود حقیقی کو چھوڑ کر کسی کی بجز چند ناموں کے کہ جن کو تم نے اور تمہارے آباء نے تجویز کر لیا ہے کہ جس کے واسطے نہیں نازل کیا اللہ نے کسی برہان و دلیل کو، شان حاکمی صرف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے حکم کیا کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور کسی کی (یہی توحید خداوندی) دین قیم ہے۔ ان کلمات میں توحید ربوبیت کے اثبات کے ساتھ ابطال شرک کیا گیا اور یہ ظاہر فرمادیا گیا کہ فرضی معبودوں کی پرستش مقتضائے عقل اور فطرت کے خلاف ہے ربوبیت و معبودیت کے ساتھ شان حاکمیت بھی صرف خدا کے لیے ہے اور صحیح راستہ فلاح و کامیابی کا اسی دین کی اطاعت و پیروی ہے۔ (منازل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۳۱، ۳۳۰)

⑦ مضادت و تقابل: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس میں مضادت اور تقابل کا پایا جانا ہے، مضادت یعنی ایک چیز کے بیان کے بعد اس کی ضد کا بیان کرنا تاکہ اس تقابل اور تضاد سے اس کی پوری حالت منکشف ہو جائے جیسے سورۃ البقرہ میں هُدًى لِلْمُتَّقِينَ کی آیات میں اہل ایمان ان کے اوصاف اور دنیا و آخرت میں ان کی نیکیوں کے ثمرات بیان کرکے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سے کفار و منکرین اور منافقین کے احوال، ان کی برائیاں اور آخرت میں ان کے اعمال بد کی سزائیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ (منازل العرفان ص ۳۴۰)

⑧ استطراد: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس میں استطراد کا پایا جانا ہے، استطراد یعنی ایک مضمون کی مناسبت سے دوسرا مضمون تبعاً ذکر کر دینا مثلاً یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ (الاعراف ۲۶)، زمخشری بیان کرتے ہیں کہ آیت لِبَاسُ التَّقْوَی استطراد کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ اس سے پیشتر آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور آدم کی اس حالت کا ذکر ہوا کہ وہ لباس کے بجائے درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتے تھے تو اس موقع پر تبعاً و استطراداً حق تعالیٰ نے اپنے انعامات میں نعمت لباس کا ذکر فرمادیا کہ جس سے انسان ستر عورت کر سکے اور زیب وزینت بھی اور لباس صوری وظاہری کی تبعیت میں لباس معنوی اور باطنی بھی بیان فرمادیا، لِبَاسُ التَّقْوَی ذٰلِکَ خَیْرٌ کہ لباس تقویٰ ہی بہترین لباس انسانی ہے۔ (منازل العرفان فی علوم القرآن للکاندھلویؒ ص ۴۱)

⑨ حسن تخلص: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس کا حسن تخلص ہے، حسن تخلص یعنی ایک مضمون کے بیان کے ساتھ دوسرے مضمون مقصود کی طرف ایسے حسن سلوک سے منتقل ہو جانا کہ سامع کو انتقال مضمون کا احساس بھی نہ ہو، قرآن کا یہ طرزِ بیان ایسا عجیب اور محیر العقول ہے کہ اس خوبی اور کمال پر دنیا کے فصحاء وبلغاء حیران ہیں، مثلاً سورۃ اعراف میں انبیاء اور قرون ماضیہ کا تذکرہ چل رہا تھا اس ذیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہو گیا کہ وہ اپنی قوم کے ستر آدمی ہمراہ لے کر کوہ طور پر حق تعالیٰ سے کلام کرنے گئے، جب شرف ہمکلامی حاصل ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے دعا مانگی اُکۡتُبۡ لَنَا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِنَّا ہُدۡنَاۤ اِلَیۡکَ (الاعراف ۱۵۶) کہ اے اللہ لکھ دے ہمارے واسطے بھلائی اس دنیا میں اور آخرت میں بھی۔

اس پر جواب ملا کہ میری رحمت ہر شئ کو گھیرے ہوئے ہے مگر میرا عذاب بھی ہے کہ جس کو چاہوں میں وہ عذاب پہنچادوں تو اس مقام پر قرآن نے کلام کا رخ پھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے مناقب وفضائل بیان کرنے شروع کر دیے کہ اے موسیٰ! یہ رحمت خاصہ جو ہر شئ کو

محیط ہے آپ کی امت کا حصہ نہیں ہے یہ تو ایک آنے والے نبی امی ﷺ کی امت کے واسطے مخصوص ہے جن کے اوصاف و کمالات یہ ہیں

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورۃ الاعراف ۵۶،۵۷)

فرمایا میں اس حسنہ ورحمت خاصہ کو لکھے دیتا ہوں ان کے لیے جو حق تعالیٰ سے ڈرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال قلب ہے) اور صدقہ وخیرات کرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال جوارح ہے) اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہوں گے، یہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہوں گے، یہ لوگ وہ ہوں گے جو اتباع وپیروی کرتے ہوں گے، اس رسول نبی امی کی کہ جن کو یہ اہل کتاب لکھا ہوا پائیں گے، اپنے پاس تورات وانجیل میں جن کی صفت یہ ہے کہ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرمائیں گے اور برائیوں سے انہیں روکیں گے اور ان کے واسطے پاکیزہ چیزیں حلال کریں گے اور حرام کریں گے ان پر خبیث وناپاک چیزیں اور ان سے سخت بوجھ کے احکام دور کریں گے اور وہ جکڑ بندیاں جو ان پر قائم کر دی گئی تھیں، بس جو لوگ ان نبی امی ﷺ پر ایمان لائیں اور ان کی حمایت ومدد کرتے ہوں اور اس نور (ہدایت اور اسوہ نبوی ﷺ کی) پیروی کرتے رہیں جو نازل کیا گیا ان پیغمبر ﷺ کے ساتھ تو بس ایسے ہی لوگ فلاح وکامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اب اس کے بعد کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے بیان کردہ صفات اور نبی امی کی خصوصیات اس مرحلہ پر پہنچ گئیں، فلاح ونجات کا انحصار اتباع محمدی میں کر دیا گیا، فوراً ہی آنحضرت ﷺ کی

طرف سے پیغام نبوت اور اعلان رسالت کا مضمون شروع ہو گیا، قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف ۱۵۸) کہ اے نبی کریم ﷺ کہہ دو کہ اے لوگو! میں اللہ کا پیغمبر ہوں کہ جو تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

میں اس خدا کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے کی اور ہر ایک کی موت وحیات ہے اس لیے بس اسی خدا پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلمات (احکام واوامر) پر ایمان رکھتا ہے اسی کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم راہ راست پر آجاؤ گے، اشارہ گویا یہ فرمادیا کہ اے اہل کتاب! تم اپنے عہد میں تحریفات کر کے گمراہ ہو چکے ہو اور تمہارا اصل مذہب تم سب سے چھوٹ چکا، اب تو اس نبی آخر الزمان ﷺ ہی کے وسیلہ سے تم کو ہدایت مل سکے گی۔

بات چلی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر اپنے قوم کے ستر منتخب افراد لے جانے اور حق تعالیٰ شانہ سے ہم کلام ہونے کی اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنی امت کے حق میں حسنہ کی دعا بارگاہ خداوندی سے اس حسنہ وبھلائی کے لیے امت محمدیہ کا اختصاص اس امت اور اس کے پیغمبر نبی امی کی صفات ذکر الٰہی کی پیروی میں فلاح ونجات کا انحصار یہ سب کچھ بیان ہوتے ہوتے ناگہاں پھر کلام الٰہی شروع ہوتا ہے وَمِنْ قَوْمِ مُوسَى أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (الاعراف ۱۵۹)

کہ موسیٰ کی قوم میں سب کے سب ہی گمراہ مذہب حق سے بھٹکنے والے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کی راہنمائی کرتی ہے اور خود حق پر چلتے ہوئے عدل وانصاف کا طریقہ اختیار کرتی ہے جیسا کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب احبار رحمہ اللہ کہ ایسے حضرات تورات وانجیل کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔

اس حسن تخلص اور استطراد پر غور فرمایئے کہ یہ تمام کلمات موتی ہیں، جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، استطراد اور حسن تخلص میں فرق یہ ہے کہ استطراد میں دوسرے مضمون کے ذکر کے بعد

فوراً ہی اصل مضمون کی طرف پھر کلام لوٹ آتا ہے اور حسن تخلص میں ایک مضمون سے دوسرے کی طرف اس خوبی کے ساتھ کلام کا رخ پلٹتا ہے کہ سامع کو محسوس تک بھی نہیں ہوتا اور دوسرا مضمون اس طور پر مسلسل بیان ہوتا ہے کہ ہر دو مضمون میں ایسا اتحاد اور ارتباط ہوتا ہے کہ مخاطب دونوں کو ایک ہی مسلسل اور مربوط مضمون خیال کرتا ہے۔ (منازل العرفان فی علوم القرآن)

⑩ فواتح و مقاطع سور میں اعجاز: فواتح سے مراد قرآنی سورتوں کی ابتدا اور مقاطع سے مراد قرآنی سورتوں کا اختتام ہے، قرآن کریم میں جس طرح سورتوں کا آغاز کیا گیا یہ اہل بیان و بلاغت کے نزدیک بلاغت کا کمال درجہ ہے، سورتوں کی ابتدا ایسے خوبصورت کلمات والفاظ سے کی گئی جو انسانی کانوں میں رس گھولتے ہیں، الفاظ و کلمات کی دلکشی اور دلفریبی کے باعث سننے والا اس کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انہیں اپنے برتن میں جمع کرتا ہے، کلمات ابتدائیہ کے حسن و جمال کامل کی وجہ سے ان سے منہ نہیں پھیرتا، الفاظ ابتدائیہ اور کلمات میں شیرینی ہے، باریکی ہے، رِقّت ہے، عمدگی ہے، زنجیر کی طرح بندھے ہوئے ہیں، نظم وسبک کے لحاظ سے خوبصورتی ہے، معنٰی کے لحاظ سے درست ترین اور واضح ترین ہیں، تعقید، پیچیدگی، اور نامناسب تقدیم و تاخیر سے خالی ہیں، اسی لیے اہل علم کہتے ہیں کہ سورتوں کے فواتح (ابتدائی کلمات) بہت ہی خوبصورت اور کامل ترین ہیں۔

علامہ محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تلاش و تحقیق سے مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن نے سورتوں کی ابتدا دس قسم سے کی ہے

① حق تعالیٰ کی حمد و ثناء جس کی تعبیر گاہ بگاہ صفاتِ کمالیہ اور محامد کے اِثبات کے ساتھ ہوتی ہے اور کسی مقام پر ہر عیب و نقصان سے تقدیس و تنزیہ کے عنوان سے ہوتی ہے، پانچ سورتوں کو تحمید کے ساتھ شروع کیا۔

② حروف تہجی سے جو انتیس سورتوں کے شروع میں اختیار کیے گئے مثلاً الٓمّٓ، الٓرٰ، الٓمّٓرٰ ③ حروف ندا سے دس سورتوں کو شروع کیا گیا جن میں سے پانچ کو نداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کیا مثلاً سورۃ

احزاب، طلاق، تحریم، مزمل اور سورۃ مدثر اور پانچ کو بنداء امت شروع کیا گیا، سورۃ نساء، مائدہ، حج، حجرات اور ممتحنہ۔ ④ تئیس سورتوں کو جملہ خبریہ سے شروع کیا۔

⑤ پندرہ سورتوں کو قسم سے شروع کیا، ایک میں ملائکہ کی قسم ہے وَالصَّافَّاتِ صَفًّا اور دو میں آسمانوں کی وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ اور چھ میں ان کے لوازم کی وَالنَّجمِ وَالفَجرِ، وَالشَّمسِ وَاللَّیلِ، وَالضُّحیٰ، وَالعَصرِ اور دو میں ہوا کی جو ایک عنصر ہے وَالذَّارِیَاتِ وَالمُرسَلَاتِ وَالطُّورِ میں زمین کے ایک جز کی جو پہاڑ ہے، وَالتِّینِ میں نبات کی، وَالنَّازِعَاتِ میں حیوان ناطق یا ایک قسم کے ملائکہ کی، وَالعٰدِیَاتِ میں حیوانات میں سے ایک نوع خاص یعنی گھوڑوں کی۔

⑥ عنوان شرط سے سات سورتیں شروع کی گئیں، اِذَاوَقَعَتِ الوَاقِعَۃِ، اِذَاجَاءَكَ المُنَافِقُونَ، تَکوِیر، اِنفِطَار، اِنشِقَاق، زلزلہ اور اِذَا جَاءَ نَصرُ اللہ۔

⑦ صیغہ امر چھ سورتوں کے شروع میں لایا گیا قُل اُوحی، اِقرا، قُل یَاأَیُّھَا الکَافرون، قُل ھُوَاللہ اَحد، قُل اَعُوذُبِرَبِّ الفَلَق، قُل اَعُوذُبِرَبِّ النَّاس۔

⑧ صیغہ استفہام چھ سورتوں کے شروع میں، ھَل اَتَی عَلَی الاِنسَانِ عَمَّ یَتَسَاءَلُونَ، ھَل اَتَاكَ حَدِیثُ الغَاشِیَۃِ، اَلَم نَشرَح، اَلَم تَرَ، اَرَاَیتَ۔

⑨ تین سورتوں کے شروع میں وَیلٌ لِّلمُطَفِّفِینَ، وَیلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ، تَبَّت یَدَا اَبِی لَھَبٍ

⑩ ایک سورت تعلیل کے ساتھ، لِاِیلٰفِ قُرَیشٍ۔ کلام اللہ کی سورتوں میں اختیار کردہ مضامین کے ساتھ فواتح سور کی مناسبت کے لیے ایک دو مثال بیان کر دینا کافی ہے، مثلاً سورۃ کہف جس کے شروع میں اَلحَمدُللہِ الَّذِی ہے اس میں چند باخدا لوگوں کے واقعات ہیں، اصحاب کہف کا اور دو شخصوں کا جنہوں نے بڑا سرمایہ صرف کر کے باغ بنایا پھر ان میں سے ایک کے غرور اور کفرانِ نعمت کی وجہ سے اس کے باغ پر تباہی اور بربادی آئی اور دوسرے کے باغ میں اس کی خداترسی

اوراطاعت ونیکوکاری کی وجہ سے خیر وبرکت ہوئی، موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے ذکر میں یہ ہے کہ نیکوکارلوگ اوران کے پسماندگان مصائب سے محفوظ رہتے ہیں، دنیا میں بھی ان کو نیکی کا پھل ملتا ہے اورآخرت میں بھی۔

ذوالقرنین کاواقعہ ہے جس کو خدا نے نیکوکاری اور تقویٰ کی بدولت ہر قسم کے سامان عطا کیے اوروہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی خداپرست رہا، مظلوموں کی حمایت کی کہ ایک دیوار بنا کر یاجوج ماجوج کوروک دیا، مختلف مواقع میں دارِ آخرت اور نیکوکاری کے ثمرات نافعہ اوراس کے بالمقابل برائی کے دنیاوآخرت میں برے انجام کا بھی بیان ہے، ایسے واقعات گزشتہ کابیان جن کو دنیا کی کوئی تاریخ اس تحقیق وتفصیل سے نہیں بتاتی، ان حقائق ومعارف کے ساتھ خدا کی ایک بڑی نعمت ورحمت ہے جو قرآن کے ذریعے بندوں پر پہنچی، اس لیے اس کے مطلع (افتتاح) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا لے آنا گویا سورت کے تمام مضامین کاعنوان شروع ہی میں قائم کردیناہے۔ (منازل العرفان للکاندھلوی)

اسی طرح سورہ فاتحہ (جو قرآن کی اول سورۃ اورام القرآن ہے) کے شروع میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لایا گیا کیونکہ قرآن کریم کے جو اہم مقاصد ہیں وہ اس میں بالاجمال جمع کردیے گئے جن کی تفصیل باقی تمام سورتوں میں ہے اور یہ چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر بڑی نعمت ہے جس پر حمد کرنا مناسب بلکہ حق شناسی ہے، اسی لیے ابتداً اَلْحَمْدُ لاکر اشارہ اجمالی کردیا کہ اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوگا وہ سراپا نعمت ورحمت ہی ہوگا۔ (البیان فی علوم القرآن، منازل العرفان فی علوم القرآن)

فواتح کی طرح مقاطع (سورتوں کا اختتام) بھی بہت خوبصورت ہے، بلاغت کی اقسام میں سے ہے، حسن وجمال میں مقاطع بھی فواتح کی طرح ہیں، یہی وجہ ہے کہ انوکھے معانی پر مشتمل ہیں، باوجودیکہ سورتوں کے اختتام پر سننے والے کواندازہ ہورہا ہوتا ہے کہ اب سورت مکمل ہورہی ہے،

پڑھنے اور سننے والے کا شوق مزید بڑھتا ہے، اس سورت کے خاتمہ کے بعد کون سا مضمون شروع ہو گا قاری اور سامع دونوں کا اشتیاق اس کی طرف بڑھتا ہے۔

سورتوں کے اختتام پر دعائیں اور وصایا، فرائض، تحمید، تہلیل، مواعظ، وعد و وعید کا تذکرہ ہوتا ہے، سورۃ فاتحہ کے اختتام ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس کے خاتمہ سے اہم مطلوب اعلیٰ درجے کے ایمان کو محفوظ رکھنا ہے، اپنے کو گناہوں اور برائیوں سے بچانا ہے، جو اللہ کے غضب کا سبب ہیں، جو گمراہی کا سبب ہیں، ان سب چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا۔

انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہونے کی دعا ہے جو اہل ایمان ہیں، اسی لیے انعام کو مطلق بیان کیا مقید نہیں کیا تاکہ تمام انعامات کو شامل ہو، کیونکہ جن پر اللہ تعالیٰ انعام کرتے ہیں ان پر تمام نعمتوں کا انعام ہوتا ہے، کیونکہ ایمان تمام نعمتوں کا سبب ہے، پھر ان کو غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کے ساتھ متصف کیا۔

سورۃ البقرہ کا اختتام ایسی دو آیتوں پر کیا جن میں دعا ہے، سورۃ آل عمران کا خاتمہ وصایا پر کیا، سورۃ النساء کا خاتمہ میراث کے مسائل پر کیا، سورۃ المائدہ کا اختتام موت کے احکامات پر کیا، موت کا ذائقہ چونکہ ہر انسان کو چکھنا ہے، سورۃ الانعام کا خاتمہ وعدہ و وعید پر کیا، سورۃ الاعراف کا خاتمہ بندگان خدا کو عبادت پر ترغیب دینے پر کیا، سورۃ الانفال کا خاتمہ جہاد اور صلہ رحمی پر کیا۔

سورۃ التوبہ کا اختتام نبی کریم ﷺ کی تعریف و ستائش اور آپ ﷺ کی مدح سرائی پر کیا، سورۃ یونس کا اختتام نبی کریم ﷺ کو تسلی دینے پر کیا، اسی طرح سورۃ ھود کا خاتمہ ہے، سورۃ یوسف کے اختتام پر قرآن کی توصیف و مدح کی ہے۔

سورۃ الرعد کا اختتام ان لوگوں کے رد پر کیا جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تکذیب کی اور جنہوں نے نبی ﷺ کے پیغام کو جھٹلایا، سورۃ ابراہیم کا اختتام اس پر کیا کہ دین کا پیغام لوگوں تک

پہنچانا، اسی طرح سورۃ الاحقاف کا خاتمہ کیا، اسی طرح سورۃ الحجر میں ایسے کلمات لائے گئے واعْبُدْ رَبَّكَ حتى يَأْتِيكَ اليَقين جو موت کی تفسیر ہیں اور یہ انتہائی درجہ کی براعت ہے۔

سورۃ الزلزلہ کا آغاز احوال قیامت سے کیا جب کہ اس کا اختتام عمل پر توجہ دلانے والے ان کلمات سے کیا فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، سورۃ النصر کا خاتمہ ایسی عبارت سے کیا جو اشارہ دیتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت کا وقت آن پہنچا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی موافقت کی۔

قرآن کریم کا اختتام دو ایسی سورتوں (الفلق، الناس) سے کیا جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے اوپر دو ایسی سورتیں اتاری گئی ہیں جن کی مثل کبھی دیکھی نہیں گئی، جس طرح سورت فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ اس جیسی سورت نہ تورات میں اتاری گئی اور نہ ہی انجیل میں اور نہ ہی قرآن کریم میں کوئی دوسری سورت ہے، تو ان دو سورتوں سے اس لیے اختتام کیا کہ ان جیسی دو سورتیں دیکھی نہیں گئیں، گویا کہ کلام اللہ کی ابتدا بھی حسین و جمیل سورت سے کی گئی اور خاتمہ بھی احسن انداز میں کیا گیا، خطبوں اور قصیدوں میں کلام کی جو انواع واقسام بیان کی جاتی ہیں ان میں حسن اِفتتاح اور حسن خاتمہ کی طرف بڑی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی تلاوت شروع کرنے والے کو حکم دیا گیا کہ وہ اعوذ باللہ پڑھے، تو خاتمہ معوذتین سے کیا گیا، تاکہ ابتدائے کلام اور اختتام کلام دونوں مقامات پر شیطان سے پناہ مانگی جاسکے، گویا کہ استعاذہ کلام کی دونوں اطراف کو شامل ہے، تاکہ قاری ابتدائے کلام اور انتہائے کلام دونوں مقامات پر شیطانی داؤ پیچ سے محفوظ رہے۔

⑪ طرز تخاطب کا اعجاز: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس کا طرز تخاطب ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا طرز خطاب اور اس کے انواع واقسام ائمہ مفسرین کے نزدیک نہایت اہم موضوع رہا ہے، قرآن کریم کی خصوصیات خطاب میں

دیگر اسباب بلاغت مثلاً مجاز، اِستعارہ، کنایہ اور تشبیہ و تمثیل نیز تمام اقسام بدیع کا جمع ہونا ہی ہے جن کا استعمال قرآن میں نہایت ہی خوبی و کمال کے ساتھ ہوا ہے۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے کتاب النفیس میں قرآن کریم میں خطاب کی پندرہ وجوہ اور کچھ اہل علم نے تیس سے زیادہ وجوہ خطاب قرآن بیان کیے ہیں ① خطاب عام اس سے عموم مراد ہے جیسے اَللّٰهُ الَّذِی خَلَقَكُم ② خطاب خاص اس سے خصوص مراد ہوتا ہے جیسے أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ اور يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ

③ خطاب عام جس سے مراد خصوص ہوتا ہے جیسے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ ④ خطاب خاص جس سے مراد عموم ہوتا ہے جیسے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ میں افتتاح خطاب نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوا ہے اور مراد تمام وہ لوگ ہیں جو کہ طلاق کے مالک ہوں اور ارشاد ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ ابو بکر صیرفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابتدائے خطاب آپ ﷺ کے لیے تھا جب موھوبہ کے بارے میں خَالِصَةً لَكَ فرمایا تو اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس سے پہلے والا خطاب آپ ﷺ کے لیے بھی ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔

⑤ خطاب جنس جیسے ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ ⑥ خطاب نوع جیسے فرمایا يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ

⑦ خطاب عین جیسے وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ۔ يَا نُوحُ اهْبِطْ۔ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ۔ يَا مُوسَى لَا تَخَفْ۔ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ جب کہ پورے قرآن کریم میں حضرت نبی کریم ﷺ کی تعظیم تکریم اور تخصیص کے لیے اور مسلمانوں کو ادب سکھانے کے لیے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے نام کے ساتھ نہ پکارا جائے کسی بھی مقام پر يَا مُحَمَّدُ نہیں فرمایا بلکہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ فرمایا۔

⑧ خطاب مدح جیسے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اور وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا کے ساتھ اہل مدینہ کو خطاب کیا گیا، حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تم لوگ قرآن کریم میں جو یہ

پڑھتے ہو تورات میں یَأَیُّهَا الْمَسَاکِین ہے (ابن ابی حاتم) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا سنو تو خوب کان لگا کر سنا کرو کیونکہ وہ کوئی بہتری ہے جس کا حکم دیا جارہا ہے یا کوئی خرابی ہے جس سے منع کیا جارہا ہے۔

⑨ اخطاب الذم جیسے یَا أَیُّهَا الَّذِینَ کَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ اور قُلْ یَا أَیُّهَا الْکَافِرُونَ چونکہ یہ خطاب اہانت کو شامل ہے اس لیے ان دونوں مذکورہ جگہوں کے علاوہ قرآن کریم میں کسی دوسرے مقام پر آیا ہی نہیں اور مواجہت (رودررو) کے اعتبار پر زیادہ تر یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کے ساتھ خطاب آیا ہے، جب کہ کافروں سے اعراض اور منہ پھیرتے ہوئے صیغہ غائب کے ساتھ خطاب کیا گیا جیسے ارشاد ہے إِنَّ الَّذِینَ کَفَرُوا۔ قُلْ لِلَّذِینَ کَفَرُوا

⑩ خطاب کرامت جیسے یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ۔ یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہم جس موقع میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خطاب ہو نالائق نہ ہو وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خطاب ہوتا دیکھتے ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس، عام تشریع کے حکم میں یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ مِنْ رَبِّكَ اور خاص تشریع کے مقام میں یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ وارد ہوا ہے اور گاہے تشریع عام کے مقام میں بھی نبی کے ساتھ شارع کو تعبیر کیا گیا ہے مگر اس حالت میں جب کہ وہاں ارادہ عموم کا قرینہ بھی پایا جاتا ہے مثلاً یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ اور طَلَّقْتَ نہیں فرمایا۔

⑪ خطاب اہانت جیسے فَإِنَّكَ رَجِیمٌ۔ اخْسَأُوا فِیهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ⑫ خطاب تہکم جیسے ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِیزُ الْكَرِیمُ ⑬ خطاب جمع لفظ واحد کے ساتھ جیسے یَا أَیُّهَا الْأِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیمِ ⑭ خطاب واحد لفظ جمع کے ساتھ جیسے یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ سے لے کر فَذَرْهُمْ فِی غَمْرَتِهِمْ تک، اس میں اکیلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کیونکہ نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی اور نبی تھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوا یا ہوگا۔

اسی طرح اللہ کا فرمان ہے وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا اس آیت میں اکیلے نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلاَّ بِاللّٰهِ ہے، اسی طرح اللہ کا یہ فرمان فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا ہے اس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان قُلْ فَأْتُوا ہے، اس سے تنہا نبی کریم ﷺ ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اور بعض علماء کرام نے اللہ کے اس فرمان قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ کو بھی اسی قبیل میں داخل کیا ہے جس کا معنیٰ ہے ارْجِعْنِي (مجھے واپس کر) اور یہ کہا گیا ہے کہ رَبِّ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ارْجِعُون فرشتوں کے لیے ہے، علامہ سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول اس شخص کا ہے جس کے پاس شیاطین اور دوزخ کا عذاب دینے والے فرشتوں کا مجمع ہوا اور وہ گڑبڑا گیا، چنانچہ پریشانی کے عالم میں اسے اتنا ہوش نہیں رہا کہ وہ کیا کہتا ہے یا اسے کیا کہنا چاہیے اور وہ زندگی میں ایک ایسے امر کا عادی تھا جس کو وہ مخلوق کی طرف ردّ امر کرنے کی قسم سے کہا کرتا تھا۔

⑮ واحد کا خطاب تثنیہ کے لفظ سے جیسے أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ حالانکہ یہ خطاب مالک داروغہ جہنم سے ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے مخاطب دوزخ کے خزانہ دار فرشتے اور وہاں کے عذاب دینے والے فرشتے ہیں، تو اس حالت میں وہ جمع کا خطاب صیغہ تثنیہ کے ساتھ ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دو مؤکل فرشتوں کو خطاب ہے جو اس پر مقرر ہیں، ان کا بیان آیت وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ میں ہے، لہٰذا یہ خطاب بالکل اصل پر ہو گا۔

⑯ تثنیہ کو خطاب لفظ واحد کے ساتھ جیسے ارشاد ہے فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَى یعنی يَا هَارُون

⑰ دو شخصوں کو خطاب لفظ جمع کے ساتھ جیسے أَنْ تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتاً وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً ⑱ جمع کو خطاب لفظ تثنیہ کے ساتھ جیسے پہلے بھی گزر چکا ہے أَلْقِيَا

⑲ واحد کے بعد جمع سے خطاب جیسے وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ ⑳ جمع کے بعد صیغہ واحد سے خطاب جیسے وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ

㉑ واحد کے بعد تثنیہ کے ساتھ خطاب جیسے أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ ㉒ تثنیہ کے بعد واحد کے ساتھ خطاب جیسے فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَى

㉓ معین سے خطاب بحالیکہ غیر مراد ہو جیسے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ یہاں خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہے جب کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت ہے، کیونکہ آپ ﷺ تو بذات خود متقی اور پرہیز گار تھے آپ ﷺ کیونکر کافروں کی پیروی کرسکتے تھے، اسی قبیل سے یہ آیت ہے فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَأُونَ الْكِتَابَ اگر آپ کو اس چیز میں شک ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تو پھر جو قرآن پڑھتے ہیں ان سے پوچھیے، نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے بہت بعید ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے اوپر اتاری جانے والی کتاب میں کسی طرح کا بھی کوئی شک وشبہ ہوتا، ہاں اس میں کافروں کی طرف اشارہ ہے۔

㉔ غیر سے خطاب ہو اور مراد عین خود ہو جیسے ارشاد ہے لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ

㉕ وہ خطاب عام جس سے مخاطب معین مراد نہ ہو جیسے أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ۔ وَلَوْ تَرَى إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ۔ وَلَوْ تَرَى إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُؤُوسِهِمْ کہ ان باتوں سے کسی معین شخص کو خطاب نہیں کیا گیا، بلکہ ہر شخص عام طور پر اس کا مخاطب ہے اور قصد عموم کے لیے خطاب کرنے کی صورت میں یہ مثالیں وارد ہوئی ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کا حال اس حد تک نمایاں اور واضح ہو گیا ہے کہ اب اس کے دیکھنے میں کسی خاص دیکھنے والے کی خصوصیت نہیں رہ گئی اور یہ بات نہیں رہی کہ ایک شخص دیکھتا ہو تو دوسرا نہ دیکھتا ہو بلکہ وہ تمام لوگ جن کی بابت امکان رویت پایا جاتا ہے وہ سب اس خطاب میں داخل ہیں۔

㉖ ایک شخص سے خطاب کرنے کے بعد پھر اس کی جانب سے عدول کرکے دوسرے کو مخاطب بنا لینا، جیسے فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ یہاں نبی کریم ﷺ کو مخاطب بنایا گیا پھر کافروں کے لیے کہا گیا

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ کا اس کے بعد واقع ہونا اور اسی قبیل سے ہے إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً سے لِتُؤْمِنُوا تک۔

(۲۷) خطاب تلوین (یعنی اسلوب بیان کو بدلنا) اور یہی خطاب التفات بھی ہے۔

(۲۸) جمادات سے اس طرح خطاب کرنا جس طرح ذوی العقول سے کیا جاتا ہے جیسے فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً

(۲۹) خطاب تہیج (جوش دلانے والا خطاب جیسے وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

(۳۰) خطاب تحنن اور خطاب استعطاف (شفقت ومحبت والا خطاب) جیسے يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا (۳۱) خطاب تحبب (اظہار محبت کے لیے خطاب) جیسے يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ۔ يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِنْ تَكُ۔ يَا ابْنَ أُمَّ لا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي (۳۲) خطاب تعجیز (دوسروں کو عاجز بنانا) جیسے فَأْتُوا بِسُورَةٍ

(۳۲) خطاب تشریف (عزت افزائی کا خطاب) قرآن کریم میں جہاں بھی قل کے لفظ سے خطاب کیا گیا یہ اللہ کی طرف سے اس امت کے لیے عزت افزائی کا خطاب ہے بایں طور کہ وہ ذات بغیر واسطے کے اس امت سے مخاطب ہے اور اس کا شرف عظیم ہے۔

(۳۴) خطاب معدوم۔ اور یہ خطاب کسی موجود کی تبعیت (پیروی) میں صحیح ہوتا ہے، جیسے يَا بَنِي آدَمَ یہ اس زمانے کے آدمیوں اور ان کے بعد آنے والے تمام آدمیوں کے لیے یکساں ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن ج۳ ص۱۱۵)

کیا جس طرح قرآن کریم نے عام لوگوں کو خطاب کیا، خاص لوگوں کو اپنے سخن کا مخاطب بنایا، نبی کریم ﷺ کو مخاطب بنایا، کفار کو مخاطب بنایا اس طرح مختلف پیرائے اور طرز سخن کی رنگارنگی کسی انسان کے بس کی بات ہے، کتنا ہی کوئی شخص قادرالکلام کیوں نہ ہو، بلیغ ادیب اور انشاء پرداز کیوں نہ ہو وہ اس طرح کا کلام پیش کرنے سے عاجز ہے، اسی لیے یہ قرآن عظیم معجزہ ہے۔

⑫ ایجاز واطناب: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں ایک وجہ اس میں ایجاز واطناب ہے، ایجاز و اطناب سے کلام میں حسن بڑھ جاتا ہے، اسے نظر انداز کر دینے سے کلام سے حسن وخوبی کے معیار سے بلغاء کے نزدیک گر جاتا ہے، بلاغت ایجاز واطناب کی رعایت رکھنے کا ہی نام ہے۔ (منازل العرفان)

بقول علامہ زمخشری جس طرح مواقع اجمال میں بلیغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اجمال وایجاز کو اختیار کرے، اسی طرح مواضع تفصیل وتنقیح میں یہ لازم ہے کہ وہ بسط وتفصیل کے ساتھ کلام پیش کرے۔ علامہ قزوینی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ اداء مقصود کے لیے تعبیر یا تو مقصود ومراد کے مساوی ہوگی یا اس کی نسبت سے کم ہوگی، لیکن وہ تعبیر اپنے اختصار کے باوجود مراد بخوبی ادا کر رہی ہو، یا مقصود ومراد سے تعبیر زائد ہوگی کسی نکتہ اور فائدہ کی وجہ سے، اول قسم کلام میں مساوات ہے، دوم ایجاز اور سوم اطناب بلغاء کے نزدیک مساوات کی قسم اور اس کے احکام زائد زیر بحث نہیں آتے، وجوہ بلاغت میں ایجاز واطناب ہی موضوع بحث رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے اپنی تعبیر میں دونوں پہلوؤں کی رعایت حد اعجاز تک کی ہے۔

شیخ سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں ایک مستقل فصل میں ان تمام انواع اعجاز کو جمع کیا ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے خطاب میں جو طرز ایجاز اختیار کیا دنیا کے فصحاء اس سے عاجز ہیں کہ کس خوبی کے ساتھ چند الفاظ میں حقائق اور معانی کے بے شمار خزانے اور کثیر مضامین جمع کر دیے گئے مثلاً آیت مبارکہ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (النحل ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل وانصاف اور بھلائی کا اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے ہر بے حیائی اور برے کام سے۔

تو اس آیت میں لفظ العدل سے اس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی جو افراط وتفریط کے درمیان عین اعتدال وتوسط کا راستہ ہے، جس کے ضمن میں اعتقاد واخلاق عبودیت معاملات ومعاشرت کی تمام ذمہ داریوں کی تکمیل اور ان کی اصلاح ودرستگی کو بیان کر دیا گیا۔

اَلْاِحْسَان سے عبادت کے حسن و کمال، اخلاص و خشوع و خضوع کے اس مرتبہ کو بیان فرما دیا جس کی تعلیم اَن تَعبُدَاللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ کے عنوان سے آنحضرت ﷺ نے امت کو دی، اِیتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی سے حقوق واجبہ کے بعد تبرع واحسان اور اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک اور پاکیزگی معاشرت کا مضمون ادا کیا گیا۔

یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ سے تمام معاصی سے اجتناب اور قوت شہویہ سے بچنے کی تعلیم ہے اور اَلْمُنکَر سے اس افراط و غلو اور تعدّی کو منع کیا گیا جو انسان کی قوت غضبیہ کے آثار میں سے ہے اور وَالبَغی سے اس جور و تسلط کو روکا گیا جس کا منشاء قوت وہمیہ ہے، اسی مضمون کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں مَافِی القُرآنِ آیَۃٌ اَجمَعُ لِلخَیرِ وَالشَّرِ مِن ھٰذِہِ الآیَۃِ (حاکم) کہ قرآن کریم میں کوئی آیت خیر و شر کے لیے اس آیت سے زیادہ جامع نہیں ہے۔ (منازل العرفان)

اسی طرح آیت وَلَکُم فِی القِصَاصِ حَیٰوۃٌ ہے کیونکہ اس کے معنیٰ کثیر ہیں اور الفاظ نہایت ہی مختصر و قلیل ہیں، یہ الفاظ و کلمات اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ قتل و خونریزی کا انجام قصاص ہے تو قاتل و خونریز قسم کا انسان خود بھی اقدام قتل سے باز رہے گا، جس کے باعث دوسرے کی حیات کو بھی اِتلاف و اِضاعت سے محفوظ رکھے گا اور اپنی زندگی بھی قصاصاً ختم کر دیے جانے سے بچا لے گا، اہل عرب کے یہاں اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے جو مشہور و معروف اور مایہ ناز جملہ اَلقَتلُ اَنفَی لِلقَتلِ تھا، کلام اللہ کی یہ مختصر سی آیت فصاحت و بلاغت لفظی اور معنوی خوبیوں عرب کے اس مقولہ سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ (منازل العرفان)

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لیے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے، مثلاً اَلقَتلُ اِحیَاءٌ لِلجَمِیعِ (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور اَلقَتلُ اَنفیٰ لِلقَتلِ (قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے) اور اَکثِرُوا القَتلَ لِیَقِلَّ القَتلَ (قتل زیادہ کرو تاکہ قتل کم ہو جائے) ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد عام تھے

اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھیے بلاغت کا معجزہ شاہکار معلوم ہوتا ہے اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔ (علوم القرآن للعثمانی ص ۲۵۹)

مقصود کو بسط و توضیح کے ساتھ بیان کرنا اطناب فی الکلام ہے مثلاً حق تعالیٰ نے سورۃ بقرہ و دیگر مواقع میں خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ خطاب جن وانس، عالم و جاہل، ذکی و غبی، موافق و مخالف اور ہر زمان و مکان میں بسنے والوں سے تھا، اس وجہ سے تمام دلائل قدرت کے ذکر میں بسط و تفصیل ہی کو اختیار فرمایا، ایجاز جس طرح ایجاز قصر اور ایجاز حذف کی جانب منقسم ہے اور ایجاز حذف کے انواع بکثرت کلام اللہ میں موجود ہیں اسی طرح اطناب کے انواع بھی کثیر ہیں۔ (منازل العرفان، الاتقان فی علوم القرآن)

⑬ اقسام: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس میں اٹھائی گئی قسمیں ہیں، علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب البیان فی اقسام القرآن میں قرآن کریم میں اٹھائی گئی قسموں پر تفصیلی بحث کی ہے، قسمیں قرآن کریم کے طرز خطاب میں ایک نمایاں خصوصیت ہے، قرآن کریم کے اکثر مطالب و مضامین کو قسم کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے جو ان مضامین کی صداقت، حقانیت کی گویا دلیل ہوتی ہیں، عربوں کا یہ خصوصی ذوق تھا کہ جب کسی امر پر ان کو تاکید و اصرار ہوتا اور اس کی حقانیت و صداقت کو مخاطب پر واضح کرنا چاہتے تو اس مقام پر قسم کا عنوان اختیار کرتے اور قرآن کریم چونکہ لغت عرب پر نازل ہوا، اس لیے ان کے اس خصوصی ذوق کی رعایت بھی ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ کلام اللہ میں رکھی گئی کہ وہ اقسام قرآن کے لطائف پر حیرت زدہ ہوتے اور بجز اس اعتراف کے کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ خدا کی قسم یہ کلام بشر نہیں ہے۔

استاذ ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام میں قسم کا ذکر فرمایا حجت وبرہان کی تکمیل و پختگی کے لیے، اس لیے حکم کی تاکید اور برتری کا ذریعہ یا تو شہادت ہے یا قسم

تو خداوند عالم نے اپنے کلام میں دونوں نوعیں جمع کر دیں، ایک جگہ فرمایا شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران ۱۸) کہ اللہ گواہ ہے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی اور اہل علم بھی، دوسری جگہ فرمایا قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ (یونس ۵۳) یعنی کہہ دیجیے بے شک قسم ہے میرے رب کی یقیناً وہ حق ہے، بعض اعراب سے منقول ہے کہ اس نے جب یہ آیت سنی وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲) فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ (الذاریات ۲۳) تو چلا اٹھا اور کہنے لگا کون ہے وہ جس نے رب جلیل کو غضبناک کیا حتی کہ رب العزت کو قسم کھانے کی نوبت آگئی۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

قرآن کریم نے جن امور پر قسم کھائی ہے وہ یہ ہیں ① اصول ایمان جن کا اعتقاد مخلوق پر لازم ہے۔ ② توحید خداوندی۔ ③ حقانیت قرآن۔ ④ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی برحق ہونا۔ ⑤ قیامت جزا و سزا اور وعدہ و وعید کے برحق ہونے پر۔ ⑥ کبھی انسان کی حالت پر کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے اور یہ کہ وہ بغیر ایمان اور عمل صالح خسارہ میں ہے۔

⑦ اور یہ کہ انسانی اعمال باہم مختلف ہیں، ہر ایک اپنے زعم میں اپنے ہی طریقہ کو حق اور موجب نجات سمجھتا ہے لیکن اس کا فیصلہ کتاب اللہ ہی کر سکتی ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب التبیان میں اقسام القرآن پر تفصیلی کلام فرماتے ہیں تمام مضامین میں اس امر کی توضیح فرمائی کہ جہاں جس چیز کی قسم کھائی اس چیز کو وہاں بیان کردہ مضمون سے پوری مناسبت ہوتی ہے اور یہ مناسبت معارف اور لطائف قرآنی کا مستقل باب ہے (التبیان فی اقسام القرآن)

⑭ **امثال قرآن:** قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ قرآن کریم میں بیان کی گئی امثال اور موعظت ہیں، یہ ایک فطری اور طبعی امر ہے کہ مقام موعظت اور نصیحت میں امثال کا ذکر

مخاطب کے لیے نہایت ہی مؤثر اوردل نشین طرز کلام ہے،اسی طرح امور معنویہ کو مخاطب کے سامنے محسوس ومشاہد اوران کے محاسن وقبائح کو نمایاں کردینا تمثیلات ہی کے ذریعہ ممکن ہے،کتب سابقہ تورات، انجیل میں بکثرت مضامین تمثیلی رنگ میں بیان کیے گئے تھے، قرآن کریم نے بھی اپنی شان بلاغت کے ساتھ طرزِ خطاب کے اس مؤثر اور بہترین طریقہ کو معجزانہ انداز میں اختیار فرمایا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ(الزمر ۲۷)

شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے اپنے کلام میں اَمثال وعظ وتذکیر کے لیے بیان فرمائی ہیں،بہت سی تمثیلات ثواب وعقاب اوران کے تفاوت درجات حسنات وسیئات کے ثمرات ونتائج اور ترغیب وترہیب پر مشتمل ہیں اور غرض مقصود یہ ہوتی ہے کہ مراد کو عقل سے اس طرح قریب تر کردیاجائے کہ وہ معقول کے مرتبہ سے تجاوز کرکے سامع کے ذہن میں محسوسات کی شکل اختیار کرلے،اگر کوئی معنوی خفاء ہے تووہ بھی دور ہوجائے۔

اگر شئ کی عظمت بیان کرنی ہے تواس کی حقیقی اورواقعی عظمت نمایاں ہوجائے اوراگر کسی شئ کی حقارت وخست ظاہر کرنی ہے تواس کی حقارت وخست علی وجہ الاتم ظاہر ہوجائے اوراگر کسی چیز کی پائیداری اور قوت یاکسی چیز کاضعیف وناپائیدار ہونابیان کرناہے تووہ بھی بخوبی مخاطبین کے ذہنوں میں راسخ ہوجائے مثلاً آیت سورۃ البقرہ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ(البقرہ ۲۶۱) میں انفاق فی سبیل اللہ کے اجروثواب کو محسوس مشاہد صورت میں ظاہر کیاگیاکہ جس طرح زمین پرڈالے ہوئے ایک دانہ گندم سے دنیوی کھیتی میں سات سودانے انسان کوحاصل ہوجاتے ہیں اسی طرح آخرت کی کھیتی کا بھی حال ہے بلکہ اس سے بڑھ کر جس کے لیے اللہ چاہے کہ ایک حسنہ کواللہ تعالیٰ سات سونیکیوں کے ثواب تک بڑھاتاہے۔

اگر انسان ایمان واخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے لیکن یہی انفاقِ مال بغیر ایمان وتقویٰ محض ریاء اور حب جاہ کے لیے کیا جائے تو اس کی مثال فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ایسی مثال ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو) جس پر کچھ مٹی ہو (اور اس مٹی میں دانہ ڈالنے سے کچھ گھاس پھونس سا بھی پیدا ہو گیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑی تو اس نے اس پتھر کو (جیسا تھا اسی طرح) صاف چکنا بناڈالا، تو ان کلمات نے مخاطب کے سامنے اس صورت کو محسوس کر کے دکھادیا کہ انفاق ایمان واخلاص کے ساتھ ایک نفع بخش کھیتی کے مانند ہے اور یہی بذلِ مال اور صرف دولت بغیر ایمان وتقویٰ کے کسی چکنے پتھر پر تخم ریزی کی طرح ہے۔

پھر اس تمثیل کے بعد ایک اور بلیغ تمثیل اس معنیٰ کے لیے ارشاد فرمائی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کو اضاعت وبربادی سے بچائے اور ان اعمال کو اس وقت کے لیے کارآمد ذخیرہ بنانے کی فکر کرے جب کہ ہر طرح سے بے سہارا ہو گا، اگر وہ منافع عاجلہ حب جاہ اور احسان جتلانے کی وجہ سے اپنے اعمال کو ضائع کرتا ہے تو اس کا حال تباہی اور بربادی اور حسرت ویاس میں بس ایسا ہے جیسا کہ ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر قسم کے پھل طرح طرح کے میوے ہوں، اس میں نہریں بہتی ہوں، شادابی کی کوئی حد وانتہا نہ ہو جب وہ شخص بڑھاپے کو پہنچا اور حال یہ کہ اس کی اولاد چھوٹی ناسمجھ یعنی ایسی نہیں کہ اس کو کما کر کچھ کھلادے تو ایسے ضعف وپیرانہ سالی اور بے چارگی کے زمانہ میں جب کہ اس کی تمام تر امیدیں اسی باغ کے ساتھ وابستہ تھیں، ناگہاں ایک آگ آئی اور بگولوں نے اس باغ کو جلا کر خاک کر ڈالا۔

تو یہی حال اس شخص کے نفقہ کی بربادی کا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے احسان جتائے یا ایذا پہنچائے اور پھر امید لگائے کہ قیامت میں یہ عمل میرے کام آئے گا، سو ظاہر ہے کہ قیامت کے روز اس کی امیدوں کا یہ باغ حق تعالیٰ کی ناراضگی اور قہر کے شعلوں سے جل کر خاک ہو جائے گا، تو اس تمثیل کے ذریعے خداوند عالم نے لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى (البقرہ ۲۶۴)

کے مضمون کی ایسی حقیقت واضح فرمائی کہ گویا آنکھوں سے حبطِ اعمال اور بربادی صدقات کا منظر نظر آنے لگا، اسی طرح ایمان و عمل صالح کی پائیداری اور کفر و شرک کا ضعف واضمحلال مخاطب کی نگاہوں کے سامنے اس طور پر ظاہر فرمایا گیا۔ (منازل العرفان فی علوم القرآن)

⑮ **مضامین وآیات کا تکرار:** قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ اس کے مضامین وآیات کا تکرار بھی ہے، قرآن کریم واقعات وقصص اور ان کے اجزاء کو بار بار بیان کرتا ہے اور بعض آیات معینہ بار بار دہرائی جاتی ہیں مثلاً ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قرآن میں متعدد جگہ ذکر کیے گئے ہیں، اور حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام اور فرعون کے ذکر سے تو شاید ہی کوئی حصہ قرآن کریم کا خالی ہو، ان تمام واقعات کو قرآن بکثرت کہیں اجمال اور تفصیل سے کسی جگہ بعض اجزا قصہ اور دوسری جگہ دوسرے بعض اجزا بیان کرتا ہے، اسی طرح بعض آیات مثلاً فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اور وَیْلٌ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ایک سورت میں بار بار دہرائی جارہی ہے۔ (منازل العرفان)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بقول قرآن کریم جن واقعات کو بیان کرتا ہے ہر واقعہ اپنے مختلف اجزاء اور متعدد پہلوؤں کے اعتبار سے بہت سے مفید ثمرات اور اہم نتائج پر مشتمل ہوتا ہے تو ہر مقام وموضوع اور مقصد کی رعایت کرتے ہوئے ہر واقعہ کو کبھی مجموعی طور پر اور کبھی اس کے کسی ایک جزء اور پہلو کو کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور متعدد مقامات پر اس ایک ہی واقعہ کو ذکر کرنے سے ہر مقام کے مناسب ایک نئے فائدہ اور نتیجہ کا اخذ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

ان ہی مقاصد ونتائج کی کثرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیان واقعہ یا اس کے اجزاء میں تکرار اختیار کیا جاتا ہے، دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز مکرر ذکر کی جارہی ہے لیکن مقصد اور غرض کے اعتبار سے وہ مکرر نہیں بلکہ نئی چیز ہوتی ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بنیادی اجزاء اور پہلو حسب ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد آغوش مادر کے بجائے سمندر کی موجوں کے حوالہ ہو جانا، پھر ایک حیرت انگیز طریقہ سے فرعون کے یہاں پہنچ جانا، اسی کے گھر میں تربیت پانا، قبطی کو قتل کر کے مدین کی طرف بھاگنا، وہاں ایک انوکھے طور پر نکاح ہو جانا، اہلیہ کو ہمراہ لے جاتے ہوئے آگ کو دیکھ کر پہاڑی پر جانا اور وہاں سے منصب نبوت سے سرفراز ہو کر لوٹنا اور معجزہ کا عطا ہونا، پھر دعوت ایمان لے کر فرعون کے پاس جانا، فرعون کا تمرد و سرکشی کے ساتھ تحقیر آمیز سوال وجواب کرنا، معجزات دیکھ کر فرعون اور تمام ساحروں کا ذلیل ہونا، انجام کار فرعون اور اس کی قوم کا دریائے نیل میں غرق ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مظفر و منصور ہو کر بنی اسرائیل کو روز روز کے عذاب سے بچا لینا وغیرہ وغیرہ (اکسیر فی علوم تفسیر)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی ہر تعلیم اور ہر حکم کے مخاطب دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور دو ہی اعتبار و نظریوں کے ساتھ قرآن خطاب فرماتا ہے، ایک وہ کہ جو اس حکم سے ناواقف ہیں ان کو تو صرف ایک نامعلوم چیز کی تعلیم دے دینا ہے، دوسرے وہ کہ محض امر غیر معلوم کی تعلیم مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی کیفیت کا قلب میں راسخ کر دینا مقصود ہوتا ہے تاکہ قوت مدرکہ اس علم کا پورے طور پر استحضار کرے اور طبائع اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کے رنگ میں رنگی جائیں۔ (اکسیر فی علوم تفسیر، منازل العرفان)

اہل دنیا کے علم میں اگر کسی مضمون کو ایک بار سے زیادہ دہرایا جائے تو اس تکرار سے سننے والے بور ہو جاتے ہیں، مگر یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کے تکرار مضامین و آیات سے ایک نئی لذت اور ایک نئی چاشنی پیدا ہوتی ہے، بحر علم کے غواص اس سمندر کی تہہ سے نئے نئے سیپ و موتی تلاش کر لاتے ہیں، کوئی بڑے سے بڑا بلیغ و ادیب و انشاء پرداز اپنے کلام میں تکرار سے یہ لذت پیدا نہیں کر سکتا۔

⑯ متشابہات: یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس میں متشابہ آیات پائی جاتی ہیں، ایک ہی واقعہ مختلف سورتوں میں مختلف الفاظ اور مختلف فواصل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، ایک مقام پر ایک واقعہ کے الفاظ مقدم رکھے جاتے ہیں جب کہ دوسرے مقام پر اسی واقعہ کے الفاظ وفواصل مؤخر رکھے جاتے ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کو دیے گئے حکم کے الفاظ یوں بیان کیے گئے وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً وَقُولُوا حِطَّةٌ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور زبانوں سے حِطَّةٌ کے الفاظ بولتے جاؤ، جب کہ سورہ الاعراف میں اسی موضوع کو یوں وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً کہہ کر الٹ دیا گیا۔

سورۃ البقرہ میں نذر غیر اللہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ جب کہ باقی سارے قرآن میں جہاں اس مضمون کو بیان کیا گیا وہاں یہ اسلوب بیان اختیار کیا گیا وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ، کسی مضمون میں الفاظ کی زیادتی ہے اور کسی میں الفاظ میں کمی، سورۃ البقرہ میں وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ہے جب کہ سورۃ الانفال میں كُلُّهُ لِلَّهِ ہے۔ (الاتقان، معترک الاقران)

⑰ ناسخ و منسوخ: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے قرآن کریم کے ناسخ و منسوخ کو بھی اعجاز قرآن میں شامل فرمایا ہے، ناسخ و منسوخ ایسی چیز ہے جس کے ساتھ یہ امت خاص ہے، ناسخ و منسوخ میں امت محمدیہ کے لیے آسانی کی حکمت کارفرما ہے، جب کہ مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ صرف امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کی خصوصیت نہیں بلکہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے، جس کی بہت سی مثالیں موجودہ بائبل میں بھی ملتی ہیں مثلاً بائبل میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویاں لیاہ اور راحیل آپس میں بہنیں تھیں (بائبل کتاب پیدائش) لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے ناجائز قرار دے دیا گیا۔ (احبار)

حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جاندار حلال تھا۔ (پیدائش) لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام کر دیے گئے (احبار، استثناء) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی۔ (استثناء) لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں عورت کے زناکار ہونے کے سوا اسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی۔ (انجیل متی) غرض بائبل کے عہد نامہ جدید و قدیم میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی پرانے حکم کو نئے حکم کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا۔ (علوم القرآن)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے معترک الاقران میں فرمایا کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ناسخ و منسوخ جائز ہے، جب کہ یہودیوں نے نسخ کا انکار کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس طرح یہ بات لازم آتی ہے کہ اللہ کی رائے میں تبدیلی ہوتی ہے، یہودی یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے احکامات میں ناسخ و منسوخ کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا جسے "بَدَاء" کہا جاتا ہے، گویا کہ اللہ نے پہلے اپنی رائے ظاہر کی پھر یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ تو باطل ہے۔

یہودیوں کا یہ خیال بالکل باطل ہے اور یہ خیال انہوں نے اس لیے اپنایا کہ انہیں نسخ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ نسخ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پہلے ایک رائے ظاہر کرنا پھر اس میں تبدیلی کرنا بلکہ نسخ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر زمانے میں اس دور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، ناسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے وہ پہلے حکم کی مدت نفاذ متعین کر دے اور یہ بتا دے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا، لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بناء پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامت فکر کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمت الٰہیہ کے عین مطابق ہے، جیسے زندہ کرنے کے بعد مارنا اور مارنے کے بعد زندہ کرنا، بیماری کے بعد صحت اور صحت کے بعد بیماری، فقر کے بعد مالداری اور مالداری کے بعد فقر، یہ تبدیلی بداء نہیں کہلاتی، اسی طرح امر و نہی ہے۔

پھر علماء کرام نے اس میں اختلاف کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ قرآن کا نسخ قرآن ہی سے ہو سکتا ہے، جیسے قرآن کریم نے خود بتایا مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ قرآن کے مثل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قرآن کریم سے بہتر کوئی چیز ہو سکتی ہے، بعض یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کا نسخ سنت کے ساتھ ہو سکتا ہے کیونکہ سنت بھی تو اللہ کی طرف سے ہے، جیسا کہ ارشاد ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى، جب سنت اللہ کے حکم سے وحی کا طریقہ ہے تو اس سے بھی نسخ ہو سکتا ہے ہاں اجتہاد کے ساتھ نسخ نہیں ہو سکتا۔ (معترک الاقران فی اعجاز القرآن)

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ناسخ و منسوخ کے اعتبار سے قرآن کریم کی سورتوں کی اقسام ہیں، ایک قسم وہ ہے جس میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے اور یہ تینتالیس سورتیں ہیں اَلفَاتِحَۃُ، یُوسُف، یٰس، اَلحُجُرَات، اَلرَّحمٰن، اَلحَدِید، اَلصَّف، اَلجُمُعَۃُ، اَلتَّحرِیم، اَلمُلک، اَلحَاقَّۃ، نُوح، اَلجِن، اَلمُرسَلَات، عَمَّ، اَلنَّازِعَات، اَلاِنفِطَار، اور تین سورتیں اس کے بعد والی الفجر اور اس کے بعد آخر قرآن تک کی سورتیں، ہاں ان میں سورۃ التین، سورۃ العصر اور سورۃ الکافرون شامل نہیں ہیں۔

ایک قسم وہ ہے جس میں ناسخ و منسوخ ہے اور وہ پچیس سورتیں ہیں،: اَلبَقَرۃ، تین اس کے بعد والی اور اَلحَجّ، اَلنُّور، اور اس کے بعد والی سورتیں، اور اَلأَحزَاب، سَبَأ، اَلمُؤمِن، اَلشُّوریٰ، اَلذَّارِیَات، اَلطُّور، اَلوَاقِعَۃ، اَلمُجَادِلَۃ، اَلمُزَّمِّل، اَلمُدَّثِّر، کُوِّرَت، اَلعَصر، ایک قسم وہ ہے جس میں صرف ناسخ ہی ہے اور وہ چھ سورتیں ہیں اَلفَتح، اَلحَشر، اَلمُنَافِقُون، اَلتَّغَابُن، اَلطَّلَاق، اَلأَعلیٰ، اور ایک قسم وہ ہے جس میں صرف منسوخ ہی ہے اور وہ باقی والی چالیس سورتیں ہیں (معترک)

کون سا حکم کب جاری کرنا ہے، کون سے حکم کو بدلنا ہے، کس انسان کی کیا ضرورت ہے، کس گروہ کو کون سے احوال درپیش ہیں، کون سا حکم کتنی مدت تک کے لیے جاری رکھنا ہے، یہ سب چیزیں صرف اور صرف قرآن کریم اتارنے والے کے علم میں ہیں، کسی اور مخلوق کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس جیسا کلام اور ان جیسے احکام اقتضائے حال کے مطابق اتار سکے، جب قرآن کریم کے اس

اسلوب نگارش کا مقابلہ کرنا انسانی بس میں نہیں تو پھر یہ بات کھلے دل سے تسلیم کرلینا چاہیے کہ قرآن کریم ایک معجز نما کتاب ہے، جس کا مقابلہ کرنا انسانی بس میں ہے۔

⑱ اخبار بالمغیبات: قرآنی اعجاز کی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم وفارس کے مقابلہ میں ابتداءً اہل فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے۔

مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہار جیت کی شرط کرلی اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی وہ مال ان کو دینا پڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا کیونکہ وہ ایک قسم کا جوا تھا اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہوگئی۔ (معارف القرآن للمفتیؒ)

مسلمانوں کو مسجد الحرام میں امن کے ساتھ داخل ہونے کی خوشخبری سنائی گئی تو ہو بہو پوری ہوئی، دین اسلام کے غالب ہونے کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس خبر کے مطابق دین کو قوت عطا فرمائی، اہل ایمان کے ساتھ خلافت کا وعدہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح پورا فرمایا، کس طرح مسلمانوں کا دین مضبوط کیا، ان کی سلطنت کا سکہ مشرق بعید اور مغرب بعید تک رائج کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے لیے زمین سمیٹی گئی یہاں تک کہ میں نے اس کے مشارق ومغارب کو دیکھا اور فرمایا تھا کہ میری امت کی سلطنت وہاں تک جائے گی جہاں تک میرے لیے زمین سمیٹی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے دین اسلام میں قطار اندر قطار لوگوں کے شامل ہونے کی خوشخبری سنائی تو پوری ہوئی منافقین کی ریشہ دوانیوں اور یہودی مکر ودجل کو عالم آشکار کیا گیا، ان کے سینے میں چھپے

رازہائے سربستہ کو کھولا گیا، اللہ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ ٹھٹھا کرنے والوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کی جائے گی، ہم آپ ﷺ کے لیے کافی ہیں، استہزا کرنے والے تمسخر اڑاتے تھے، لوگوں کو آپ ﷺ سے دور کرنے کی کوششیں کرتے تھے، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو ایذائیں پہنچاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی حفاظت کا جس طرح وعدہ فرمایا حفاظت کرکے دکھائی، مخالفین اور دشمنانِ پیغمبر نشانہ عبرت بنادیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا، اس وعدہ کے مطابق آپ ﷺ کی حفاظت ہوئی، ورنہ کافروں نے، مخالفین نے کتنی بار آپ ﷺ پر خوفناک حملے کرنے کے منصوبے بنائے، آپ ﷺ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے ناپاک پروگرام تشکیل دیے مگر اللہ نے جیسے فرمایا ایسے کرکے دکھایا۔

⑲ امم سابقہ کے احوال: ایک وجہ اعجاز قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی امتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود و نصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان میں بھی اتنی معلومات نہ تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا پھر یہ ابتداء دنیا سے آپ ﷺ کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔ (معارف القرآن)

یہ قرآن کریم ہی ہے جس نے سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال سے آگاہی دی، ان کے علوم سے پردہ اٹھایا، ان کی سیرت و سوانح کے مخفی گوشے اجاگر کیے ان کی شریعتوں کی پوشیدہ باتوں کی اطلاع دی، ان کی کتابوں کے مشتملات و محتویات سے پردہ اٹھایا، جب یہود و نصاریٰ نے روح، ذی القرنین، اصحاب کہف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رجم و سنگساری کے حکم، بنی اسرائیل نے جو چیزیں

اپنے اوپر حرام کر دی تھیں، جن جانوروں کو ان لوگوں نے اپنے اوپر حرام قرار دیا تھا، وہ پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں پھر ان کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے حرام کی گئیں ان سب کی اطلاع قرآن کریم نے دی۔ (معترک الاقران فی اعجاز القرآن)

⑳ قرآنی اثرات: قرآن کریم انسانی زندگی اور انسانی معاشرے پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے یہ بھی اس کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے، استاذی المکرم علامہ خالد محمود سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن کریم ایک ایسے زمانے میں نازل ہوا جب کہ ساری دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں کوئی باقاعدہ تمدن نہ تھا۔

اس قوم کے پاس کوئی تہذیبی ورثہ بھی نہ تھا لیکن قرآن پاک نے ایک نہایت قلیل عرصے میں ایک ایسا محیر العقول انقلاب پیش کیا کہ عوام وخواص، حکماء وخطباء، فصحاء وبلغاء بڑے چھوٹے جوان بوڑھے آقا وغلام بدوی وشہری سب اس ریلے میں بہہ گئے اور قرآن نے ہر ایک کے دل میں اس کے ظرف اور مزاج کے مطابق وہ تبدیلی پیدا کی کہ صدیوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے جو بت پرست تھے بت شکن ہو گئے، حمیت ووحشت کی جگہ صبر وتحمل آگیا، بربریت کی جگہ فکر وتدبر نے لے لی اور پشتینی عداوتوں سے لبریز سینے چند سالوں کے اندر پیغام رحمت بن گئے اتنے قلیل عرصے میں اتنے عظیم اثرات اور ہر کہ ومہ پر اتنی روشن انقلابی تاثیرات قرآن کریم کی شان اعجاز کے وہ تاریخی شواہد ہیں کہ کوئی مبصر انہیں عادی اور مادی اسباب کے تحت تصور نہیں کر سکتا۔ (آثار التنزیل ج ۱)

㉑ حفاظ کے لیے آسانی: قرآن کریم کے اعجاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کے دلوں میں محفوظ رکھنے کے لیے آسان فرمادیا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے لیے آسان بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ جتنے صحیفے اور کتابیں نازل

فرمائیں ان میں سے کسی کا کوئی حافظ نہیں تھا، ایک حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ انہیں تورات زبانی یاد تھی، مگر قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ جس دور میں اس کا نزول ہوا اس سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت کی صبح تک اسے یاد کرنے والے اور اپنے سینوں کے سفینوں کو قرآنی خوشبو سے معطر و معنبر کرنے والوں کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں ہوگی، ہمارے اس زمانے میں بھی چھوٹے، بڑے، جوان، بوڑھے، مرد وزن ہزاروں لاکھوں ایسے خوش نصیب ہیں جو قرآن کریم کے حافظ ہیں، بے شمار معصوم بچوں نے انتہائی کم مدت میں قرآن کریم یاد کیا، ایک ایک مہینہ میں بھی بہت سے بچوں نے قرآن کریم زبانی یاد کیا، خواب میں کئی بچوں نے قرآن کریم زبانی یاد کیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب معترک الاقران میں یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں اس کے سامنے ایک پانچ سالہ بچہ لایا گیا جو قرآن کریم حفظ کر رہا تھا، اس طرح دنیا بھر میں بے شمار چھوٹی عمر کے بچے ہیں جو قرآن کریم کے حفظ میں مشغول ہیں، ہمارے ہاں ہزاروں بچے سالانہ قرآن کریم کے حافظ تیار ہو رہے ہیں، دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم ممالک میں حفاظ قرآن کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار ہو رہی ہے، مدارس اسلامیہ قرآن کریم کی نرسریاں ہیں جہاں حفاظ قرآن تیار ہوتے ہیں۔ ابو عمران کہتے ہیں کہ لوگوں میں کچھ ایسے خوش نصیب لوگ بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی رات میں قرآن کریم مکمل کرنے کی توفیق بخشی، حضرات صحابہ کرام میں سے کچھ ایسے تھے جو رات میں ایک بار تکمیل قرآن فرماتے تھے اور جو ایک ہی رات میں دو بار اور کچھ ایسے تھے جو ایک رات میں تین بار قرآن کریم مکمل کر لیتے تھے۔ (معترک الاقران)

㉒ قرآنی پیشین گوئی: قرآنی اعجاز کی ایک وجہ وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشینگوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کر سکیں گے اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کر سکے جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کے دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انہیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہیے وہ ذرا موت کی تمنا کر کے دکھائیں اور

پھر ارشاد فرمایا، وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (۹۵: ۲) وہ ہر گز موت کی تمنا نہ کر سکیں گے، موت کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے ارشاد کی وجہ سے ان کی تمنائے موت میں خوف وہراس کی کوئی وجہ نہ تھی یہود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اعلان کرتے۔

مگر یہود ہوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے اس کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے تو فوراً مر جائیں گے، اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کر دے۔ (تفسیر معارف القرآن للمفتیؒ)

اعجاز القرآن پر تصانیف: ہم اپنی نگارشات کو یہیں ختم کرتے ہیں، اس موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے اتنا کم ہے، قرآن کریم کے اعجاز اور عظیم الشان معجزہ ہونے پر امت مسلمہ کے جلیل القدر علماء کرام اور ارباب قلم نے بہت ہی عمدہ تحریریں کتابی شکل میں پیش کی ہیں، ہر دور میں ایسی عمدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن مین اعجاز قرآن کے عنوان پر مدلل مواد پیش کیا گیا ہے، تیسری صدی ہجری میں علامہ جاحظ رحمہ اللہ نے نظم القرآن، چوتھی صدی ہجری کے شروع میں علامہ ابو عبداللہ واسطی رحمہ اللہ نے اعجاز القرآن، چوتھی صدی ہجری میں ہی ابن عیسیٰ ربانی رحمہ اللہ نے اعجاز القرآن پر ایک بہترین رسالہ تحریر کیا، اسی صدی میں ابو سلیمان احمد بن محمد بُستی خطابی رحمہ اللہ نے بیان اعجاز القرآن اور ابو الحسن علی بن عیسیٰ رُمانی معتزلی نے النکت فی اعجاز القرآن، پانچویں صدی کے آغاز میں علامہ ابو منصور الثعالبی رحمہ اللہ نے الاعجاز والایجاز نامی کتاب لکھی، اسی صدی میں علامہ قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ نے اعجاز القرآن تحریر فرمائی، علامہ قاضی باقلانی رحمہ اللہ کی اعجاز القرآن وہ عظیم کتاب ہے جس کے بارے میں علامہ ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ اس جیسی کتاب تحریر نہیں کی گئی۔

پانچویں صدی میں ہی علامہ ابو بکر عبد القاہر جرجانی رحمہ اللہ نے دلائل الاعجاز فی علم المعانی تحریر کی، چھٹی صدی کے اواخر میں جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بی علی بن محمد الجوزی رحمہ اللہ نے فنون الافنان فی علوم القرآن تحریر کی۔

ساتویں صدی میں علامہ ابو عبد اللہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ بہادر الزرکشی رحمہ اللہ نے البرھان فی علوم القرآن لکھی، آٹھویں صدی میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان فی علوم القرآن، الخصائص الکبری اور معترک الاقران فی اعجاز القرآن، جیسی عظیم الشان اور مایہ ناز کتابیں تحریر کیں۔

ان میں الاتقان خصوصی طور پر قرآنی علوم سے متعلق ہے، جب کہ الخصائص میں انہوں نے اعجاز القرآن پر بھی بہترین تحریر پیش کی ہے، معترک الاقران میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے پینتیس وجوہ اعجاز قرآن بیان فرمائی ہیں۔ اسی طرح علامہ خطابی رحمہ اللہ اور علامہ رمانی رحمہ اللہ نے بیان اعجاز القرآن پر خوب خوب لکھا ہے، تیرہویں صدی میں علامہ محمد عبد الرزاق زرقانی رحمہ اللہ نے مناھل العرفان فی علوم القرآن، علامہ محمد ابو بکر اسماعیل رحمہ اللہ نے دراسات فی علوم القرآن، علامہ مناع بن خلیل القطان رحمہ اللہ نے مباحث فی علوم القرآن، علامہ محمد احمد محمد معبد رحمہ اللہ نے نفحات من اعجاز القرآن تحریر فرمائی۔

ان مشاہیر کے علاوہ بھی ارباب سعادت نے قرآنی خدمت میں اپنا وافر حصہ ڈالا، ان میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے الملل والنحل، شیذلہ عزیزی نے البرھان، مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ نے وحی الٰہی، علامہ صبحی صالح رحمہ اللہ نے مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر عبد المنعم القیعی رحمہ اللہ نے الاصلان فی علوم القرآن، علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ نے الوحی المحمدی، علامہ محمد علی الصابونی رحمہ اللہ نے التبیان فی علوم القرآن، علامہ مصطفے صادق الرافعی رحمہ اللہ نے اعجاز القرآن، عبد المحسن بن زبن بن متعب المطیری نے دعاوی الطاعنین فی القرآن الکریم، حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر فی

علوم التفسیر نامی کتابیں لکھ کر ایک عظیم کام کیا ہے۔

گزشتہ صدی کے وسط اور اواخر میں ہمارے اکابر علماء کرام نے بھی اردو زبان کا دامن خدمت قرآنی کے اس کار عظیم سے مالا مال کیا ہے، ان میں سرفہرست شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا نام ہے، جنہوں نے اعجاز القرآن تحریر کی، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی عظیم الشان کتاب مشکلات القرآن کے مقدمہ کو علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ نے یتیمۃ البیان فی شئ من علوم القرآن کا عنوان دیا ہے، جو پہلے مشکلات القرآن کا مقدمہ تھا، اب کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے، جس میں اعجاز القرآن کی بحث موجود ہے، علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ نے علوم القرآن، علامہ محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ نے منازل العرفان فی علوم القرآن اور التحریر فی اصول التفسیر، علامہ خالد محمود سیالکوٹی رحمہ اللہ نے آثار التنزیل، جب کہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ نے علوم القرآن کے عنوان سے لاجواب کتاب لکھی ہے، جس میں اعجاز القرآن کا عنوان نمایاں ہے۔

ان کے علاوہ ارباب تفسیر نے اس مقام پر اپنی اپنی تفاسیر کے طوالت اور اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے اعجاز القرآن پر لکھا ہے، ان میں علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں اعجاز القرآن پر قلم اٹھایا ہے، اردو تفاسیر میں سب سے خوبصورت بحث حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں کی ہے، جنہوں نے دس وجوہات کی بناء پر قرآن کریم کا اعجاز ثابت کیا ہے۔ علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تفسیر عزیزی کی جلد اول میں اعجاز القرآن پر خوبصورت بحث کی ہے۔

دنیا اور جنت کے پھل

سوال اہل ایمان کا انجام کیا ہوگا؟ کیا جنت کے پھل دنیا کے پھل کی طرح ہیں؟

جواب قرآن کریم میں اہل ایمان کو انجام بخیر کی خوشخبری دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُواْ

مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقاً قَالُواْ هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَأُتُواْ بِهِ مُتَشَابِهاً وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ{۲۵}البقرۃ) اور بشارت دیجیے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ بلاشبہ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جب کبھی بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل بطور غذا کے دیا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا، اور ان کو ہم شکل پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لیے ان باغوں میں بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں۔ اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ: ایمان والے نیکوکاروں کے لیے جنت کی بشارت ہے، جس کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی، جنت اہل ایمان کے لیے مہمانی کی جگہ ہے، اس کی بناوٹ انتہائی دلکش ہے اور یہ اہل ایمان کے لیے تیار کی جاچکی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں جنت کے بارے میں بتایئے کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہے اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت ہیں اس کی لپائی کستوری کی ہے، اور اس کی مٹی زعفران ہے اور جو شخص اس میں داخل ہوگا خوشحال رہے گا ناامید نہ ہوگا، ہمیشہ رہے گا اور نہیں مرے گا، اس کے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے اور اس کی جوانی ختم نہیں ہوگی۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کی دیوار سونے اور چاندی کی اینٹ کی ہوگی، ان کی دھونیاں عود کی ہوں گی، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، اس کی مٹی زعفران کی ہوگی اور اس کی خوشبو کستوری کی ہوگی۔ (مسند البزار، بیہقی، تفسیر در منثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کی زمین سفید ہے، اس کا صحن کافوری چٹانوں کا ہے، اس کے ارد گرد کستوری کے ٹیلے ہیں، ریت کے ٹیلوں کی طرح، اس میں بہتی ہوئی نہریں ہیں اس میں پہلے اور پیچھے جنت والے سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا،

جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے، (پھر) اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کی ہوا بھیجے گا جو ان پر کستوری کی خوشبو بکھیرے گی (ابن ابی الدنیا، تفسیر در منثور)

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا: اس آیت میں اہل ایمان اور اعمال صالحہ والے بندوں کی جزا ذکر فرمائی ہے جو طرح طرح کی نعمتوں کی صورتوں میں ظاہر ہو گی۔ (اوّل): تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ باغوں میں رہیں گے یہ باغات دارالنعیم میں ہوں گے جسے جنت کہا جاتا ہے، ان باغوں میں رہنے کے لیے مکان بھی ہوں گے جیسا کہ سورۃ صف میں وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ فرمایا ہے، ان باغات میں نہریں جاری ہوں گی، جو صاف ستھرے پانی کی ہوں گی جس میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا ہو گا، اور دودھ کی نہریں ہوں گی جن کا مزہ تبدیل نہ ہوا ہو گا اور شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لئے لذت کا ذریعہ ہوں گی اور صاف ستھرے شہد کی نہریں ہوں گی جیسا کہ سورۃ محمد میں ان نہروں کا ذکر فرمایا ہے، اور جو شراب وہاں پی جائے گی وہ لذت کے لیے ہو گی، اس سے نہ نشہ آئے گا اور نہ سر میں درد ہو گا، سورۃ الصافات میں فرمایا ہے لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ نہ اس میں درد ہو گا نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، اور سورۃ واقعہ میں فرمایا لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ نہ اس سے ان کو درد سر ہو گا اور نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔ (دوم): یہ فرمایا کہ ان باغوں کے درختوں میں جو پھل ہوں گے وہ ان کو کھانے کے لیے پیش کئے جائیں گے اور جب کبھی بھی کوئی پھل لایا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا اور وجہ اس کی یہ ہو گی کہ وہ پھل آپس میں ہم شکل ہوں گے اگرچہ لذت اور مزے میں مختلف ہوں گے۔ (انوار البیان)

بعض مفسرین نے فرمایا کہ مِن قَبل سے مراد ہے کہ دنیا میں جو پھل ہمیں دیئے گئے تھے یہ اسی جیسا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وہیں جنت میں جو پھل دیئے جائیں گے ان کے بارے میں کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی پہلے کھایا تھا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ پہلے معنی لینا زیادہ ظاہر ہے

تا کہ لفظ کُلَّمَا کا عموم باقی رہے (کیونکہ جنت میں سب سے پہلے جب پھل ملے گا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا تھا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب مِن قَبل سے دنیا والے پھل مراد لیے جائیں) لیکن صاحب تفسیر نسفی لکھتے ہیں: وَالضَّمِیرُ فِی بِهٖ یَرجِعُ اِلَی المَرزُوقِ فِی الدُّنیَا وَ الآخِرَةِ لِاَنَّ قَولَهُ هٰذَا الَّذِی رُزِقنَا مِن قَبلُ اِنطَوٰی تَحتَهُ ذِکرُ مَا رُزِقُوهُ فِی الدَّارین، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا جا چکا ہے۔

دونوں پھلوں کے بارے میں ہے، دنیا والے پھل اور جو پھل وہاں دیئے جاتے رہیں گے دونوں مراد ہیں جو پھل ان کو دیئے جائیں گے دیکھنے میں بظاہر دنیاوی پھلوں کے مشابہ ہوں گے، جس چیز کو پہلے دیکھا ہو اس سے انس اور الفت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی طرف طبعی میلان زیادہ ہوتا ہے اس لیے ظاہری صورت میں وہ پھل دنیا والے پھلوں کی طرح ہوں گے اور حقیقت میں ان کا مزہ اور کیف دوسرا ہی ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنت کے پھلوں سے دنیا میں کوئی پھل نہیں بس ناموں کی مشابہت ہے یعنی پھلوں کو دیکھ کر اہل جنت کہیں گے کہ یہ سیب ہیں، یہ انار ہیں، ہم نے اس کو دنیا میں کھایا تھا لیکن وہ مزے میں دنیاوی پھل کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ان کا مزہ اور کیف جنت کے اعتبار سے ہو گا۔ (تفسیر انوار البیان)

وَلَهُمۡ فِيهَآ أَزۡوَاجٞ مُّطَهَّرَةٞ: پاکیزہ بیویوں سے مراد وہ ہیں جو ماہواری سے پاک ہیں، پیشاب، نفاس اور پائخانے سے پاک ہیں، ناک کی ریزش اور تھوک سے پاک ہیں، ہر گندگی اور ہر اس تکلیف دہ چیز سے پاک ہیں جو دنیا کی عورتوں میں پائی جاتی ہے، ظاہری پاکی کے ساتھ ساتھ اندرونی پاکیزگی بھی ان میں پائی جاتی ہے، برے اخلاق سے پاک ہیں، بری اور مذموم صفات سے پاک ہیں، ان کی زبان گندے الفاظ اور بدکلامی سے پاک ہے، اپنے خاوند کے علاوہ کسی اور کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے سے بھی پاک ہیں، ان کے کپڑے بھی میل کچیل سے پاک ہیں۔

ان کے علاوہ جنت میں اہلِ جنت کو موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی حوریں ملیں گی، جن کی رنگت بہت زیادہ سفید ہو گی اور آنکھیں بہت ہی سیاہ ہوں گی، ان کا حسن و جمال ان کی پنڈلیوں سے باہر دکھائی دے گا، ان کی جلد اتنی خوبصورت ہو گی کہ دیکھنے والا جب انہیں دیکھے گا تو ایسے جیسے کہ وہ شیشے میں اپنا منہ دیکھ رہا ہے، حور جنت کی اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھیں ہرنی اور گائے کی طرح مکمل سیاہ ہوں، موٹی آنکھ والی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، اس لیے کہ عورت کے لیے آنکھ کا موٹا ہونا حسن ہے، جب کہ عورت کے لیے اگر چھوٹی آنکھ ہو تو وہ اس کے لئے عیب ہے۔

عورت میں جو چیزیں خوبصورتی کی علامت ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس کا چہرہ کتابی ہو، یعنی کشادہ چہرے والی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، چوڑے سینے والی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، کشادہ پیشانی والی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، اسی طرح کشادہ کاندھوں والی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، جس عورت کی آنکھیں، ابروئیں، پلکیں اور بال کالے ہوں تو یہ اس کے لیے خوبصورتی کی علامت ہے، چار مقامات پر سفیدی ہونا عورت کے لیے حسن و جمال کی علامت ہے، اس کی رنگت سفید ہو، اس کی مانگ سفید ہو، اس کے اگلے دانت سفید ہوں، اس کی آنکھیں سفید ہوں۔

لمبائی کے لحاظ سے چار علامتوں کے باعث عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، اس کا قد و کاٹھ مناسب حد تک لمبا ہو، اس کی گردن لمبی ہو، اس کے بال لمبے ہوں، اس کے ہاتھوں کے پورے لمبے ہوں، باریکی کے لحاظ سے عورت میں خوبصورتی کی چار علامات پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ جس عورت کی کمر پتلی ہو وہ خوبصورت سمجھی جاتی ہے، جس عورت کی ناک پتلی ہو وہ خوبصورت سمجھی جاتی ہے، جس کی بھنویں پتلی ہوں وہ خوبصورت سمجھی جاتی ہے، جس کی مانگ باریک ہو وہ خوبصورت سمجھی جاتی ہے، کسی بھی عورت میں حسن و جمال کی خوبصورت ترین باتیں یہی سمجھی جاتی ہیں، مگر جنت کی عورت

ان چیزوں سے کہیں بڑھ کر زیادہ حسین ہو گی۔

قرآن کریم میں جنتی مردوں کو ملنے والی عورتوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قاصرات الطرف ہوں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی غیر کو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھیں گی، وہ اپنے حسن وجمال کو دوسروں پر ظاہر کرنے والی نہیں ہوں گی اور تانک جھانک کرنے والی بھی نہ ہوں گی۔

جنتی مردوں کو ملنے والی عورتوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ہم عمر ہوں گی ان کی پیدائش کا دن ایک ہو گا، ان کا سال ایک ہو گا، ان عورتوں کی عمر تینتیس سال ہو گی کمال کی خوبصورت ہوں گی، وہ بوڑھی نہیں ہوں گی جن کی عمر ڈھلنے کے باعث خوبصورتی ختم ہو اور نہ ہی بچے جننے والی ہوں گی کیونکہ بچے جننے کے باعث بھی ان کی خوبصورتی میں فرق پڑ جاتا ہے۔

جنت والوں کو جنت میں جو حوریں ملیں گی وہ زعفران سے بنائی گئی ہیں، ان کے چہروں کا نور اللہ تعالیٰ کے نور میں سے ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اللہ کے ولی کے لیے جنت میں ایسی بیوی ہو گی جو آدم اور حواء سے نہیں ہو گی بلکہ وہ زعفران سے بنی ہو گی، دنیا کی عورتوں کو اللہ نے مٹی سے بنایا، ان کے حسن وجمال سے دنیا پاگل ہوئی جارہی ہے تو جن کو اللہ نے زعفران سے بنایا ہے ان کے حسن وجمال کی کشش اور جاذبیت کیسی ہو گی، انسان تصور میں بھی نہیں لا سکتا، انسانی خیالات میں اس کی خوبصورتی نہیں آسکتی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حورا گر سات سمندروں میں اپنا تھوک پھینک دے تو اس کے منہ کی مٹھاس کی وجہ سے سات سمندروں کا پانی میٹھا ہو جائے، ایک روایت کے مطابق سات سمندروں کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایک نور پھیل جائے گا، جنت والے اپنے سر اٹھا کر دیکھیں گے تو یہ نور اس حور کے ہنسنے کی وجہ سے چمکے گا جو وہ اپنے خاوند کے سامنے ہنسے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ جنت کی حورا گر اپنا ہاتھ آسمان سے نیچے لہرا دے تو یہ زمین اس

طرح چمک اٹھے جس طرح سورج زمین والوں کے لیے چمکتا ہے، اگر اس حور کے ہاتھ کی چمک کا یہ عالم ہے تو اس کے چہرے کے حسن و جمال کا کیا عالم ہو گا۔

جنت کی ایک حور کا نام لُعبہ ہے، جس پر ساری حوریں تعجب کرتی ہیں، اپنے ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھ کر اسے کہتی ہیں کہ اے لُعبہ! تجھے مبارک ہو، اگر تیرے طلب گار تیری خوبیوں سے آگاہ ہو جائیں تو وہ کوشش میں لگ جائیں، لُعبہ کی پیشانی پر اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ مَنْ كَانَ يَبْتَغِي أَنْ يَكُونَ لَهُ مِثْلِي فَلْيَعْمَلْ بِرِضَاءِ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ (حادی الارواح) جو شخص اس تلاش میں ہے کہ اس کے لیے میری طرح کوئی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ میرے رب کی رضا کے مطابق عمل کرے۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک حکیم نے دوسرے حکیم سے ملاقات کے دوران پوچھا کہ کیا تجھے جنت کی حور کا شوق ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، دوسرے حکیم نے کہا کہ جنت کی حور کا شوق رکھو، اس لیے کہ اس کے چہرے کا نور اللہ کے نور سے ہے، یہ بات سن کر وہ حکیم بے ہوش ہو کر گر پڑا، اس کو اٹھا کر اس کے گھر تک لیجایا گیا، ایک مہینہ تک ہم اس حکیم کی بیمار پرسی کرتے رہے۔ (حادی الارواح الی بلاد الافراح ص ۲۳۵)

ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب صفۃ الجنہ میں لکھا ہے کہ یہ حکیم موصل کا رہنے والا تھا، یہ بات بھی ان کے درمیان موصل میں ہوئی تھی، موصل عراق کا ایک شہر ہے۔ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایسی ایسی حوریں ہیں کہ ان کے حسن و جمال پر اہل جنت ایک دوسرے کے سامنے فخر کرتے ہیں، اگر اللہ نے جنت والوں کے لیے یہ بات نہ لکھ دی ہوتی کہ انہیں جنت میں موت نہیں آئے گی تو جنت والے اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے جاتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر جنت کی حور آسمان اور زمین کے درمیان اپنی ہتھیلی لہرا دے تو اللہ کی مخلوق کو اس کا حسن و جمال آزمائش میں ڈال دے، اگر اس کا نصف لہرا دے تو سورج

اس کے حسن کے سامنے یوں ہو جس طرح سورج کے سامنے چراغ رکھ دیا جائے تو اس کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، اگر وہ حور اپنا چہرہ ظاہر کر دے تو اس کا حسن و جمال آسمان و زمین کے درمیان سارے خلاء کو چمکا دے۔ (حادی الارواح) حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِنَ الْحُورِ بَدَا مِعْصَمُهَا لَذَهَبَ ضَوْءُ الشَّمْسِ (صفت الجنہ) اگر جنت کی حور اپنی کلائی ظاہر کر دے تو سورج کی روشنی غائب ہو جائے۔

جنت کی حوریں جب رب العالمین کی مدح سرائی کرتی ہیں، ایک تسبیح پڑھتی ہیں تو ان کی تسبیح کو سن کر جنت کے تمام درخت وِرد کرنے لگتے ہیں۔ حورانِ بہشت جنت کے دروازے پر اپنے خاوندوں کا ان الفاظ میں استقبال کریں گی

نَحْنُ الْخَالِدَاتِ فَلَا نَمُوْتُ وَنَحْنُ النَّاعِمَاتِ فَلَا نَيْأَسُ أَبَدًا
وَنَحْنُ الْمُقِيمَاتِ فَلَا نَظْعَنُ أَبَدًا وَنَحْنُ الرَّاضِيَاتِ فَلَا نَسْخَطُ أَبَدًا
طُوْبٰى لِمَنْ كُنَّا لَهُ وَكَانَ لَنَا۔

ہم ہمیشہ رہیں گی کبھی نہیں مریں گی، ہم ہمیشہ تر و تازہ رہیں گی کبھی بوسیدہ نہیں ہوں گی، ہم ہمیشہ رہیں گی کبھی کوچ نہیں کریں گی، ہم ہمیشہ خوش و خرم رہیں گی کبھی ناراض نہیں ہوں گی، مبارک ہو اس شخص کو جس کے لیے ہمیں بنایا گیا ہے اور وہ ہمارے لیے بنایا گیا۔ (حادی الارواح)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لِكُلِّ امرِءٍ مِّنهُم زَوجَتَانِ اثنَتَانِ يُرىٰ مُخُّ سُوقِهِمَا مِن وَّرَاءِ اللَّحمِ ہر جنتی کے لیے دو بیویاں ہوں گی، ان کی پنڈلی کا گودا ان کے گوشت کے اس پار سے دکھائی دے گا۔ (حادی الارواح الی بلاد الافراح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لِلرِّجَالِ مِنْ أَهلِ الجَنَّةِ زَوْجَتَانِ مِنَ الحُوْرِ العِيْنِ عَلَى كُلِّ وَاحِدَةٍ سَبعُوْنَ حُلَّةً يُرىٰ مُخُّ سَاقِهَا مِنْ وَّرَاءِ الثِّيَابِ جنتی مردوں کے لیے جنت میں دو موٹی آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ہر حور کے جسم پر ستر جوڑے ہوں

گے، ان کی پنڈلی کا گودا اس کے ان جوڑوں کے پار سے دکھائی دے گا۔ (حادی الارواح)

ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کلبی کہتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ أَنَّ الْمُؤْمِنَ، يُزَوَّجُ فِي الْجَنَّةِ أَرْبَعَةَ آلَافِ بِكْرٍ، وَثَمَانِيَةَ آلَافِ ثَيِّبٍ، وَخَمْسَمِائَةِ حُورٍ مومن کو جنت میں چار ہزار کنواریوں، آٹھ ہزار ثیبات اور پانچ سو حوروں سے شادی کرائی جائے گی۔ (صفۃ الجنۃ لابن ابی الدنیا ص ۲۰۴) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ الْمُؤْمِنُ كُلَّمَا أَرَادَ زَوْجَتَهُ فِي الْجَنَّةِ وَجَدَهَا عَذْرَاءَ مومن جب بھی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے گا تو ہر بار اسے ایسا پائے گا جیسے کہ وہ کنواری ہے۔ (صفۃ الجنۃ لابن ابی الدنیا)

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل جنت جنت میں چلے جائیں گے تو اس کے بعد وہ جنت میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے، کہیں اور نہیں جائیں گے اور نہ ہی ان پر موت آئے گی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے تو ان کے درمیان ایک آواز لگانے والا کھڑے ہو کر (کہے گا) اے دوزخ والو! (اب) موت نہیں آئے گی اور اے جنت والو! اب موت نہیں آئے گی ہر ایک اس میں ہمیشہ رہے گا جو جہاں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا موت کو چت کبرے مینڈے کی صورت میں لایا جائے گا اور اس کو پل صراط پر کھڑا کیا جائے گا، پھر کہا جائے گا اے جنت والو! وہ دیکھیں گے خوف کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اس بات سے کہ کہیں ان کو اس جگہ سے نکال نہ دیا جائے ان سے پوچھا جائے گا کیا تم اس کو جانتے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں یہ موت ہے پھر کہا جائے گا اے دوزخ والو! وہ متوجہ ہوں گے خوش ہوتے ہوئے کہ ان کو اس (دوزخ) سے نکالا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم اس کو جانتے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں! یہ موت ہے پھر اس (موت) کے لئے حکم دیا جائے گا اور اس کو پل صراط پر ذبح کر دیا جائے گا۔ (اس کے بعد) فریقین (یعنی جنتی اور دوزخی دونوں) سے کہا جائے گا جس جس جگہ تم ہو اس میں ہمیشہ رہو گے، اس میں کبھی موت نہیں آئے گی۔ (عبد بن حمید، ابن ماجہ)

مکھی، مچھر کی مثالیں، اہل ایمان اور کفار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (۲۶) الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۲۷) (البقرہ)

جواب ترجمہ: بیشک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ (کسی بات کو واضح کرنے کے لئے) کوئی بھی مثال دے، چاہے وہ مچھر (جیسی معمولی چیز) کی ہو، یا کسی ایسی چیز کی جو مچھر سے بھی زیادہ (معمولی) ہو اب جو لوگ مومن ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال ایک حق بات ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے، البتہ جو لوگ کافر ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ بھلا اس (حقیر) مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ اس طرح اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے مگر وہ گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہیں، وہ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ایسے ہی لوگ بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے معبودوں کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا (اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے) اور (جھوٹے) معبودوں کے مکر کو ذکر کرتے ہوئے ان کو عنکبوت (مکڑی) کے گھر سے تشبیہ دی تو مشرکین کہنے لگے کیا تم نے دیکھا کس طرح اللہ تعالیٰ نے

مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا اور اس کو اس قرآن میں اتارا جس کو محمد ﷺ پر اتارا گیا، وہ ان مثالوں سے کیا چاہتا ہے ؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا بے شک اللہ تعالیٰ مچھر کی یا اس سے بڑی چیز کی مثال بیان کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ (در منثور)

حضرت قتادہؒ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عنکبوت (مکڑی) اور ذباب (مکھی) کا ذکر فرمایا تو مشرکوں نے کہا مکڑی اور مکھی کو کیوں ذکر کیا جاتا ہے ؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا بے شک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتے اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کریں مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔ (ابن ابی حاتم، تفسیر در منثور)

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ : اہل ایمان قرآنی مثالوں پر پریشان نہیں ہوتے، اعتراضات نہیں کرتے، بلکہ وہ ان سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور انہیں حق سمجھتے ہیں، وہ دل و جان سے سمجھتے ہیں کہ یہ مثال اللہ ہی کی طرف سے ہے، یہ حق و صداقت اللہ ہی کی طرف سے ہے، اہل ایمان ان مثالوں کو اللہ کی طرف سے جانتے ہوئے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا : منافقین، مشرکین اور کفار قرآنی مثالوں پر انگشت نمائی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مچھر، مکھی، مکڑی جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں کیوں بیان کرتے ہیں، اللہ کا مقصد کیا ہے ان مثالوں کو بیان کرنے سے، کافر انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار ؟ یہ اس شخص کا سوال ہے جس کی نظروں سے اللہ کا نور اور اس کی حکمت اوجھل ہے۔ وہ سنت الٰہی اور تدبیر الٰہی کو نہیں جانتا۔ ایسا سوال وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا کوئی احترام نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو ان نظروں سے نہیں دیکھتے جن سے انہیں اللہ کا ایک بندہ اور فرمانبردار غلام دیکھتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی تو بطور اعتراض اور ناپسندیدگی ایسی باتیں کرتے ہیں، یا وہ ایسی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا

کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسی باتیں کر سکتا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ: اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں ان ہی کو مبتلا کر دیتا ہے جو فاسق ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ہے کہ وہ انسانوں کو امتحان اور ابتلا میں ڈالتا ہے ان آزمائشوں اور ابتلاؤں میں ہر انسان مقتضائے طبیعت اور استعداد کے مطابق طرز عمل اختیار کرتا ہے، ہر شخص کی روش اس طریق حیات کے مطابق ہوتی ہے جو اس نے اپنے لئے پسند کیا ہوتا ہے، آزمائش ایک ہی ہوتی ہے لیکن مختلف نظام ہائے زندگی اختیار کرنے والے لوگوں پر اس کے اثرات مختلف ہوتے ہیں مثلاً مصیبت اور تکلیف ہی کو لے لیجئے، سب لوگ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں، مومن بھی اور فاسق بھی ایک صالح جو اللہ کی رحمتوں اور حکمتوں پر پختہ یقین رکھتا ہے وہ جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ زیادہ خشیت، زیادہ عاجزی اور تضرع سے اللہ کے سامنے ملتجی ہوتا ہے۔

لیکن اگر ایک فاسق تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کے قدم اکھڑ جاتے ہیں، وہ اللہ سے اور بعید ہو جاتا ہے، وہ مومنین کی صفوں سے نکل جاتا ہے، اسی طرح خوشحالی اور تکاثر کو لے لیجئے کہ بعض لوگ اس آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ایک مومن جب زیادہ انعامات اور اکرامات پاتا ہے تو وہ زیادہ بیدار ہو جاتا ہے، وہ شکر الٰہی میں پہلے سے بھی زیادہ حساس ہو جاتا ہے، لیکن جب ایک فاسق کو سہولتیں ملتی ہیں تو وہ اسے برباد کر دیتی ہیں، وہ غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور گمراہی کی روش اختیار کرتا ہے۔

اسی طرح اللہ نے لوگوں کے لئے جو تمثیلیں بیان کیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ان سے بھی وہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو اچھی طرح قبول نہیں کرتے، وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا اور بہتوں کو راہ ہدایت دکھا دیتا ہے۔ اور یہ وہ لوگ

ہوتے ہیں جو حکمت باری کو جانتے ہوتے ہیں اور گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل پہلے سے فاسق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہدایت اور اصلاح کی روش سے نکل جاتے ہیں لہٰذا ان کا صلہ یہی ہے کہ ان کی اس ضلالت میں اور اضافہ کر دیا جائے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ: یہاں ان فاسقوں کے کچھ اوصاف بیان کیے جارہے ہیں جو اللہ کی بیان کردہ مثالوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان پر لب کشائی کرتے ہیں اور درونی پلیدی ظاہر کرتے ہیں، ان کا ایک وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کیے گئے پختہ عہد و پیمان کو توڑتے ہیں، علماء کا اس عہد کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیا تھا جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا، بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی اپنی مخلوق کو وصیت اور اس کا امر ہے جو اس نے انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نہی ہے جو اس نے اپنے رسولوں کی زبان کے ذریعے اپنی کتب میں اپنی نافرمانی سے روکا ہے اور اس کا نقض اس کے احکام پر عمل کو چھوڑنا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس نے آسمانوں، زمین اور دوسری اپنی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنی وحدانیت پر دیئے ہیں یہ عہد کے قائم مقام ہیں اور ان کا توڑنا ان میں غور و فکر کو ترک کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ عہد ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ محمد ﷺ کی نبوت کو بیان کریں اور ان کے امر کو نہ چھپائیں، اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہو گی۔

ابو اسحاق الزجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء اور ان کے پیروکاروں سے لیا کہ وہ نبی مکرم ﷺ کا انکار نہ کریں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا

مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (۸۱)

اور (ان کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ: اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا کہ: کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا: ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: تو پھر (ایک دوسرے کے اقرار کے) گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی میں شامل ہوں۔ (قرطبی) امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہ اقوال نقل فرمانے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کا ماقبل اور مابعد ظاہر کرتا ہے کہ یہ آیت کافروں کے بارے میں ہے، ان میں دوسرے قول کو امام قرطبی نے سب اقوال میں جامع قرار دیا ہے۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ عہد سے مراد اکثر مفسرین نے وہ عہد الست لیا ہے جس کا ذکر سورۃ اعراف (۷: ۱۷۲) میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے سے بہت پہلے آنے والی تمام روحوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے کا اقرار کر کے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے، پھر اس آیت میں عہد کو پختہ کرنے سے مراد بظاہر یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے رسول آتے رہے جو اس عہد کو یاد دلا کر اللہ تعالیٰ کے خالق و مالک ہونے پر دلائل قائم کرتے رہے۔

اس عہد کی ایک اور تشریح بھی ممکن ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد وہ عملی اور خاموش عہد ہے جو ہر انسان پیدا ہوتے ہی اپنے خالق و مالک سے کرتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے ہر شخص جو کسی ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ اس ملک کا شہری ہونے کے ناطے یہ خاموش عہد کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین کا پابند ہو گا خواہ زبان سے اس نے کچھ نہ کہا ہو لیکن اس کا کسی ملک میں پیدا ہونا ہی اس عہد کے

قائم مقام ہے۔ اسی طرح کائنات میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے وہ خود بخود اس عہد کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارے گا۔ اس عہد کے لئے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اگلی آیت میں باری تعالیٰ نے فوراً یہ ارشاد فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا طرز عمل آخر کیسے اختیار کر لیتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اسی نے تمہیں زندگی بخشی" یعنی اگر ذرا غور کرو تو تنہا یہ بات کہ کسی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

تمہاری طرف سے یہ عہد و پیمان ہے کہ تمہارے لئے ان کی نعمتوں کا اعتراف اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنا لازمی ہو گا، ورنہ یہ کونسی عقل اور کونسا انصاف ہے کہ پیدا تو اللہ تعالیٰ کرے اور فرمانبرداری اس کے بجائے کسی اور کی کی جائے، پھر اس خاموش عہد کو مزید پختہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے متواتر تمہیں اس عہد کی یاد دہانی کراتا رہا ہے اور ان پیغمبروں نے وہ مضبوط دلائل تمہارے سامنے پیش کئے ہیں جن سے یہ عہد مزید پختہ ہو گیا ہے کہ انسان کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی ہے۔ (توضیح القرآن)

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ: یہاں ان کی ایک اور بری خصلت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جس چیز کو ملانے کا حکم اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں یہ اسی چیز کو بجائے ملانے کے کاٹ کر رکھ دیتے ہیں، شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی آیت کے اس حصہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد رشتہ داروں کے وہ حقوق پامال کرنا ہے جنہیں صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ (توضیح القرآن)

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ: اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تیسری خصلت وصفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ زمین میں فساد مچاتے ہیں، مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ دوسری اور تیسری چیز کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اللہ تعالیٰ نے مختلف رشتوں کے جو حقوق مقرر فرمائے ہیں، ان کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی سے ہی ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، اگر ان رشتوں کو کاٹ کر باپ، بیٹے، بھائی، شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنا شروع کر دیں تو وہ خاندانی نظام تباہ ہو جاتا ہے جس پر

ایک صحت مند تمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے، لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ زمین میں فساد کی صورت میں نکلتا ہے (توضیح القرآن) اللہ تعالیٰ کے عہد وپیمان کو توڑنے، رشتہ داری تعلق داری کو کاٹنے اور زمین میں فساد مچانے کا نتیجہ بھی آخر میں بیان کر دیا کہ یہ لوگ نقصان میں ہیں، دنیا میں جن جن لوگوں کے ساتھ زیادتی کی اس کے نتیجے میں بدنامی اور رسوائی ہوئی اور آخرت میں اس کا نتیجہ اور پھل دوزخ کی سزا کی صورت میں ملا۔

انسان کی دو موتیں اور دو زندگیاں

سوال انسان کے لئے کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہیں؟

جواب انسان کی دو موتیں اور دو زندگیاں ہیں، اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت مبارکہ دلیل ہے

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ {۲۸} البقرہ

(کافرو!) تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (سورۃ البقرہ)

زندگی اور موت کے چار مراحل: اس آیت میں انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات کا ذکر ہے، پہلے موت، پھر زندگی، پھر موت، پھر زندگی۔ روح اور جسم کے اتصال کا نام زندگی اور ان کے انفصال کا نام موت ہے، پہلی حالت موت ہے یعنی جملہ انسانوں کی ارواح تو پیدا ہو چکی تھیں، لیکن جسم اپنے اپنے وقت پر عطا ہوئے، اسی عرصہ میں عہد الست لیا گیا تھا، دوسری حالت انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک ہے، جس میں وہ اچھے یا برے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے، تیسری حالت موت سے لے کر حشر تک اور چوتھی اور آخری حالت دوبارہ جی اٹھنے (حشر) کے بعد لامتناہی زندگی ہے۔ یاد رہے کہ جن حالتوں کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے، ان میں بھی زندگی کی کچھ نہ کچھ رمق موجود

ہوتی ہے، مگر چونکہ غالب اثرات موت کے ہوتے ہیں، لہذا انہیں موت سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ پہلی موت کے درمیان ہی عہد الست لیا گیا تھا اور دوسری موت میں ہی انسان کو قبر کا عذاب ہوتا ہے اور دنیا میں بھی یہ حالت خواب سے سمجھا دی گئی ہے، کیونکہ خواب کی حالت میں انسان پر بیشتر اثرات موت کے غالب ہوتے ہیں، تاہم وہ عالم خواب میں چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور کئی طرح کے کام کرتا ہے اور خواب یا نیند کو حدیث میں موت کی بہن قرار دیا گیا ہے، زندگی کی نہیں۔

نیز سونے کے وقت یہ دعا سکھائی گئی ہے، اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيٰى نیز قرآنی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ موت سلبی چیز نہیں بلکہ ایجابی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے موت کو پہلے پیدا کیا تھا اور زندگی کو بعد میں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اعمال کے اعتبار سے اچھا ہے اور زیر مطالعہ آیت میں انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ جو ہستی تمہاری ذات پر اتنے وسیع تصرفات کی قدرت رکھتی ہے تم اس کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ (تفسیر تیسیر القرآن) مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کہ تم کچھ بھی نہیں تھے یہاں تک کہ تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دے گا سچی موت پھر تم کو زندہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ ہمارے رب نے ہم کو دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ فرمایا، اسی کے مثل ہے۔ (تفسیر در منثور)

آسمانوں کی پیدائش

سوال آسمان کتنے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا فرمائے، جیسا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَكُم مَّا فِی الأَرْضِ جَمِیعاً ثُمَّ اسْتَوَی إِلَی السَّمَاء فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیمٌ {۲۹} (البقرۃ) وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا

کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنادیا اور وہ ہر چیز سے خبر دار ہے۔

قدرت والے کی قدرت کا عظیم شاہکار: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ حضرات نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ اللہ کا عرش پانی پر تھا، پانی سے پہلے اللہ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی تھی، جب اللہ نے تخلیق کا ارادہ کیا تو پانی سے دھواں نکالا، دھواں پانی سے بلند ہو گیا، پھر اس کا نام اس نے آسمان رکھا، پھر پانی کو خشک کر کے زمین کو بنایا، پھر اس زمین کو پھاڑ کر دو دنوں میں سات زمینیں بنائیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے الاسماء والصفات میں اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر در منثور میں لکھا ہے کہ اللہ نے ہفتے اور اتوار دو دنوں میں زمینوں کو پیدا کیا، زمین کو اللہ نے مچھلی کی پشت پر رکھا، جس کا ذکر نون والقلم میں موجود ہے، مچھلی پانی میں ہے، پانی صفات کی پشت پر ہے، صفات فرشتے کی پشت پر ہے، فرشتہ ایک چٹان پر ہے، چٹان ہوا میں ہے، یہ وہ چٹان ہے جس کا ذکر حضرت لقمان علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ وہ نہ آسمان میں ہے اور نہ ہی زمین میں ہے، مچھلی نے حرکت کی تو اللہ نے زمین میں پہاڑوں کو گاڑ دیا، پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں دھواں پانی کے سانس لینے سے پیدا ہوا، پھر اس کا آسمان بنایا، پھر اسے پھاڑ کر دو دنوں میں سات آسمان بنائے، جمعرات اور جمعہ کے دن، جمعہ کو جمعہ اسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں زمین اور آسمان کی پیدائش کو جمع کیا گیا، ہر آسمان میں اس کی مخلوق کو پیدا کیا گیا، فرشتے، دریا، ٹھنڈے پہاڑ، اور ایسی ایسی مخلوقات جن کا علم بھی نہیں ہے، پھر ان آسمانوں کو ستاروں کے ساتھ خوبصورت بنایا، انہیں مزین کیا اور ان کی شیاطین سے حفاظت فرمائی۔ (در منثور)

کون سے دن کونسی چیز پیدا کی گئی؟: امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاسماء والصفات میں اور جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر در منثور میں ذکر فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خَلَقَ اللهُ التُّرْبَةَ يَوْمَ السَّبْتِ وَخَلَقَ الْجِبَالَ يَوْمَ الْأَحَدِ وَخَلَقَ الشَّجَرَ يَوْمَ

الإِثْنَيْنِ وَخَلَقَ الْمَكْرُوهَ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَخَلَقَ النُّورَ يَوْمَ الْأَرْبَعَاءِ وَبَثَّ فِيهَا الدَّوَابّ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَخَلَقَ آدَمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ۔ (الدر منثور)

اللہ نے مٹی کو ہفتے کے دن، پہاڑوں کو اتوار کے دن، درختوں کو پیر کے دن، مکروہ چیزوں کو منگل کے دن، روشنی کو بدھ کے دن، زمین میں جانوروں کو پھیلایا جمعرات کے دن اور حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا فرمایا۔

آسمانوں کے درمیان فاصلہ: حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كُنَّا عِنْدَ النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم فَقَالَ: هَل تَدْرُونَ كَم بَينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْض قُلْنَا: الله وَرَسُولُهُ أَعلَمُ قَالَ: بَينَهُمَا مَسِيرَة خَمْسِمِائَة عَامٍ وَمن مسيرَة سَمَاء إِلَى سَمَاء مسيرَة خَمْسِمِائَة عَام و كثف كل سَمَاء خَمْسِمِائَة سنة وَفَوق السَّمَاء السَّابِعَة بَحرٌ بَين أَعْلَاهُ وَاَسفله كَمَا بَين السَّمَاءِ وَأَرْض ثمَّ فَوقَ ذَلِك ثَمَانِيَة أوعال بَين وركهن وأظلافهن كَمَا بَينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ثمَّ فَوقَ ذَلِكَ الْعَرْشِ بَين أَسْفَلِهِ وَأَعلَاهُ مَا بَينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَالله سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عِلمُه فَوقَ ذَلِك وَلَيْسَ يخفى عَلَيْهِ من أَعمال بنى آدم شَيْءٌ (تفسیر در منثور)

ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان کتنی مسافت ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے، اسی طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے، ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت کی ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے، اس کے اوپر والے حصے اور نیچے والے حصے کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، پھر اس کے اوپر آٹھ فرشتے ہیں ان کی رانوں کے اوپر سے لے کر ان کے پاؤں تک اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کے درمیان کا فاصلہ ہے، پھر اس کے اوپر اللہ کا عرش ہے، اس کے اوپر والے حصے اور نیچے والے حصے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ آسمان

اور زمین کے درمیان کا فاصلہ ہے، رب تعالیٰ کا علم اس کے اوپر ہے، بنی آدم کے اعمال میں سے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

کرسی اور آسمان کے درمیان فاصلہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے وَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْكُرْسِيِّ مَسِيرَةُ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ وَمَا بَيْنَ الْكُرْسِيِّ وَالْمَاءِ مسيرَةُ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ وَالْعَرْشُ عَلَى الْمَاءِ وَاللهُ فَوقَ الْعَرْشِ وَهُوَ يَعلَمُ مَا أَنْتُم عَلَيْهِ (درمنثور) آسمان سے کرسی کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، کرسی اور پانی کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، اللہ کا عرش پانی پر ہے، اللہ عرش پر جلوہ افروز ہے، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتا ہے۔

سات آسمان کس کس چیز سے بنائے گئے؟: ابو الشیخ رحمہ اللہ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ السَّمَاءُ الدُّنْيَا مَوجٌ مَّكفُوفٌ وَالثَّانِيةُ مَرمَرَةٌ بَيْضَاءُ وَالثَّالِثَةُ حَدِيدٌ وَالرَّابِعَةُ نُحَاسٌ وَالْخَامِسَةُ فِضَّةٌ وَالسَّادِسَةُ ذَهَبٌ وَالسَّابِعَةُ يَاقُوتَةٌ حَمْرَاءُ وَمَا فَوقَ ذَلِكَ صَحَارِىُ مِن نُور وَلَا يَعلَمُ مَا فَوقَ ذَلِكَ إِلَّا اللهُ وَمَلَكٌ مُوَكَّلٌ بِالحُجُبِ يُقَال لَهُ مِيطَاطُرُوش، آسمانِ دنیا ایک بند موج ہے، دوسرا آسمان سفید مرمر کا ہے، تیسرا آسمان لوہے کا ہے، چوتھا آسمان تانبے کا ہے، پانچواں آسمان چاندی کا ہے، چھٹا آسمان سونے کا ہے، ساتواں آسمان سرخ یاقوت کا ہے، اس کے اوپر نور کے صحرا ہیں، اس کے اوپر کیا ہے؟ اللہ کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا، نور کے پردوں کی حفاظت جس فرشتے کے سپرد کی گئی ہے اس کا نام میطاطروش ہے۔ (مسند اسحاق بن راہویہ)

سات آسمانوں کی رنگت اور ان کے نام: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے السَّمَاءُ الدُّنْيَا من زمردة خضراء وَاسْمهَا رقيعاء وَالثَّانِيةُ من فضَّة بَيْضَاء وَاسْمهَا أزقلون وَالثَّالِثَة من ياقوتة حَمْرَاء وَاسْمهَا قيدوم وَالرَّابِعَةُ من دُرَّة بَيْضَاء وَاسْمهَا ماعونا وَالْخَامِسَةُ مِن ذهبة حَمْرَاء وَاسْمهَا ريقا وَالسَّادِسَةُ من ياقوتة صفراء وَاسْمهَا دقناء وَالسَّابِعَةُ من نور وَاسْمهَا عريبا، آسمان دنیا سبز رنگ کے زمرد کا ہے، اس کا نام رقیعاء ہے، دوسرا آسمان سفید رنگ کی چاندی

کا ہے اس کا نام از قلون ہے، تیسر آسمان سرخ یاقوت کا ہے اس کا نام قیدوم ہے، چوتھا آسمان سفید رنگ کے موتی کا ہے، اس کا نام ماعون ہے، پانچواں آسمان سرخ سونے کا ہے اس کا نام ریقا ہے، چھٹا آسمان زرد یاقوت کا ہے اس کا نام دقناء ہے، ساتواں آسمان نور سے ہے اس کا نام عربیا ہے۔ (در منثور، ابو الشیخ) حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پہلے آسمان کا نام رقیع ہے، جب کہ ساتویں آسمان کا نام صراخ ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق جس آسمان پر عرش ہے وہ سارے آسمانوں کا سردار ہے اور جس زمین پر تم لوگ رہتے ہو یہ ساری زمینوں کی سردار ہے۔

آسمان پہلے پیدا کیے گئے یا زمین؟

سوال قرآن کریم میں کچھ آیات ایسی ہیں جن میں فرمایا گیا کہ زمین پہلے پیدا کی گئی اور ایک آیت ایسی ہے جس میں فرمایا گیا کہ زمین کو آسمان کے بعد بچھایا گیا، تو ان آیات میں تعارض ہے، اس تعارض کو علماء تفسیر کے ارشادات کی روشنی میں دور کیجیے۔ وہ آیات جن سے پتا چلتا ہے کہ زمین پہلے پیدا کی گئی اور آسمان بعد میں پیدا کیا گیا وہ یہ ہیں،

① قرآن کریم میں سورۃ البقرہ کی آیت هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۹) (البقرہ) وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز سے خبر دار ہے، اس آیت سے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پہلے پیدا کیا اور آسمان اس کے بعد پیدا کیے۔

② سورۃ فصلت میں ارشاد ہے قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۹) وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (۱۰) ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا

وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (۱۱)(فصلت)

آپ فرمادیجیے کیا تم ایسی ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا فرمایا اور تم اس کے لیے شریک تجویز کرتے ہو وہ سارے جہانوں کا رب ہے، اور اس نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے جو اس کے اوپر اُبھرے ہوئے ہیں اور اس میں برکت ڈال دی اور اس میں توازن کے ساتھ اس کی غذائیں پیدا کیں، سب کچھ چار دن میں، تمام سوال کرنے والوں کے لیے تشفی ہے، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی، دونوں نے کہا: ہم خوشی خوشی آتے ہیں، اسی طرح اس آیت سے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پہلے پیدا کیا اور آسمان کو بعد میں پیدا کیا۔

③ اور سورۃ النازعات میں ہے أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا (۲۷) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا (۲۸) وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا (۲۹) وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا (۳۰) (النازعات)

(اے لوگو! ذرا سوچو!) کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ اس نے اسے تخلیق کیا، اللہ نے اس کو بنایا اس کی چھت کو بلند کیا، سو اسے درست بنایا، اور اس کی رات کو اندھیری بنایا ہے، اور اس کے دن کی دھوپ باہر نکال دی ہے اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا ہے۔

جواب علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں، علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم المعروف علامہ خازن رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن) میں، علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں ان آیات کی اس انداز میں وضاحت اور تفسیر فرمائی ہے کہ ان آیات میں کسی قسم کا تعارض دکھائی نہیں دیتا، علامہ محمد انور گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب انوار الدرایہ میں کئی صفحات پر مشتمل ان تفسیری حواشی کو نقل فرمایا ہے۔

اس تعارض کو دور کرنے کے تین طریقے ہیں ① وہ آیات جن میں فرمایا گیا کہ زمین پہلے پیدا کی گئی ان کو اصل قرار دے کر آسمان کو پہلے پیدا کرنے والی آیات میں تاویل کی جائے۔ ② وہ آیات جن میں فرمایا گیا کہ آسمان پہلے پیدا کیے گئے ان کو اصل قرار دے کر زمین کو پہلے پیدا کرنے والی آیات میں تاویل کی جائے۔ ③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ان آیات کی ایسی توجیہات پیش کی جائیں جن سے دونوں قسم کی آیات اپنے اصل پر رہیں اور تعارض ختم ہو جائے، ان طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس تعارض کے بظاہر چار جوابات ہیں۔

① تعارض کو رفع کرنے کے لیے پہلا جواب یہ ہے کہ وہ آیات جن میں فرمایا گیا کہ زمین پہلے پیدا کی گئی وہ اپنے اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو پیدا فرمایا اور جو کچھ پہاڑ، درخت اور نہریں وغیرہ پیدا فرمائیں، اس کے بعد آسمان کو پیدا فرمایا جیسا کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ فصلت کی آیات سے واضح ہوتا ہے، اس کی تائید سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع صحیح روایت سے بھی ہوتی ہے

إِنَّ الْيَهُوْدَ أَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَتْهُ عَنْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَقَالَ: خَلَقَ اللهُ تَعَالَى الْأَرْضَ يَوْمَ الْأَحَدِ وَالِاثْنَيْنِ، وَخَلَقَ الْجِبَالَ وَمَا فِيهِنَّ مِنَ الْمَنَافِعِ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ، وَخَلَقَ يَوْمَ الْأَرْبَعَاءِ الشَّجَرَ وَالْمَاءَ وَالْمَدَائِنَ وَالْعِمْرَانَ وَالْخَرَابَ، فَهٰذِهِ أَرْبَعَةٌ فَقَالَ تَعَالَى: قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ وَخَلَقَ يَوْمَ الْخَمِيسِ السَّمَاءَ، وَخَلَقَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ النُّجُوْمَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْمَلَائِكَةَ (ابن جریر، تفسیر روح المعانی، انوار الدرایہ)

یہود نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کے دن زمین کو پیدا کیا، پہاڑوں اور باقی منافع

کو منگل کے دن پیدا کیا اور بدھ کے دن درختوں، پانی، شہروں، آبادیوں اور کھنڈرات کو پیدا فرمایا، پس یہ چار دن ہو گئے اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کر دیا اور تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو یہی سارے جہان کا رب ہے اور اسی نے زمین میں پہاڑ بنا دیے اور اس میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس کی غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں، تمام سوال کرنے والوں کے لیے تشفی ہے، جمعرات کے روز آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کیے۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا، اسی طرح ایک اور مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کے روز زمین کو پیدا کیا اور منگل کے روز پہاڑوں اور ٹیلوں کو پیدا کیا، بدھ کے دن درختوں کو پیدا کیا، جمعرات اور جمعہ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا۔ (حاشیہ جلالین بحوالہ انوار الدرایہ)

عقلی طور پر بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ زمین بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور آسمان چھت کے درجہ میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آسمان کو سقف محفوظ (محفوظ چھت) قرار دیا ہے اور بنیاد پہلے قائم کی جاتی ہے بعد میں چھت ڈالی جاتی ہے، اس لیے زمین کی پیدائش آسمانوں کی پیدائش سے پہلے ہوئی۔ (انوار الدرایہ مشکلات القرآن)

جہاں تک سورۃ النازعات کی آیت کا ذکر ہے جس میں فرمایا گیا کہ زمین کو آسمانوں کی پیدائش کے بعد بچھایا اور پھیلایا گیا، اس میں دو طرح سے تاویل کی گئی ہے، (۱) اَلْاَرْض سے پہلے تَدَبَّر، تَذَکَّر یا اُذْکُر فعل محذوف ہے اور بَعْدَ ذَالِكَ اس فعل محذوف کا ظرف ہے اور دَحٰهَا جملہ مستانفہ ہے اور آیت شریفہ سے یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ زمین کی پیدائش آسمان کی پیدائش کے بعد ہوئی بلکہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا اور یاد دلانا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو آسمانی نعمتوں کی معلومات ہو گئیں تو اس کے بعد زمینی نعمتوں کو یاد کیجیے، ان میں تدبر و تفکر کیجیے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو بچھایا اس

میں سمندروں، دریاؤں اور نہروں کو جاری کیا اس سے چشمے نکالے اور اس سے نباتات اور اشجار کو نکالا اور اس پر پہاڑ جما دیے۔ (انوار الدرایہ)

(۲) بَعدُ، مَعَ کے معنیٰ میں ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بَعدَ ذَالِكَ کی تفسیر مَعَ ذَالِكَ کے ساتھ نقل کی ہے، آیت شریفہ کا مطلب یہ ہو گا کہ حق تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہ آسمان بنایا اس کی چھت کو بلند کیا اس کو درست کیا، اس کی رات کو تاریک بنایا، اس کے دن کو ظاہر کیا اور صرف یہی نعمتیں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی نعمتیں عطا فرمائیں کہ زمین کو بچھایا اس میں سے پانی اور نباتات کو نکالا، اس پر پہاڑ پیدا کیے، یہ سب چیزیں حق تعالیٰ نے تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے نفع کے لیے پیدا فرمائی ہیں، پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں تخلیق ارض (زمین کی پیدائش) کے تاخر (بعد میں ذکر کرنا) کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے ان دونوں تاویلات کے بعد آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (مشکلات القرآن، انوار الدرایہ ص ۲۰، ۱۹)

② تعارض کو رفع کرنے کے لیے دوسرا جواب یہ ہے کہ آسمانوں کی زمین سے پہلے پیدائش والی آیت اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کو پیدا کیا اس کے بعد زمین کو پیدا کیا، جیسا کہ سورت النازعات کی آیت سے معلوم ہوتا ہے، امام واحدی نے البسیط میں حضرت مقاتل سے یہی نقل کیا ہے، محققین میں سے بہت سے حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اکثر ان آیات میں جن میں آسمان و زمین کا ذکر آیا ہے آسمانوں کو زمین کے ذکر سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

جب اکثر آیات میں آسمانوں کا ذکر زمین سے پہلے ہے تو معلوم ہوا کہ آسمان زمین سے پہلے ہی پیدا کیے گئے، دوسری دلیل یہ ہے کہ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اشرف کو غیر اشرف پر مقدم کیا جائے اور آسمان ذات اور صفت دونوں کے لحاظ سے زمین سے اشرف ہے، آسمان مقدار میں بھی زمین سے بڑا ہے اور مکان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ اور ارفع ہے پس اشرف یعنی آسمان کی پیدائش

کا غیر اشرف یعنی زمین کی پیدائش سے پہلے ہونا حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے۔(انوار الدرایہ مشکلات القرآن، مصنف کی تحریر میں کچھ الفاظ عام پڑھنے والوں کے لیے آسان کر کے شامل کر دیے ہیں، تاکہ عام فہم عبارت ہر کسی کو سمجھ میں آئے، مفہوم اور عبارت مصنف ہی کی ہے۔(حدوٹی)

سورۃ البقرہ اور سورۃ فصلت کی جن آیات سے پتا چلتا ہے کہ زمین آسمانوں سے پہلے پیدا کی گئی ان میں چار تاویلیں کی گئی ہیں،(۱)ثُمَّ استَوٰی میں لفظ ثُمَّ واؤ کے معنٰی میں ہے جو مطلق جمعیت کے لیے آتی ہے، مقصود آسمان وزمین دونوں کی محض پیدائش کو بیان کرنا ہے، تقدیم (پہلے پیدا کرنا) وتاخیر (بعد میں پیدا کرنا) کے اعتبار سے ترتیب بیان کرنا مقصود نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں رہا۔

(۲)لفظ ثُمَّ اگرچہ ترتیب مع التراخی کے لیے آتا ہے لیکن تراخی فی الزمان کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی مجازاً تراخی فی الرتبہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، یہاں پر مجازاً تراخی فی الرتبہ کے لیے استعمال ہوا ہے جس سے آسمان کے بُعد رتبی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا مرتبہ زمین سے بعید اور اُونچا ہے، بُعد مانی اور تاخر زمانی کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔(انوار الدرایہ)

(۳) تیسری تاویل یہ ہے کہ لفظ خَلَقَ ایجاد اور تکوین کے معنٰی میں نہیں ہے بلکہ مجازاً تقدیر اور قضاء کے معنٰی میں مستعمل ہے، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین اور جو کچھ زمین میں ہے اسے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمادیا کہ عنقریب زمین اور جو کچھ اس میں ہے جن کے پیدا کرنے کا پہلے فیصلہ فرما چکے تھے پیدا کر دیا اس کو فرمایا وَالاَرضَ بَعدَ ذَالِكَ دَحٰهَا۔(انوار الدرایہ)

(۴)چوتھی تاویل یہ ہے کہ خَلَقَ سے پہلے اَرَادَ محذوف ہے یعنی هُوَ الَّذِی اَرَادَ اَن یَّخلُقَ لَكُم مَّافِی الاَرضِ جَمِیعًا، یعنی اس ذات نے ارادہ کیا کہ وہ تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کر دے جو زمین میں ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان سے پہلے زمین کو پیدا نہیں کیا بلکہ پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا کہ عن قریب زمین اور جو کچھ اس میں ہے کو پیدا کریں گے، پھر آسمانوں کو پیدا کر دینے کے بعد زمین کے پیدا کرنے کے ارادے کو مکمل فرمادیا، یعنی زمین اور زمین کے اندر جو کچھ

ہے اسے پیدا فرمادیا، جیسے سورۃ النازعات میں فرمایا کہ زمین کو اس کے بعد پھیلا دیا، تو اس طرح یہ تعارض بھی ختم ہو گیا۔

③ تعارض کو رفع کرنے کے لیے تیسرا جواب یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیتوں کو اپنے اصل اور ظاہر پر رکھتے ہوئے ایسی توجیہ کی جائے کہ تعارض دور ہو جائے، سو وہ توجیہ یہ ہے کہ ہر جسم کا ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت و شکل ہوتی ہے، مادہ کے اعتبار سے تو زمین کی پیدائش آسمانوں کی پیدائش سے پہلے ہوئی جیسا کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ فصلت میں ہے اور صورت و شکل کے اعتبار سے آسمانوں کی پیدائش زمین کی پیدائش سے پہلے ہے جیسے سورۃ النازعات میں ہے، حاصل اس کا یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے پہلے زمین کے مادہ کو پیدا کیا جو ایک کھرل (پتھر کا بنا ہوا ایک برتن ہوتا ہے جس میں اطباء دوا پیستے ہیں اور اس میں سرمہ بھی پیس لیا جاتا ہے) کی شکل میں تھا جیسا کہ حضرت حسنؓ سے مروی ہے، اس کے بعد آسمان کا مادہ بنایا جو دخان (دھواں) کی شکل میں تھا (انوار الدرایہ مفہوم وماخوذ)

④ تعارض کو رفع کرنے کے لیے چوتھا جواب بعض محققین نے دیا ہے کہ مادہ کے اعتبار سے آسمان کی پیدائش پہلے ہے اور صورت کے اعتبار سے زمین کی پیدائش پہلے ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے پہلے آسمان کا مادہ بنایا پھر زمین کا مادہ پیدا کیا، اس کے بعد زمین کی صورت و شکل بنائی پھر آسمان کی صورت بنائی۔ (روح المعانی)

خلاصہ کلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین پیدا فرمائی اس کے بعد آسمان پیدا فرمائے، جس آیت میں آسمان کی پیدائش زمین کے بعد ہونا معلوم ہوتی ہے اس کا جواب اہل علم نے واضح طور پر دیا ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بھی زمین کی پیدائش کو آسمانوں کی پیدائش سے پہلے تسلیم کیا ہے اور اسی کو درست مانا ہے۔

علامہ ابن اثیر اندلسی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا ثُمَّ کے لفظ سے بیان کی گئی ہے اور یہی بات درست ہے، سورۃ

النازعات کی جس آیت میں زمین کا آسمان کے بعد پھیلانے اور بچھانے کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستگی اور اس میں سے پیداوار نکالنے کا تفصیلی کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوا، اگرچہ اصل زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی۔ (البحر المحیط فی التفسیر)

خلافت آدم علیہ السلام کا اعلان اور فرشتوں کا معروض

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا، ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کریں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۳۰) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں وہ کہنے لگے۔ کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

سورۃ البقرہ میں گزشتہ رکوع کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم اللہ کی بندگی اور عبادت بجالاؤ، اس لیے کہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے جس نے تمہاری تخلیق کا اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا وہی بندگی کا مستحق اور لائق ہے، پھر رکوع کے درمیان میں کفار کے کفر پر حیرانگی کا اظہار بھی اسی بنا پر کیا گیا کہ تم کیونکر اور کیسے کفر کا ارتکاب کرتے ہو حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے، تمہیں وجود دیا، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے گا، اب یہاں انسان کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔

یہاں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہی زمین کی طرف پہلے رسول ہیں جیسا کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور یہ کہا جاتا ہے وہ کس کے لئے رسول تھے جبکہ زمین میں کوئی شخص تھا ہی نہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف رسول تھے، آپ کی اولاد چالیس تھی جو بیس بطنوں میں پیدا ہوئے تھے، ہر بطن میں جوڑا جوڑا پیدا ہوا، پھر ان کے بچے پیدا ہوئے حتیٰ کہ بہت سے لوگ ہو گئے۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے اوّل آسمان اور زمین اور ملائکہ کو پیدا کیا ملائکہ کو آسمان میں اور جنوں کو زمین میں بسایا، جن ایک مدت دراز تک زمین میں آباد رہے، پھر ان میں حسد، عداوت اور بغاوت پھیل گئی اور آپس میں فساد اور خون ریزی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک گروہ زمین کو ان مفسدوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا۔ ان فرشتوں کو بھی جن کہا جاتا تھا اور وہ فرشتے جنت کے محافظ تھے اور ان کا نام جن جنت سے مشتق کیا گیا ہے کیونکہ وہ جنت کے محافظ تھے اور ان سب کا سردار و مرشد اور سب سے زیادہ عالم ابلیس تھا تو وہ سب کے سب بحکم الٰہی زمین پر اترے اور جنوں کو پہاڑوں کی کھوؤں اور جزیروں میں نکال دیا اور خود زمین میں آباد ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت ان پر ہلکی فرما دی اور ابلیس کو زمین اور آسمان دنیا کی سلطنت اور جنت کی محافظت عطا فرمائی تو وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی عبادت زمین میں کرتا تھا کبھی آسمان میں کبھی جنت میں بس ان مراتب جلیلہ کے باعث اسے غرور ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ سلطنت و مرتبہ اس لیے عطا کیا ہے کہ میں سب فرشتوں سے زیادہ بزرگ ہو جاؤں تو حق تعالیٰ نے اسے اور اس کے لشکر کو ذیل کی آیت سے خطاب فرمایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں، علامہ

بغوی رحمہ اللہ کی روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ابلیس فرشتہ تھا اور اس پر آیت فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ میں جو استثناء واقع ہوا ہے دلالت کرتا ہے اور جو کوئی یہ کہے کہ مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا کیا اور اس میں پہاڑوں کو یکشنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن اور چوپاؤں کو زمین میں پنجشنبہ کے دن پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن تمام مخلوق کے بعد دن کی اخیر ساعت میں مابین عصر اور رات کے پیدا کیا۔

تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین سے چھ دن بعد پیدا کئے گئے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس مدت دراز تک زمین میں آباد رہے ہوں اور پھر انہیں پہاڑوں میں نکال دیا ہو اور اس میں ابلیس مع لشکر خود اور فرشتے ایک عرصہ دراز تک سکونت پذیر رہے ہوں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس جمعہ کو حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے ہیں یہ وہی جمعہ ہے جو زمین کے پیدا کرنے کے بعد آیا تھا ممکن ہے کہ وہ جمعہ اور ہو جو مدتوں کے بعد آیا ہو اور یہ تاویل اس حدیث میں ضروری ہے اس لیے کہ اگر یہ تاویل نہ کی جائے گی تو یہ لازم آتا ہے کہ آسمان اور زمین وغیرہ سات روز کے اندر پیدا ہوئے ہیں حالانکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کئے گئے ہیں۔ (مظہری)

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ: اے پروردگار! کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے گی، فساد اور خونریزی کرنے والوں سے مراد اولاد آدم علیہ السلام ہے ان کا فساد اور خونریزی کرنا انہیں حق تعالیٰ کے اطلاع دینے سے معلوم ہو گیا تھا، اور جنات کی یہاں آبادی کے دروان ہونے والی شر انگیزیوں سے بھی پتا چل چکا تھا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ: حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں، یہ جملہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے جو سبب اشکال کو اور زیادہ قوت دینے والا ہے آیت کے حاصل معنی یہ ہیں کہ اے پروردگار! کیا تو نافرمانوں کو خلیفہ بناتا ہے، حالانکہ ہم معصوم اور مستحق خلافت ہیں۔ تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کو برائی سے منزہ اور پاک سمجھنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ بِحَمْدِكَ محل میں حال کے ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں اس حال میں کہ تیری حمد بھی اس پر کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں اپنی تسبیح کی توفیق عطا فرمائی۔ (مظہری)

وَنُقَدِّسُ لَكَ: اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں، تقدیس بھی تسبیح کے معنوں میں ہے۔ قَدَّسَ نجاستوں سے پاک ہوا اور نُقَدِّسُ لَكَ میں لام یا تو زائدہ ہے اور یا زائدہ نہیں۔ زائدہ نہ ہونے کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ہم تیرے لیے اپنے نفسوں کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں یعنی اس وقت نُقَدِّسُ کا مفعول محذوف ہو گا اور زائد ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ مفعول ضمیر ك ہے۔ فرشتوں نے فساد کے مقابل میں جس سے مراد شرک ہے تسبیح کو قرار دیا اور خونریزی کے مقابل میں تقدیس کو گویا یہ عرض کیا کہ آدمی فساد کریں گے اور ہم ان کے مقابلہ میں تقدیس کرتے ہیں فخر عالم ﷺ سے کسی نے عرض کیا کہ حضور کونسا کلام افضل ہے؟ فرمایا: وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے اختیار فرمایا اور وہ یہ ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ کلمات خلق کے لیے رحمت کا باعث ہیں اور ان ہی کے باعث خلق کو رزق ملتا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، تفسیر بغوی، تفسیر مظہری)

قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی بات رد کرتے ہوئے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ فرشتوں نے سب سے پہلے لبیک کہا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً پھر فرمایا کہ انہوں نے اس (کہنے) میں زیادتی کی اس لئے اللہ تعالیٰ

نے ان کی رائے سے اعراض فرمایا تو اس پر فرشتوں نے چھ سال عرش کا طواف کیا اور کہتے تھے لبیک لبیک ہم آپ کی طرف معذرت چاہتے ہیں لبیک ہم آپ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہم آپ سے توبہ طلب کرتے ہیں۔ (توبہ ابن ابی الدنیا، در منثور)

حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا علم

سوال حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کون سا علم سیکھا تھا حالانکہ یہ علم تو فرشتوں کے پاس نہیں تھا؟

جواب یہ اسماء کا علم تھا، قرآن حکیم کی یہ آیت اس پر دلیل ہے، وَ عَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ {۳۱} البقرۃ) اور آدم کو سارے کے سارے نام سکھائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پس اس نے کہا کہ مجھے ان ناموں کے بارے میں بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

اربابِ تفسیر نے تمام نام سکھائے سے متعلق وضاحت فرمائی ہے، ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس بڑے پیالے کا نام سکھایا گیا تھا، جو پھیلا ہوا ہوتا ہے، جس میں پانچ آدمی آرام سے کھانا کھا سکتے ہیں، اسی طرح تمام چیزوں سے مراد بغیر آواز کے خارج ہونے والی ہوا کے نام ہیں۔ (در منثور، علامہ جلال الدین سیوطی ج ا ص ۱۲۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ اس علم سے مراد کشادہ اور وسیع پیالوں کے نام اور بلا آواز خارج ہونے والی ہوا کے نام ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق تمام چیزوں کے ناموں سے مراد اُونٹ، گائے اور بکری کے تمام نام ہیں۔ ابن ابی حاتم اور عبد بن حمید نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ تمام چیزوں کے ناموں سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ (تفسیر در منثور)

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مروی ہے ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عُلِّمتُ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا كَمَا عُلِّمَ آدَمُ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا مجھے وہ سارے نام سکھائے گئے جو آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے تھے ۔(الفردوس بماثورالخطاب)حضرت عطیہ بن یسر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ قرآن کریم کی آیت جس میں فرمایا گیا کہ آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے،عَلَّمَ اللهُ فِي تِلْكَ الْأَسْمَاءِ أَلف حِرْفَةً من الْحَرْف وَقَالَ لَهُ: قُل لِوَلَدِك وَذُرِّيَّتِك يَا آدَمُ إِن لَّم تَصبِرُوا عَنِ الدُّنْيَا فَاطْلُبُوا الدُّنْيَا بِهَذِهِ الْحَرْف وَلَا تَطلُبُوهَا بِالدِّينِ فَإِنَّ الدِّينَ لِي وَحدِي خَالِصًا وَيلٌ لِّمَن طَلَبَ الدُّنْيَا بِالدِّينِ وَيلٌ لَّهُ (الفردوس بماثور الخطاب ج۴)

اس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام ناموں میں انہیں ایک حرف سے ہزار پیشے اور ہنر سکھائے تھے ، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اے آدم: اپنی اولاد کو فرمایئے کہ اگر تم دنیا مانگنے سے صبر نہ کر سکو تو اس حرف کے ذریعے دنیا طلب کرو مگر میرے دین کے بدلے دنیا حاصل نہ کرو کیونکہ یہ دین خالص میرے لیے ہے، جو شخص دنیا کو دین کے بدلے حاصل کرے گا اس کے لیے بربادی ہے، اس کے لیے بربادی ہے۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تمام چیزوں کے نام سے مراد تمام فرشتوں کے نام ہیں۔ (در منثور ج ۱)حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تمام چیزوں کے ناموں سے مراد اللہ کی تمام مخلوق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو ان تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے جن کی لوگوں کو پہچان کروائی گئی، انسانوں کے نام، جانوروں کے نام، زمین کے نام، دریاؤں کے نام، نرم ہموار زمین کے نام، گدھوں کے نام، اسی طرح ان کے ساتھ ملتے جلتے نام سکھائے گئے تھے۔ پھر وہ تمام نام جو آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے تھے انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ: آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام سکھلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ

عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ تم میری تسبیح و تقدیس بیان کرنے کے لیے کافی ہو اور یہ مخلوق تو دنیا میں خونریزی کرے گی، مگر تم نہیں جانتے کہ انسان کون سے کمالات کا حامل ہو گا، من جملہ ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے، جو اسے دیا گیا ہے اور خلیفہ کے لیے ان چیزوں کی ماہیت اور حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے، جن پر اس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے، مثلاً اگر خلیفہ کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو ماؤف کرتی ہے اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الخبائث کہلاتی ہے، تو خلیفہ شراب کے رسیا کو سزا کیسے دے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام، ان کی حقیقت اور ماہیت سے آدم علیہ السلام کو آگاہ کر دیا تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

فرشتوں کا عجز و انکسار

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا؟ ان کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کر دیجیے۔

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۳۲) قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (۳۳) البقرہ

جواب ترجمہ: فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں ہمیں اس کے سوا کچھ علم نہیں جو آپ نے ہمیں سکھایا، بیشک آپ جاننے والے ہیں حکمت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتادو، سو جب انہوں نے ان کو ان چیزوں کے نام بتادیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی غیب کی چیزوں کو اور میں

جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

جب فرشتوں نے دیکھ لیا کہ اس نئی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نواز دیا اور جو علوم اس کو دیئے ہیں وہ ہم میں نہیں ہیں تو انہوں نے اپنی عاجزی کا اقرار کر لیا اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کے نام نہیں بتا سکتے۔ ہمیں جو کچھ علم ہے ہے اسی قدر ہے جو آپ نے عطا فرمایا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی کہ آپ نے جو اس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے، آپ ہر عیب اور نقص سے پاک ہیں آپ نے جو کچھ ارادہ فرمایا، اس کے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال اٹھانا درست نہیں اور آپ علیم ہیں سبھی کچھ جانتے ہیں اور حکیم بھی ہیں آپ کا کوئی ارادہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں۔ (انوار البیان)

قَالَ يَاآدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ: جب فرشتوں نے ان چیزوں کے نام بتانے سے اپنے عاجز ہونے کا اظہار کر دیا، جو ان پر پیش کی گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آدم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ تم ان کے نام بتا دو، چنانچہ انہوں نے ان چیزوں کے نام بتا دیئے، فرشتوں کی عاجزی کا اور حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا خوب اچھی طرح مظاہرہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو تمہیں توقف کرنا چاہیے تھا اور اس انتظار میں رہنا مناسب تھا کہ اس نئی مخلوق کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہو جائیں جو اس کے فضل و کمال پر اور اس کے مستحق خلافت ہونے پر دلالت کریں، خلیفہ پیدا فرمانے کا اعلان سنتے ہی اشکال کرنا درست نہ تھا۔ (تفسیر انوار البیان)

اور یہ جو فرمایا کہ میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اس کے بارے میں

مفسرین نے لکھا ہے کہ جو ظاہر کیا وہ یہ بات تھی جو بطور سوال عرض کی تھی کہ کیا آپ پیدا فرمائیں گے جو زمین میں فساد اور خون خرابہ کریں گے اور جو چھپایا اس سے مراد یہ ہے کہ ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، انہوں نے یہ بات چھپائی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہ فرمائے گا۔

ابلیس لعین کا سجدہ ریزی سے انکار

سوال وہ کون تھا جس نے آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا؟ اور کیوں انکار کیا تھا؟

جواب جس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اسے عزازیل اور شیطان کہتے ہیں جسے قرآن کریم نے ابلیس بتایا، اسی ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، اس بارے میں قرآن حکیم یوں بیان کرتا ہے، وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۳۴) البقرہ) اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اس بہت بڑی بزرگی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا بہت بڑا احسان فرمایا اور خبر دی کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلہ میں سے تھا جنہیں جن کہتے تھے جو آگ کے شعلوں سے پیدا ہوئے تھے، اس کا نام حارث تھا اور جنت کا خازن تھا، اس قبیلے کے سوا اور فرشتے سب کے سب نوری تھے، قرآن نے بھی ان جنوں کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمن: ۱۵) آگ کے شعلے کی جو تیزی سے بلند ہوتے ہیں اسے مارج کہتے ہیں جس سے جن پیدا کئے گئے تھے اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا۔

زمین میں پہلے جنات بستے تھے، انہوں نے فساد اور خون ریزی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو

فرشتوں کا لشکر دے کر بھیجا انہی کو "جن" کہا جاتا تھا، ابلیس نے لڑ بھڑ کر مارتے اور قتل کرتے ہوئے انہیں سمندر کے جزیروں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پہنچا دیا اور ابلیس کے دل میں یہ تکبر سما گیا کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہ ہو سکا، چونکہ دل کی اس بدی اور اس پوشیدہ خودی کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تھا، جب پروردگار نے فرمایا کہ زمین میں خلیفہ پیدا کرنا چاہتا ہوں تو ان فرشتوں نے عرض کیا کہ ایسے کو کیوں پیدا کرتا ہے جو اگلی قوم کی طرح فساد و خونریزی کریں تو انہیں جواب دیا گیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی ابلیس کے دل میں جو کبر و غرور ہے اس کا مجھی کو علم ہے تمہیں خبر نہیں۔ (ابن کثیر)

پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی، جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے، ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا تو وہ بجتی مٹی ہوتی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو، پھر منہ کے سوراخ سے داخل ہو کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑ دوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی گئی خون گوشت بنتا گیا، جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور فوراً اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لئے اُٹھ نہ سکے اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (الاسرآء :۱۱) یعنی انسان خوشحالی اور پریشان حالی دونوں حالتوں میں بے صبرا اور جلد باز ہے، جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا يَرْحَمُكَ اللّٰهُ پھر صرف ابلیس کے ساتھی فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس کا وہ غرور و تکبر ظاہر ہو گیا اس نے نہ مانا اور سجدے سے انکار کر دیا

اور کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں اس سے بڑی عمر والا ہوں، اور اس سے قوی اور مضبوط ہوں، یہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ مٹی سے قوی ہے، اس کے انکار پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے ناامید کر دیا اور اسی لئے اسے ابلیس کہا جاتا ہے، اس کی نافرمانی کی سزا میں اسے راندہ درگاہ شیطان بنا دیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس وقت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا جب آدم کی ابھی پیدائش مکمل نہیں ہوئی تھی، اس کی دلیل یہ پیش کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں مٹی سے انسان بناؤں گا، جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر جانا۔ (سورۃ ص ۷۲، ۷۱) یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ جیسے ہی ان میں زندگی آئی تو وہ مسجود ملائکہ ہوئے۔

اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم کو کروایا یہ سجدہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا بلکہ سجدہ تعظیم تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے سجدہ عبادت کفر ہے اور کفر کا حکم نہیں دیا جا سکتا، یہ سجدہ تعظیم و تحیہ تھا، فرشتوں کی طرف سے ان پر سلام کی مانند تھا، پہلی امتوں میں سجدہ تعظیم ہوتا تھا جس طرح آج امت مسلمہ میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا عمل موجود ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حواء کا پہلا ٹھکانہ اور شجر ممنوعہ

سوال جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حواء کو پیدا کیا تو ان کا ٹھکانہ کہاں تھا؟

جواب آدم علیہ السلام اور اماں حواء کو پیدا کرنے کے بعد انہیں جنّت میں ٹھکانہ دیا گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (۳۵) (البقرۃ)

اور ہم نے کہا: اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں جا کر رہو اور اس میں جو چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے نزدیک نہ جاؤ پھر ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن پیدا کیا، جمعہ کے دن ہی انہیں جنت میں داخل کیا، جمعہ کے دن ہی انہیں جنت سے نکالا، آدم علیہ السلام جنت میں ایک روایت کے مطابق سو سال رہے، ایک روایت کے مطابق ستر سال جنت میں رہے، ایک روایت کے مطابق ایک سو تیس سال رہے، جنت میں اللہ نے نور کا لباس انہیں پہنایا تھا۔

وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ : اور اس درخت کے نزدیک نہ جاؤ پھر ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد شیر ازی البیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شجرہ کے بارے لکھا، وَالشَّجَرَةُ هِيَ الحِنطَةُ، أَوِ الكِرمَةُ، أَوِ التِّينَةُ (گندم، انگور یا انجیر) (تفسیر بیضاوی)

تفسیر ابن کثیر میں شجرہ کی تعیین کی بجائے مختلف اقوال ذکر کئے گئے ہیں، ① ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول: هِيَ الكَرْم درخت سے مراد انگور ہے۔ ② ابن عباس رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول: هِيَ السُّنْبُلَةُ خوشہ گندم مراد ہے۔ ③ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تیسرا قول: هِيَ الْبُرُّ گندم مراد ہے۔ ④ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور کچھ صحابہ کا قول: انگور کی بیل مراد ہے۔ ⑤ ابی مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول: النَّخْلَةُ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔

⑥ ابی العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول: جس کے کھانے سے حدث لاحق ہو وہ درخت مراد ہے۔ كَانَتِ الشَّجَرَةُ مَنْ أَكَلَ مِنْهَا أَحْدَثَ، وَلَا يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ فِي الْجَنَّةِ حَدَثٌ، درخت سے وہ درخت مراد ہے جس سے کھانے کے بعد حدث لاحق ہو جاتی ہے اور یہ مناسب نہیں کہ جنت میں حدث ہو۔

⑦ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تِينَةٌ اس درخت سے مراد انجیر ہے۔

⑧ وھب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: فرشتے ہمیشہ جنت میں رہنے کے لیے جس درخت کا پھل کھاتے ہیں اس درخت سے کھانے کو منع کیا گیا تھا۔ كَانَتْ شَجَرَةً غُصُونُهَا مُتَشَعِّبٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ، وَكَانَ

لَهَا ثَمَرٌ تَأْكُلُهُ الْمَلَائِكَةُ لِخُلْدِهِمْ، وَهِيَ الشَّمَرَةُ الَّتِي نَهَى اللّٰهُ عَنْهَا آدَمَ وَزَوْجَتَهُ یہ وہ درخت تھا جس کی ٹہنیاں ایک دوسرے میں گھسی ہوئی تھیں، ان کا پھل ایسا تھا جسے فرشتے اپنے دوام کے لئے کھاتے تھے، یہی وہ پھل تھا جسے کھانے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

⑨ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَتَبَ إِلَى أَبِي الْجَلْدِ يَسْأَلُهُ عَنِ الشَّجَرَةِ الَّتِي أَكَلَ مِنْهَا آدَمُ، وَالشَّجَرَةِ الَّتِي تَابَ عِنْدَهَا آدَمُ. فَكَتَبَ إِلَيْهِ أَبُو الْجَلْدِ: سَأَلْتَنِي عَنِ الشَّجَرَةِ الَّتِي نُهِيَ عَنْهَا آدَمُ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَهِيَ السُّنْبُلَةُ، وَسَأَلْتَنِي عَنِ الشَّجَرَةِ الَّتِي تَابَ عِنْدَهَا آدَمُ وَهِيَ الزَّيْتُونَةُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو جلد کو اس درخت کے بارے میں لکھا جس سے آدم علیہ السلام نے کھایا تھا اور جس درخت کے پاس آدم علیہ السلام نے توبہ کی تھی، اس پر ابو جلد نے انہیں لکھا کہ آپ نے مجھ سے اس درخت کے بارے میں پوچھا جس کے کھانے سے اللہ نے آدم علیہ السلام کو منع کیا تھا، تو میں عرض کروں کہ اس سے مراد اَلسُّنبُلَةُ (گندم کا خوشہ) ہے، اور جس درخت کے پاس آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی وہ زیتون کا درخت ہے، (ابن کثیر بحوالہ طبری)

⑩ علامہ ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ، وَالصَّوَابُ فِي ذَلِكَ أَنْ يُقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ جَلَّ ثَنَاؤُهُ نَهَى آدَمَ وَزَوْجَتَهُ عَنْ أَكْلِ شَجَرَةٍ بِعَيْنِهَا مِنْ أَشْجَارِ الْجَنَّةِ، دُونَ سَائِرِ أَشْجَارِهَا، فَأَكَلَا مِنْهَا، وَلَا عِلْمَ عِنْدَنَا بِأَيِّ شَجَرَةٍ كَانَتْ عَلَى التَّعْيِينِ؛ لِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ لِعِبَادِهِ دَلِيلًا عَلَى ذَلِكَ فِي الْقُرْآنِ وَلَا مِنَ السُّنَّةِ الصَّحِيحَةِ (تفسیر ابن جریر)

اس بارے میں درست بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے اللہ تعالیٰ نے آدم اور ان کی بیوی کو جنت کے درختوں میں سے کسی خاص درخت سے کھانے سے منع کیا تھا، اس سے تمام درخت مراد نہیں ہیں، ہمارے پاس کسی خاص درخت کے بارے میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو قرآن اور سنت سے ہمارے پاس موجود ہو۔ سارے اقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کو ترجیح دی جاسکتی ہے کہ آدم نے گندم کا دانہ کھایا تھا، جو گائے کے گردے جتنا تھا، شہد سے زیادہ میٹھا تھا، مکھن سے زیادہ نرم تھا۔

انسان اور شیطان کی باہمی دشمنی

سوال انسان اور شیطان کے درمیان ظاہر اًعداوت اور دشمنی کی ابتدا کب ہوئی ہے؟

جواب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کے درخت میں سے کھانے اور جنت سے زمین کی طرف اترنے کے بعد ان کے درمیان دشمنی کا آغاز ہوا، قرآن حکیم بتاتا ہے، فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ (۳۶)البقرۃ) پھر شیطان نے ان کو وہاں سے ڈگمگایا پھر انہیں اس عزت وراحت سے نکالا کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اترو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور سامان ایک وقت معین تک۔

یوں تو شیطان نے جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تب سے یوں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شیطان کی طرف سے ایک حاسدانہ کشمکش کا آغاز ہو گیا تھا، مگر اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں شیطان سے اس کا انتقام لینے یا اس کے ساتھ اس طرح کا رویہ روا رکھنے کا خیال نہیں تھا، لیکن جب شیطان نے اپنا کرتب دکھایا، سانپ کے منہ میں بیٹھ کر اس نے آدم علیہ السلام کو گندم کا دانہ کھلایا، پہلے اماں حواء کو بہکایا، جب انہوں نے گندم کا دانہ کھالیا تو آدم علیہ السلام کو انہوں نے تیار کیا کہ آپ بھی اسے کھا لیں، میں نے بھی کھایا ہے، مجھے گندم کا دانہ کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔

یہ سن کر آدم علیہ السلام نے بھی گندم کا دانہ کھالیا، پھر وہاں سے ادھر ادھر بھاگنے لگے، اللہ نے فرمایا کہ آدم آپ مجھ سے بھاگ رہے ہیں، اس پر آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ! بھاگ نہیں رہا مجھے آپ سے حیا آرہی ہے، میں شرمندہ ہوں، پھر اللہ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ آدم کو جنت سے باہر کیا جائے مگر ان کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے، اس پر حضرت جبریل علیہ السلام انہیں عزت کے ساتھ ہاتھ سے پکڑ کر جنت سے باہر لائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں انہیں جنت سے زمین کی طرف نکلنے کا حکم دیا وہاں فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، ان میں حضرت آدم علیہ السلام، اماں حواء اور شیطان کی دشمنی مراد ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت پیش کرتے ہیں کہ سُئِلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ الْحَيَّاتِ فَقَالَ: خُلِقَتْ هِيَ وَالإِنْسَانُ كُلٌ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَدُوٌّ لِصَاحِبِهِ إِنْ رَآهَا أَفْزَعَتْهُ وَإِنْ لَدَغَتْهُ أَوْجَعَتْهُ فَاقْتُلْهَا حَيْثُ وَجَدْتَهَا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سانپ کو مارنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سانپ اور انسان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے دشمن پیدا کیے گئے ہیں، اگر وہ اسے دیکھتا ہے تو اس سے ڈر جاتا ہے اور اگر وہ اسے ڈس لے تو اسے تکلیف دیتا ہے، اس لیے جب تم اسے دیکھو تو مار ڈالو۔ (در منثور ج ۱)

قرآن کریم میں لفظ اعداء کی بجائے عدو استعمال کیا گیا ہے، ابن فارس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ واحد، تثنیہ اور جمع تینوں کی صلاحیت رکھتا ہے، ابلیس آدم اور اولادِ آدم دونوں کا دشمن ہے، ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور انہیں ہر طرح کے فتنے میں مبتلا کرتا ہے، ابن آدم اس کے مکر و دجل سے بچنے کے لیے اس پر لعنت کرتا ہے، ابن آدم کے درمیان دشمنی ایک دوسرے کے ساتھ دنیوی باتوں میں حسد کرنا ہے، دین کی باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنا ہے، شیطان کے ساتھ اولادِ آدم کی دشمنی دین کی وجہ سے ہے، جب تک دین باقی ہے ان کے درمیان دشمنی ختم نہیں ہو سکتی، سانپ اولادِ آدم کا دشمن ہے اور وہ اس کے دشمن ہیں، وہ ان کو ڈستا ہے اور یہ اس کا سر کچلتے ہیں، ان کے درمیان دشمنی طبعی ہے، جب تک طبیعتیں موجود ہیں تب تک ان کے درمیان دشمنی ختم نہیں ہو سکتی شیطان کی آدم علیہ السلام کے ساتھ دشمنی حسد اور استکبار کی وجہ سے ہوئی یہاں تک کہ اس نے انہیں دھوکہ دیا اور جنت سے نکلوا دیا، ان کی اولاد کے ساتھ شیطان کی دشمنی یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور انہیں کفر اور نافرمانی کی طرف بلاتا ہے، آدم علیہ السلام کی شیطان کے ساتھ اللہ کے حکم کے تحت دشمنی ہے جیسے اللہ نے قرآن کریم کی آیت فاطر (۶) میں فرمایا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اسے

اپنا دشمن ہی سمجھو، سورۃ الاعراف کی آیت ۲۷ میں اللہ نے اولادِ آدم کو خبر دار کیا کہ شیطان تمہیں کہیں آزمائش میں نہ ڈال دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کیسے قبول ہوئی؟

سوال سورۃ البقرہ کی آیت فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۳۷) کی روشنی میں بتایئے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کیسے قبول ہوئی؟

جواب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہونے کے بارے میں روایات میں کہیں اجمال ہے اور کہیں تفصیل ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَمَّا أَذْنَبَ آدَمُ الَّذِي أَذْنَبَهُ، رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَى الْعَرْشِ، فَقَالَ: أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِي، فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ: وَمَا مُحَمَّدٌ؟ وَمَنْ مُحَمَّدٌ؟ فَقَالَ: تَبَارَكَ اسْمُكَ، لَمَّا خَلَقْتَنِي رَفَعْتُ رَأْسِي إِلَى عَرْشِكَ، فَإِذَا فِيهِ مَكْتُوبٌ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ، فَعَلِمْتُ أَنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ أَعْظَمُ عِنْدَكَ قَدْرًا مِمَّنْ جَعَلْتَ اسْمَهُ مَعَ اسْمِكَ، فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ إِنَّهُ آخِرُ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَإِنَّ أُمَّتَهُ آخِرُ الْأُمَمِ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَلَوْلَا هُوَ يَا آدَمُ مَا خَلَقْتُكَ (معجم طبرانی صغیر ج ۶ ص ۳۱۳)

جب آدم سے اس لغزش کا صدور ہو گیا، تو اپنا سر عرش کی طرف اٹھایا، پھر عرض کرنے لگے، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مجھے معاف کر دے، اللہ نے ان کی طرف وحی بھیجی، محمد کیا ہے؟ اور محمد کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا، تیرا نام برکت والا ہے، جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا، میں نے اپنا سر تیرے عرش کی طرف اٹھایا تھا تو وہاں لکھا ہوا دیکھا تھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، میں سمجھ گیا تھا کہ تیرے نزدیک مرتبے کے لحاظ سے کوئی شخص اتنا بلند نہیں ہے اس شخص سے جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے، اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے آدم! بے شک وہ تیری اولاد میں سے آخری نبی ہیں، ان کی امت تیری اولاد میں سے آخری امت ہو گی، اے آدم! اگر وہ نہ ہوتا تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ قَالَ: أَيْ رَبِّ أَلَمْ تَخْلُقْنِي بِيَدِكَ؟ قَالَ: بَلَى قَالَ: أَيْ رَبِّ، أَلَمْ تَنْفُخْ فِيَّ مِنْ رُوحِكَ؟ قَالَ: بَلَى قَالَ: أَيْ رَبِّ، أَلَمْ تُسْكِنِّي جَنَّتَكَ؟ قَالَ: بَلَى قَالَ: أَيْ رَبِّ أَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُكَ غَضَبَكَ؟ قَالَ: بَلَى قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ تُبْتُ وَأَصْلَحْتُ أَرَاجِعِي أَنْتَ إِلَى الْجَنَّةِ؟ قَالَ: بَلَى قَالَ: فَهُوَ قَوْلُهُ {فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ} (مستدرک حاکم ج ۲ ص ۵۹۴)

آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات پائے تھے، جن کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی تھی، عرض کی، اے میرے رب! کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! عرض کی، اے میرے رب! کیا تو نے میرے اندر اپنی روح نہیں پھونکی؟ فرمایا: ہاں! عرض کی، اے میرے رب! کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں ٹھہرایا تھا؟ فرمایا: ہاں! عرض کی، اے میرے رب! کیا تیری رحمت تیرے غضب پر سبقت نہیں رکھتی؟ فرمایا: ہاں! عرض کی، اے میرے رب! مجھے بتایئے، اگر میں توبہ کرلوں اور اپنی اصلاح کرلوں تو کیا تو مجھے جنت کی طرف لوٹا دے گا؟ فرمایا: ہاں! فرمایا: یہی وہ کلمات تھے جو اللہ کی طرف سے آدم کو ملے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَمَّا أَهْبَطَ اللَّهُ آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ قَامَ وِجَاهَ الْكَعْبَةِ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَلْهَمَهُ اللَّهُ هَذَا الدُّعَاءَ: اللَّهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ سَرِيرَتِي، وَعَلَانِيَتِي فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِي، وَتَعْلَمُ حَاجَتِي فَأَعْطِنِي سُؤْلِي، وَتَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي ذَنْبِي. اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِي، وَيَقِينًا صَادِقًا حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يُصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي، وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِي، فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ، إِنِّي قَدْ قَبِلْتُ تَوْبَتَكَ، وَغَفَرْتُ لَكَ ذَنْبَكَ، وَلَنْ يَدْعُونِي أَحَدٌ بِهَذَا الدُّعَاءِ إِلَّا غَفَرْتُ لَهُ ذَنْبَهُ، وَكَفَيْتُهُ الْمُهِمَّ مِنْ أَمْرِهِ، وَزَجَرْتُ عَنْهُ الشَّيْطَانَ، وَاتَّجَرْتُ لَهُ مِنْ وَرَاءِ كُلِّ تَاجِرٍ، وَأَقْبَلَتْ إِلَيْهِ الدُّنْيَا رَاغِمَةً، وَإِنْ لَمْ يُرِدْهَا (معجم طبرانی اوسط ج ٦)

جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا تو آپ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، یہاں دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد اللہ نے ان کے دل میں یہ دعا القاء کی، اے میرے اللہ! تو میرے پوشیدہ حالات کو جانتا ہے، تو میرے ظاہری حالات کو جانتا ہے، پس میری معذرت قبول فرمالے، میری ضرورت کو تو جانتا ہے، میں نے جو مانگا ہے وہ مجھے عطا کر دے، جو کچھ میرے دل میں ہے تو جانتا ہے، پس تو میرے گناہ کو معاف کر دے، اے میرے اللہ! میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں جو میرے دل کو ملا دے، اے میرے اللہ! مجھے سچا یقین عطا فرما دیجیے، تاکہ مجھے پتا چل جائے کہ مجھے وہی دکھ پہنچے گا جو تو نے میرے لیے لکھ دیا ہے، اے میرے اللہ! مجھے ایسی رضا دے دے جو تو نے میرے لیے لکھ دی ہے، پس اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے آدم! میں نے تیری توبہ قبول کر لی ہے، میں نے تیرے گناہ کو معاف کر دیا ہے، مجھ سے جو بھی ان کلمات کے ساتھ دعا کرے گا میں اس کے گناہ کو معاف کر دوں گا، میں اس کے مشکل کاموں کی کفایت کروں گا، میں اس سے شیطان کو ڈانٹ کر بھگاؤں گا، میں اس کی وجہ سے ہر تاجر کے پس پردہ تجارت کروں گا یہاں تک کہ دنیا اس کی طرف ذلیل ہو کر آئے گی، اگرچہ اس کا ارادہ نہ بھی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے بیت اللہ شریف کے سات چکر لگا کر طواف کیا، بیت اللہ شریف اس وقت ایک سرخ ٹیلہ پر تھا، آپ طواف سے فارغ ہو گئے تو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے یہ دعا مانگی۔ (طبرانی فی الاوسط، ابن عساکر فی فضائل مکہ، در منثور ج ۱)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا تو انہوں نے ایک ہفتہ تک بیت اللہ کا طواف کیا، پھر خانہ کعبہ کے سامنے دو رکعت نماز ادا کی، پھر یہ دعا مانگی۔ (تفسیر در منثور ج ۱ ص ۱۴۳)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ

سے عرض کی کہ اگر میں توبہ کرلوں اور اپنی اصلاح کرلوں تو کیا تو مجھے اپنی جنت کی طرف واپس کر دے گا؟ اس پر اللہ نے وہ کلمات سکھائے جو قرآن کریم میں موجود ہیں، جن میں آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا، ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (تفسیر در منثور ج ۱، شعب الایمان)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر در منثور میں کئی صفحات پر مشتمل روایات نقل فرمائی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو توبہ کے لیے سکھائے جانے والے کلمات صرف یہی نہیں تھے بلکہ مختلف انداز میں مختلف کلمات انہیں سکھائے گئے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ آدم علیہ السلام اپنی ہتھیلی اپنی پیشانی پر رکھ کر اس قدر رو رہے تھے کہ جبریل علیہ السلام بھی ان کو دیکھ کر رونے لگے، جبریل علیہ السلام کے سوال پر آدم علیہ السلام نے بے ساختہ ان نعمتوں کا ذکر کرنا شروع کر دیا جن سے اللہ نے انہیں محروم کر دیا تھا، پھر اللہ نے ان کی زاری اور تضرع دیکھی تو ان کی توبہ قبول کرلی۔

انسانی جزا اور سزا کا قانون

سوال اللہ تعالیٰ نے جب سے انسان کو زمین پر اتارا تب سے اس کی جزا اور سزا کا قانون لاگو کیا اس کے بارے میں کوئی دلیل؟

جواب قرآن حکیم میں اس کی دلیل یوں بیان کی گئی ہے قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۳۹) (البقرہ)

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے پس جو میری ہدایت پر چلیں گے ان پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ اور جو انکار

کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی دوزخی ہوں گے جو اس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سری لنکا کے پہاڑ سرندیپ پر اتارا، علامہ جلال الدی سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں ارض ہند میں نودنامی پہاڑ پر اترے، حضرت حواء کو جدہ میں اتارا، شیطان کو ابلہ نامی جگہ پر اتارا، سانپ کو نَصِیبِین، اصفہان یا سجستان میں اتارا۔ (تفسیر آلوسی ج ا ص ۲۳۸) آدم علیہ السلام جب جنت سے نکلے تو ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت تھا۔

سانپ کو کیا سزا ملی؟ شیطان نے تمام جانوروں سے بات کی کہ وہ جنت میں جا کر آدم کو بھٹکانا چاہتا ہے کسی نے اس کی بات نہیں مانی، سانپ سے بات کی تو سانپ نے اسے جنت میں پہنچانے کی حامی بھری، اس کے منہ میں داخل ہو کر جنت کے فرشتوں کی لاعلمی میں جنت میں داخل ہوا، سانپ اونٹ کی طرح خوبصورت جانور تھا، اس کے چار پائے تھے، مگر اس نازیبا حرکت کی وجہ سے اللہ نے اسے یہ سزا دی کہ اس کو چاروں پاؤں سے محروم کر دیا اور پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو کیا سزا ملی؟ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کے ساتھ یہ ہوا کہ ان پر جو جنتی لباس تھا وہ اتر گیا، انہوں نے اپنی شرم گاہیں چھپانے کے لیے جنتی درخت انجیر کے پتے اپنی شرم گاہوں پر چپکانے شروع کر دیے، حیاء کے مارے جنت میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔

جنت میں رہتے ہوئے مزیدار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، زمین میں اتار دیے گئے تو مزیدار کھانوں سے محروم ہو گئے، پھر آدم علیہ السلام کو لوہا بنانے کا طریقہ بتلایا گیا، کھیتی باڑی کرنے کا حکم دیا گیا، پھر کھیتی باڑی کرتے تھے، زراعت کرتے تھے، کھیتی کو پانی لگاتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تو اسے کاٹتے تھے، پھر اسے گاہتے تھے، پھر بیج الگ کرتے تھے، پھر اسے پیستے تھے، پھر اسے آٹا بناتے تھے، پھر اس کی روٹی بناتے تھے، پھر اسے کھاتے تھے۔

جس پہاڑی پر انہیں اتارا گیا اس پر کھڑے ہوتے تو پاؤں زمین پر ہوتے اور سر آسمان سے ٹکراتا تھا، جس سے وہ فرشتوں کی گفتگو سنتے اور جنت کی خوشبو سونگھتے تھے، پھر ان کا قد ساٹھ ہاتھ کر دیا گیا،

جو تادم آخر رہا، اللہ سے عرض کرنے لگے کہ اے اللہ! میں جنت میں تیرا پڑوسی تھا، تیرے سوا میرا کوئی رب نہیں، میں جنت میں جہاں چاہتا وہاں رہتا تھا، میں جنت سے مزیدار چیزیں کھاتا تھا، تو نے مجھے اس مقدس پہاڑ پر اتارا تو میں فرشتوں کی گفتگو سنتا تھا، جنت کی خوشبو سونگھتا تھا، پھر تو نے مجھے ساٹھ ہاتھ کر دیا، تو وہ گفتگو سننے کا سلسلہ ختم ہو گیا، جنت کی خوشبو آنا بند ہو گئی، اللہ نے فرمایا: لِمَعصِيَتِكَ يَا آدَمُ فَعَلتُ ذَلِكَ بِكَ (تفسیر در منثور ج ۱) تیری نافرمانی کی وجہ سے میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا جنت سے نکلنے پر رونا: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے پر رونے کی منظر کشی یوں کرتے ہیں وَكَانَ آدَمُ حِينَ أُهبِطَ مِنَ الْجَنَّةِ بَكَى بُكَاءً لَم يَبكِه أَحدٌ فَلَو وُضِعَ بُكَاءُ دَاوُدَ عَلَى خَطِيئَتِهِ وَبُكَاءُ يَعْقُوبَ عَلَى ابْنِهِ وَبُكَاءُ ابْنِ آدَمَ عَلَى أَخِيهِ حِينَ قَتَلَهُ ثُمَّ بُكَاءُ أَهلِ الأَرْضِ مَا عَدلُ بِبُكَاءِ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ حِينَ أُهبِطَ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے نکالے گئے تھے تو وہ اس قدر روئے کہ ان جیسا کوئی نہ رویا، داؤد علیہ السلام کا گریہ، یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹے پر رونا، ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد رونا، زمین والوں کا رونا اگر ان کی خطاء پر رکھ دیا جاتا تو آدم علیہ السلام کے رونے کے برابر نہیں ہو سکتا، جب آپ کو زمین پر اتارا گیا تھا۔ (در منثور)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ آدَمَ كَانَ رَجُلًا طِوَالًا كَأَنَّهُ نَخْلَةٌ سَحُوقٌ سِتِّينَ ذِرَاعاً كَثِيرُ شَعرِ الرَّأْسِ فَلَمَّا رَكِبَ الْخَطِيئَةَ بَدَت لَهُ عَوْرَتُه وَكَانَ لَا يَرَاهَا قَبلَ ذَلِكَ فَانْطَلَقَ هَارِباً فِي الْجَنَّةِ فَتَعَلَّقَت بِهِ شَجَرَةٌ فَأَخَذَت بِنَاصِيَتِهِ فَقَالَ لَهَا: أَرسِلِينِي قَالَ: لَستُ بِمُرسِلَتِكَ وَنَادَاهُ رَبُّهُ: يَا آدَمُ أَمِنِّي تَفِرُّ قَالَ: يَا رَبِّ إِنِّي استَحيَيتُكَ قَالَ: يَا آدَمُ اخْرُج مِن جَوَارِي فَبِعِزَّتِي لَا أُسَاكِنُ مَن عَصَانِي وَلَو خَلَقتُ مِلْءَ الأَرْضِ مِثلُكَ خَلقًا ثُمَّ عَصَونِي لَأَسكَنتُهُم دَارَ العَاصِينَ قَالَ: أَرَأَيتَ إِن أَنَا تُبتُ وَرَجَعتُ أَتَتُوبُ عَلَيَّ قَالَ: نَعَم يَا آدَمُ،

حضرت آدم علیہ السلام کھجور کے درخت کی طرح لمبے قد کے تھے، ساٹھ ہاتھ لمبے، سر کے بال گھنے تھے، جب خطاء کا صدور ہوا تو شرم گاہ کھل گئی تھی، اس سے پہلے وہ اپنی شرم گاہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے، پھر جنت میں بھاگنے لگے، اسی دوران ایک درخت کے ساتھ اٹک گئے، جس نے ان کی پیشانی پکڑلی، آپ نے اسے کہا کہ مجھے چھوڑدے، اس نے کہا کہ میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا، اللہ نے آواز دی، اے آدم! کیا آپ مجھ سے بھاگتے ہیں؟ عرض کیا، اے میرے رب میں آپ سے حیاء کرتا ہوں، فرمایا: اے آدم! میرے پڑوس سے نکل جایئے، مجھے اپنی عزت کی قسم! میں کسی اپنے نافرمان کو نہیں ٹھہراؤں گا، اگر میں تیرے جیسی مخلوق کے ساتھ زمین بھر دوں، پھر وہ میری نافرمانی کرے تو میں انہیں نافرمانی کرنے والوں کے گھر میں ٹھہراؤں گا، عرض کیا، اگر میں توبہ کرلوں اور رجوع کرلوں تو؟ کیا آپ میری توبہ قبول کریں گے، فرمایا: ہاں، اے آدم! (تفسیر در منثور)

اس لغزش پر آدم علیہ السلام کو اس قدر ندامت اور شرمندگی تھی کہ چالیس سال تک آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھا، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدم نے اتنے آنسو بہائے کہ اگر ان کی ساری اولاد کے آنسو کا وزن کیا جائے تو آدم علیہ السلام کے آنسو اتنے زیادہ تھے کہ ان کا پلڑا جھک جائے۔

بے لباسی کیسے ختم ہوئی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حواء کی بے لباسی ختم کرنے کے لیے انہیں حکم دیا کہ جنت سے آنے والے آٹھ جوڑوں میں سے ایک مینڈھا ذبح کریں، چنانچہ آدم علیہ السلام نے مینڈھا ذبح کیا، اس کی اون اتاری، اماں حواء نے اسے کاتا، اسے بُنا، آدم علیہ السلام نے اس اُون سے اپنے لیے ایک جبہ تیار کیا، اماں حواء کے لیے ایک چادر اور ایک دوپٹا تیار کیا، جو ان دونوں نے پہنا، جو کچھ ان دونوں کے ساتھ ہوا اس پر سو سال تک روتے رہے، چالیس دن تک کوئی چیز کھائی پی نہیں، سو سال تک اماں حواء کے قریب تک نہیں گئے۔

عربی سے سریانی زبان: حضرت آدم علیہ السلام جنت میں عربی بولتے تھے، جب ان سے لغزش ہوگئی تو اس پر اللہ نے ان سے عربی زبان میں بولنے کی صلاحیت سلب کرلی، پھر اس کے بعد وہ سریانی زبان بولنے

لگے، جب اللہ کی بارگاہ میں ان کی توبہ قبول ہوگئی تو اللہ نے پھر انہیں عربی بولنے کی توفیق دے دی۔

حضرت حواء کو غلطی پر کیا سزا دی گئی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا

يَا آدَمُ، مَا حَمَلَكَ عَلَى أَنْ أَكَلْتَ مِنَ الشَّجَرَةِ الَّتِي نَهَيْتُكَ عَنْهَا؟ قَالَ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: زَيَّنَتْهُ لِي حَوَّاءُ قَالَ: «فَإِنِّي أُعَاقِبُهَا أَنْ لَا تَحْمِلَ إِلَّا كُرْهًا وَلَا تَضَعَ إِلَّا كُرْهًا وَدَمَّيْتُهَا فِي الشَّهْرِ مَرَّتَيْنِ فَرَنَّتْ حَوَّاءُ عِنْدَ ذَلِكَ فَقِيلَ: عَلَيْكِ الرَّنَّةُ وَعَلَى بَنَاتِكِ۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرمایا: جس درخت سے میں نے آپ کو منع کیا تھا اس سے کھانے پر کس نے آپ کو اکسایا تھا؟ انہوں نے جواب دیا، اے میرے رب! اسے میرے لیے حواء نے مزین کیا تھا، اللہ نے فرمایا: میں اسے اس کی یہ سزا دے رہا ہوں کہ وہ جب حاملہ ہوگی تو تکلیف میں ہوگی، وہ جب بچہ جنے گی تو تکلیف میں ہوگی، ایک ماہ میں اسے دوبار خون آئے گا، یہ سن کر حضرت حواء نے ایک چیخ ماری، انہیں کہا گیا کہ یہ تیری اور تیری بیٹیوں کی چیخ ہے جو تم پر لازم کر دی ہے۔ (العظمت لابی الشیخ، تفسیر در منثور) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بنات آدم پر ضروری قرار دی ہے انہیں ماہواری آئے گی۔ (کشف اللثام) حیض کی ابتدا بنی اسرائیل سے ہوئی، (کشف اللثام) بنی اسرائیل میں مرد اور عورتیں اکٹھی نمازیں پڑھا کرتے تھے جب عورتوں کو حیض کا مسئلہ پیش آیا تو انہیں عبادت گاہوں سے روک دیا گیا۔ (مصنف عبد الرزاق، کشف اللثام شرح عمدۃ الاحکام)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللهَ بَعَثَ جِبْرِيلَ إِلَى حَوَّاءَ حِينَ دَمِيَتْ فَنَادَتْ رَبَّهَا جَاءَ مِنِّي دَمٌ لَا أَعْرِفُهُ فَنَادَاهَا لَأُدْمِيَنَّكِ وَذُرِّيَّتَكِ وَلَأَجْعَلَنَّهُ لَكِ كَفَّارَةً وَطُهُورًا (در منثور) اللہ نے جبریل علیہ السلام کو حضرت حواء کے پاس بھیجا جب انہیں ماہواری آئی، انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا، کہ مجھے ماہواری آگئی ہے، میں اسے نہیں پہچانتی، اللہ نے انہیں آواز دی کہ میں تجھے اور تیری بیٹیوں کو ضرور بہ ضرور خون آلود کروں گا اور ضرور بہ ضرور اسے تمہارے لیے کفارہ اور پاکیزگی کروں گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَوْلَا بَنُو اِسرَائِیل لَم یَخنَزِ اللَّحمُ وَلَولَا حَوَّاءُ لَم تَخُن اُنثَی زَوجَهَا اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑتا، اگر حواء نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ (در منثور)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آدم علیہ السلام پر فضیلت: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فُضِّلتُ عَلَی آدَمَ بِخَصلَتَینِ، کَانَ شَیطَانِی کَافِرًا فَأَعَانَنِی اللہ عَلَیهِ حَتّٰی أَسلَمَ وَکَانَ أَزوَاجِی عَونًا لِّی، وَکَانَ شَیطَانُ آدَمَ کَافِرًا وَزَوجَتُه عَونًا لَهُ عَلٰی خَطِیئَتِهِ۔

مجھے آدم علیہ السلام پر دو عادتوں میں فضیلت دی گئی، ایک یہ کہ میرا شیطان کافر تھا، اللہ نے اس پر میری مدد فرمائی تو وہ میرا تابعدار ہو گیا، اور میری بیویاں میری مددگار تھیں، حضرت آدم علیہ السلام کا شیطان کافر تھا اور ان کی بیوی ان کی خطاء پر ان کی مددگار تھی۔ (تفسیر در منثور)

جنت سے نو چیزوں کی آمد: آدم علیہ السلام جب جنت سے دنیا میں اتارے گئے تو ان کے ساتھ نو چیزیں تھیں ① حجر اسود (کالا پتھر جو اس وقت برف سے زیادہ سفید تھا، انسانی گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا) آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو ان کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اس پتھر پر اپنے آنسو صاف کرتے تھے، آدم علیہ السلام جب حج کے لیے آئے تو اسے جبل ابو قبیس پر رکھ دیا تھا، یہ پتھر مکہ والوں کے لیے رات کو چمکتا تھا، جس طرح چاند چمکتا ہے، اسلام کی آمد سے چار سال پہلے جب حیض والیوں اور جنابت والوں نے اسے چھونا شروع کیا تو یہ کالا ہو گیا، پھر قریش نے اسے جبل ابی قبیس سے نیچے اتار لیا تھا، آدم علیہ السلام نے ہند سے پیدل چل کر مکہ میں جا کر چالیس حج کیے تھے۔ ② جنتی درختوں کی پتیاں یا پھولوں کی پنکھڑیاں ③ جنت کے درخت آس کا عصا، یہ عصا دس ہاتھ لمبا تھا، بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا تھا، ④ بیلچہ، ⑤ کدال، ⑥ صنوبر، ⑦ سندان (اہران) ⑧ ہتھوڑا، ⑨ سنڈاسی۔ (طبقات الکبریٰ)

دنیا میں آنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے جو پھل کھایا وہ ناشپاتی تھی، (در منثور)

دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام نے ① طور سیناء، ② طور زیتون، ③ جبل لبنان، ④ جبل جودی کے پتھروں سے خانہ کعبہ کی تعمیر کی، جبل حراء کے پتھروں سے خانہ کعبہ کے ستون بنائے۔

زمین پر اترنے کے بعد جب قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئی تو سخت پریشانی کے عالم میں شرق غرب کی طرف دوڑنے لگے، اتنے میں جبریل نے آکر انہیں قضائے حاجت کا طریقہ سکھایا، (در منثور) جب پائخانے کی بو آئی تو اس پر ستر سال تک روتے رہے، بدبو آئی تو آپ نے اپنی انگلیاں دانتوں کے نیچے دے دیں، ایک ہزار سال تک ایسے ہی کرتے رہے۔

نافرمانی پر ناراضگی: ایک گندم کا دانہ کھانے پر اللہ تعالیٰ نے کس قدر ناراضگی کا اظہار کیا کہ مسجود ملائک کو جنت بدر کر دیا، سالہا سال تک روتے رہے، آنسو بہاتے رہے، شرمندگی اور ندامت کے باعث آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تک نہیں تھے، ایک دن معافی معافی کی صدا لگائی کہ اللہ کہیں سزا جلد ہی تو نہیں شروع ہو گئی، تفسیر در منثور میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ ابو نعیم کے حوالے سے ایک روایت لائے ہیں کہ

أَوحَى اللهُ إِلَى الْمَلَكَيْنِ: أَخرِجَا آدَمَ وَحَوَّاءَ مِن جَوَارِي فَإِنَّهُمَا عَصَيَانِي فَالْتَفَتَ آدَمُ إِلَى حَوَّاءَ بَاكِياً وَقَالَ: اِستَعِدِّي لِلْخُرُوجِ مِن جَوَارِ اللهِ هَذَا أَوَّلُ شُؤمِ الْمَعْصِيَةِ فَنَزَعَ جِبْرِيلُ التَّاجَ عَن رَأسِهِ وَحَلَّ مِيكَائِيلُ اَلاِكلِيلَ عَن جَبِينِهِ وَتَعَلَّقَ بِهِ غُصن فَظَنَّ آدَمُ أَنَّه قَد عُوجِلَ بِالعُقُوبَةِ فَنَكَسَ رَأسَهُ يَقُولُ: اَلْعَفوَ اَلْعَفوَ فَقَالَ اللهُ: فِرَارٌ مِّنِي فَقَالَ: بَل حَيَاءٌ مِّنْكَ يَا سَيِّدِي (تفسیر در منثور ج ا، بحوالہ ابو نعیم وابن عساکر)

اللہ نے دو فرشتوں کی طرف وحی کی کہ آدم اور حواء کو میرے پڑوس سے باہر نکالو، ان دونوں نے میری نافرمانی کی ہے، آدم علیہ السلام نے روتے ہوئے حواء کی طرف دیکھا اور فرمایا: اللہ کے پڑوس سے نکلنے کی تیاری کرو، یہ نافرمانی کی پہلی نحوست ہے، جبریل علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کے سر سے تاج اتار لیا، میکائیل نے ان کی پیشانی سے سہرا کھینچ لیا، ان کا سر ایک ٹہنی کے ساتھ اٹک گیا تو آدم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ان کی

سزا جلد شروع ہو گئی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنا سریوں پکارتے ہوئے جھکالیا، معافی کا سوال کرتا ہوں، معافی کا سوال کرتا ہوں، اللہ نے فرمایا: مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا، اے میرے سردار! بلکہ آپ سے حیا آرہی ہے۔

دونوں کو زمین پر اترنے کا حکم دیتے ہوئے انہیں فرمایا کہ اِهبِطُوا إِلَى الأَرْضِ فَلِدُوا لِلْمَوْتِ وَابْنُوا لِلخَرَابِ (ابن عساکر عن مجاہد) زمین کی طرف اترو، پس موت کے لیے جنم دو اور بربادی کے لیے تعمیر کرو۔

گدھ کی مچھلی سے سرگوشی: حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر اترنے سے پہلے نسر (گدھ) خشکی پر اور مچھلی پانی میں رہتی تھی، جب آدم علیہ السلام اترے تو گدھ نے مچھلی سے کہا کہ آج ٹانگوں پر چلنے والی ایک مخلوق اتری ہے، اس پر مچھلی نے کہا کہ اب پانی میں میرے لیے اور خشکی میں تیرے لیے کوئی جائے نجات نہیں ہے، علامہ ابو نعیم رحمہ اللہ نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ

لَمَّا أُهبِطَ آدَمُ إِلَى الأَرْضِ كَانَ فِيهَا نَسرٌ وَّحُوتٌ فِي الْبَحْرِ وَلم يَكُن فِي الأَرْضِ غَيرهمَا فَلَمَّا رأَى النسْرُ آدَمَ وَكَانَ يَأْوِي إِلَى الْحُوتِ ويَبِيتُ عِنْدَه كُل لَيْلَةٍ قَالَ: يَا حُوتُ لَقَد أُهبِطَ اليومُ إِلَى الأَرْضِ شَيْءٌ يَمشِي عَلى رِجلَيْهِ ويَبطِشُ بِيَدِهِ فَقَالَ لَهُ الْحُوتُ: لَئِن كُنتَ صَادِقاً مَالِي فِي الْبَحْرِ مِنْهُ مَنجىٰ وَلَا لَكَ فِي الْبر

جب آدم زمین کی طرف اتارے گئے تو یہاں ان کی آمد سے پہلے ایک گدھ اور ایک مچھلی سمندر میں رہتی تھی، زمین پر ان دونوں کے علاوہ کچھ نہ تھا، گدھ ہر رات مچھلی کے پاس چلا جاتا اور وہاں رات گزارتا تھا، اس نے جب آدم کو دیکھا تو کہنے لگا، اے مچھلی! آج زمین کی طرف ایک ایسی چیز اتری ہے جو اپنے پاؤں پر چلتی ہے اور اپنے ہاتھ سے پکڑتی ہے، مچھلی نے گدھ سے کہا کہ اگر تو سچا ہے تو پھر یاد رکھ کہ میرے لیے سمندر میں اور تیرے لیے خشکی میں کوئی جائے نجات نہیں ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر کے ساتھ ساتھ ربانی آیات کا انکار کیا یہ لوگ دوزخی ہیں، دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، کسی درجے کا بھی کافر ہو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، قرآن کریم کی بے شمار آیات میں یہی فرمایا گیا ہے کہ کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، گویا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون یہی ہے، انہیں کبھی بھی دوزخ سے نہیں نکالا جائے گا، جب کہ وہ نکلنے کا ارادہ کریں گے، ان پر جہنم میں ہمیشہ ہمیش کا عذاب ہو گا، ایک موقع پر انہیں جہنم کا گرم پانی پلانے کے لیے جہنم کے اندر ہی ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لے جایا جائے گا، جہاں انہیں گرم اور کھولتا ہوا پانی پلا کر دوبارہ دھکتی ہوئی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

بنی اسرائیل پر نعمتوں کا ذکر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (۴۰) وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (۴۱) البقرہ

جواب ترجمہ: اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو تا کہ میں بھی تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں، اور تم (کسی اور سے نہیں، بلکہ) صرف مجھی سے ڈرو اور جو کلام میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ جبکہ وہ اس کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق بھی کر رہا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو۔

اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے، ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، تمام تر

یہودی اور اکثر عیسائی اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے، مدینہ منورہ میں یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی اور رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد نہ صرف ان کو اسلام کی دعوت دی تھی بلکہ ان سے امن کا معاہدہ بھی فرمایا تھا، لہٰذا اس مدنی سورت میں زیر نظر آیت سے آیت نمبر: ۱۴۳ تک مسلسل بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے، جس میں انہیں اسلام کی دعوت بھی دی گئی ہے اور ان کو نصیحت کرنے کے ساتھ ان کی بدعنوانیوں پر متنبہ بھی کیا گیا ہے، شروع میں ان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کیسے کیسے انعامات فرمائے تھے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہو کر اس عہد کو پورا کرتے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا کہ وہ تورات پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں گے اور اللہ کے بھیجے ہوئے ہر نبی پر ایمان لائیں گے۔

لیکن انہوں نے تورات پر عمل کرنے کے بجائے اس میں من مانی تاویلیں شروع کر دیں اور اس کے احکام کو بدل ڈالا، چونکہ اس طرز عمل کی وجہ یہ بھی تھی کہ حق کو قبول کرنے کی صورت میں انہیں اپنے ہم مذہب لوگوں کا ڈر تھا کہ وہ کہیں ان سے بدظن نہ ہو جائیں اس لئے اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ مخلوق سے ڈرنے کے بجائے انہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہیں رکھنا چاہیے۔ (توضیح القرآن)

وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ : بنی اسرائیل کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ قرآن کریم وہی دعوت لے کر آیا ہے جو تورات اور انجیل کی دعوت تھی اور جن آسمانی کتابوں پر وہ ایمان رکھتے ہیں قرآن کریم انہیں جھٹلانے کے بجائے دو طرح سے ان کی تصدیق کرتا ہے ایک اس لحاظ سے کہ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ کتابیں اللہ ہی کی نازل کی ہوئی تھیں (یہ اور بات ہے کہ بعد کے لوگوں نے ان میں کافی ردوبدل کر ڈالا جس کی حقیقت قرآن نے واضح فرمائی)

اور دوسرا قرآن اس حیثیت سے ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کتابوں میں آخری نبی کی تشریف آوری کی جو پیشینگوئیاں کی گئی تھیں قرآن کریم نے انہیں سچا کر دکھایا اس کا تقاضا یہ تھا کہ بنی

اسرائیل عرب کے بت پرستوں سے پہلے اس پر ایمان لاتے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جس تیز رفتاری سے بت پرست اسلام لا رہے ہیں اس رفتار سے یہودی ایمان نہیں لا رہے ہیں اور اس طرح گویا بنی اسرائیل قرآن کی تکذیب کرنے میں پیش پیش ہیں اس لئے کہا گیا کہ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ۔

بعض یہودیوں کا طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ رشوت لے کر تورات کی تشریح عام لوگوں کی خواہشات کے مطابق کر دیا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کے احکام کو چھپا لیتے تھے ان کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو اور حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ نہ کرو اور نہ حق بات کو چھپاؤ۔ (توضیح القرآن)

یہود کو اعمال صالحہ اختیار کرنے کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے،

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲) وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳) أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۴۴) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ نہ کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ جبکہ (اصل حقیقت) تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو، اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کا حکم دیا، پھر اعمال صالحہ اختیار کرنے کا حکم دیا، نیکی اختیار کرنے اور بری باتوں سے بچنے کی تلقین فرمائی، یہودی علماء کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ انبیاء کرام

کی کتابوں میں جان بوجھ کر کوئی عقیدہ یا اپنی کوئی غرض ثابت کرنے کے لیے کمی بیشی کر دیتے تھے، حادثات کے دوران جو کتابیں ضائع ہو گئی تھیں یا ان میں کوئی نقصان ہو گیا تھا تو اپنے طور پر اپنے ہی ہاتھوں سے کچھ لکھ لکھا کر ان کتابوں میں شامل کر دیتے تھے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر بھی فرمایا کہ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے، ان کے علماء اس قدر چالاک اور مکار واقع ہوئے تھے کہ آسمانی کتابوں کے متن میں کمی بیشی کر دیتے تھے، کبھی ان کتابوں کی شرح کے نام پر من پسند اضافے کر دیتے تھے، طبیعت کے خلاف چیزیں مٹا دیتے تھے، نئی عبارت یا پرانی عبارت میں فرق کرنے کے لیے کسی قسم کی کوئی نشانی قائم نہیں کرتے تھے۔

یہودی علماء کی کارستانی تو اس طرح تھی، عام لوگوں کا حال یہ تھا کہ اپنی کسی کتاب کا کوئی حافظ نہیں ہوتا تھا، کاغذ عام دستیاب نہیں تھا، کتابت عام نہیں تھی، کوئی کتب خانہ نہیں تھا، اگر یہ سہولیات ہوتیں تو کم از کم کسی نہ کسی جگہ کوئی نہ کوئی نسخہ انسانی دست برد سے محفوظ ہوتا، کاہنوں اور راہبوں کے پاس کچھ نہ کچھ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے ہوتا تھا۔

جب علماء یہود اور عامۃ الناس کے علمی حالات اور عملی حالات اس قدر انحطاط وزوال کا شکار تھے تو پھر چالاک اور مکار لوگوں کو کھل کھیلنے کا خوب موقع ملتا تھا، وہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش کر دیتے تھے، وہ حق میں باطل ملا دیتے تھے، وہ اپنی من پسند باتیں ایمان وعقیدہ بنا کر ظاہر کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ تم لوگ حق کے ساتھ باطل کو گڈ مڈ نہ کرو۔

نبی کریم ﷺ کا ذکر خیر ان کی کتابوں میں موجود تھا، جب تک نبی کریم ﷺ نے جبل ابی قبیس کے دامن میں اور کوہ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اعلان نبوت نہیں کیا تھا تب تک یہ لوگ اپنی کتابوں میں پائی جانے والی بشارتوں کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کا انتظار کر رہے تھے، نبی کریم ﷺ کے گن گا رہے تھے، آپ ﷺ کا اولاد اسماعیل میں پیدا ہونا انہیں ہضم نہیں ہوتا تھا، جب آپ ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو یہاں بھی یہودیوں نے آپ ﷺ کے ساتھ حسد کی بناء پر مخالفت کی، ہر

لمحہ آپ ﷺ کے خلاف کوئی نہ کوئی مہم جاری رکھتے تھے۔

مخالفت تو اپنی جگہ تھی ہی، جہاں جہاں ان کی کتابوں میں کسی بھی طور نبی کریم ﷺ سے متعلق بشارتیں موجود تھیں وہ انہیں الٹنے پلٹنے لگے، ان کا مفہوم بگاڑنے لگے، تقویٰ اور طہارت کے مسائل میں بھی من مانی تاویلات اور دل پسند توجیہات کرنے لگے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حق میں باطل کو شامل نہ کرو، جان بوجھ کو حق کو نہ چھپاؤ، اس لیے تمہاری ان گمراہیوں اور گمراہ کن باتوں سے ہزاروں اور لوگ راہ راست سے بھٹک سکتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کا مفہوم یوں بیان فرمایا کہ لَا تَكْتُمُوا مَا عِنْدَكُمْ مِنَ الْمَعْرِفَةِ بِرَسُولِي وَبِمَا جَاءَ بِهِ، وَأَنْتُمْ تَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَكُمْ فِيمَا تَعْلَمُونَ مِنَ الْكُتُبِ الَّتِي بِأَيْدِيكُمْ جو کچھ تمہارے پاس میرے رسول کی معرفت اور جو کچھ وہ لے کر آئے اس سے متعلق معلومات ہیں تو انہیں نہ چھپاؤ، یہ ساری باتیں تم اپنے ہاں لکھی ہوئی موجود پاتے ہو، جو کتابیں تمہارے پاس ہیں ان میں میرے رسول سے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ: اللہ تعالیٰ انہیں پاکیزہ زندگی اختیار کرنے کا حکم دے رہے ہیں، نماز کو قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے رہے ہیں، اِقامت صلاۃ اور ادائیگی زکوٰۃ سے انسانی دل نرم ہوتے ہیں، دلوں کے اندر کے کھوٹ اور شیطنت دور ہوتی ہے، اللہ نے ان کی اصلاح کے لیے بدنی عبادت اور مالی عبادت کا حکم دیا۔ مفسر قرآن حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کریں، اور اپنی زکوٰتیں نبی کریم ﷺ کے سپرد کرنے کا حکم دیا۔ (ابن کثیر)

زکوٰۃ کے معنی زیادہ ہونے اور بڑھنے کے ہیں، بولتے ہیں زَكَى الزَّرْعُ جب کھیتی بڑھتی ہے اور چونکہ خدا کے نام پر دینے سے مال میں برکت ہوتی ہے اور اس عمل کی تاثیر سے مال بڑھتا ہے اس لیے مال میں سے حصہ معین سال تمام پر دینے کو زکوٰۃ کہنے لگے۔ بعض کہتے ہیں کہ زکاء سے مشتق ہے جس

کے معنی پاکی کے ہیں، چونکہ زکوٰۃ سے مال پاک ہو جاتا ہے اس لیے زکوٰۃ کہنے لگے اور اسی لیے ذبح کرنے سے نجس خون نکل جاتا ہے مذبوح جانور کو مزکی کہتے ہیں یہود میں جس طرح نماز فرض تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی مگر ان کی نماز اور زکوٰۃ کا قاعدہ اور تھا۔ (تفسیر حقانی)

وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: اکیلے اپنے گھروں میں نماز پر بس نہ کرو، بلکہ خدا کی جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھو رکوع کرو تاکہ دین کی تمام برکات و انوار حاصل ہوں۔ رکوع کے معنی جھکنا ہے چونکہ نماز کا یہ ایک جزو ہے تو کل کو بھی اس جزء کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور کبھی سجدہ کے ساتھ۔ تفسیر حقانی)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے خصوصاً رکوع کا ذکر فرما کر انہیں اس پر ابھارا کہ وہ مسلمانوں والی نماز ادا کریں، دوسرا یہ مراد بھی ہے کہ باجماعت نماز ادا کرو، اس مفہوم کی صورت میں آیت میں تکرار ختم ہو جائے گا، پہلے ارشاد میں اقامت نماز جب کہ دوسرے میں باجماعت ادائیگی کا حکم ہے، تیسرا یہ کہ رکوع سے مراد خضوع ہے، لغت میں رکوع و خضوع ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں، تو اب تکبر مذموم سے ممانعت اور عاجزی و تذلل کا حکم ہو گا۔ (تفسیر کبیر للرازی)

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ: اَلْبِرُّ نیکیوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اہل کتاب سے فرما رہے ہیں کہ اے گروہ اہل کتاب! تم لوگ اور لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور خود فراموشی کا شکار ہو، جو کچھ لوگوں کو حکم دیتے ہو خود اس پر عمل نہیں کرتے، باوجودیکہ تمہارے پاس کتاب موجود ہے، اس میں احکامات موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں کوتاہی برتنے کا کیا وبال اور کیا سزا ہے، جو کچھ تم اپنے ساتھ کر رہے ہو اس بارے میں تمہیں کچھ سمجھ بوجھ ہے، کیا تم خواب غفلت سے بیدار نہیں ہو رہے؟ کیا تم اندھے پن سے آنکھیں نہیں کھول رہے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح اس لیے خطاب فرمایا کہ یہ لوگ لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں، متقی پرہیز گار بن جائیں، نیکی کریں مگر اپنی یہ حالت تھی کہ ان ساری باتوں کی مخالفت کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ

نے انہیں شرم دلائی ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور منافقین دونوں ہی لوگوں کو نماز روزے کا حکم دیتے تھے، انہیں جن جن باتوں کے کرنے کا کہتے تھے خود وہ کام نہیں کرتے تھے، اس پر اللہ نے انہیں شرم دلائی ہے، کہ جو شخص دوسروں کو خیر و بھلائی کی دعوت دے اسے چاہیے کہ وہ بذات خود ان باتوں پر سب سے آگے بڑھ کر عمل کرے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ آیت کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں کہ اپنی کتاب کے ساتھ کفر کرنے سے لوگوں کو روکتے ہو لیکن اللہ کے اس نبی کو جھٹلا کر تم خود اپنی ہی کتاب کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو ؟ یہ بھی مطلب ہے کہ دوسروں کو اس دین اسلام کو قبول کرنے کے لئے کہتے ہو مگر دنیاوی ڈر خوف سے خود قبول نہیں کرتے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اور اپنے نفس کا ان سے بھی زیادہ، ان لوگوں کو اگر رشوت وغیرہ نہ ملتی تو حق بتا دیتے لیکن خود عامل نہ تھے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

شان نزول: علماء یہود سے ان کے مسلمان رشتہ داروں نے دین اسلام کی نسبت دریافت کیا تو انہوں نے کہا تم اس دین پر قائم رہو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین حق اور کلام سچا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ایک قول یہ ہے کہ آیت ان یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے مشرکین عرب کو حضور کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور حضور کے اتباع کرنے کی ہدایت کی تھی پھر جب حضور مبعوث ہوئے تو یہ ہدایت کرنے والے حسد سے خود کافر ہو گئے اس پر انہیں توبیخ کی گئی۔ (خازن)

وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ: اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، یعنی تم دین و شریعت کے عالم ہو اور جانتے ہو کہ ازروئے عقل و نقل تم پر شریعت کی ذمہ داریاں دوسروں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ (تفسیر تدبر قرآن)

مبلغین اور دُعاۃ اِلی اللہ کی ذمہ داریاں: یہاں پر یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اچھی چیز کا حکم دینے پر ان کی برائی نہیں کی گئی بلکہ خود نہ کرنے پر برائی بیان کی گئی ہے اچھی بات کو کہنا تو خود اچھائی ہے بلکہ

یہ تو واجب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کو خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیے جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (ھود:۸۸) یعنی میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہیں جس کام سے روکوں وہ خود کروں میرا ارادہ تو اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کا ہے میری توفیق اللہ کی مدد سے ہے میرا بھروسہ اسی پر ہے اور میری رغبت ورجوع بھی اسی کی طرف ہے۔

نیک کاموں کے کرنے کے لئے کہنا بھی واجب ہے اور خود کرنا بھی، ایک واجب کو نہ کرنے سے دوسرا بھی چھوڑ دینا نہیں چاہیے۔ علماء سلف وخلف کا قول یہی ہے گو بعض کا ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ برائیوں والا دوسروں کو اچھائیوں کا حکم نہ دے لیکن یہ قول ٹھیک نہیں، پھر ان حضرات کا اس آیت سے دلیل پکڑنا تو بالکل ہی ٹھیک نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے اور خود بھی بھلائی کرے اور برائی سے رکے، اگر دونوں چھوڑے گا تو دوہرا گنہگار ہوگا ایک کے ترک پر اکہرا گناہ ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَثَلُ الْعَالِمِ الَّذِيْ يُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَلَا يَعْمَلُ بِهٖ كَمَثَلِ السِّرَاجِ يُضِيْءُ لِلنَّاسِ وَيُحْرِقُ نَفْسَهٗ جو عالم لوگوں کو بھلائی سکھائے اور خود عمل نہ کرے اس کی مثال اس چراغ جیسی ہے کہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن وہ خود جل رہا ہے۔ (معجم کبیر طبرانی)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عَلَى قَوْمٍ شِفَاهُهُمْ تُقْرَضُ بِمَقَارِيضَ مِنْ نَارٍ قَالَ: قُلْتُ: مَنْ هَؤُلَاءِ؟ قَالُوا: خُطَبَاءُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا مِمَّنْ كَانُوا يَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ، وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا يَعْقِلُونَ؟

معراج والی رات میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے ہیں میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو کہا گیا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطیب، واعظ اور عالم ہیں جو لوگوں کو

بھلائی سکھاتے تھے مگر خود نہیں کرتے تھے علم کے باوجود سمجھتے نہیں تھے۔ (مسند احمد ، تفسیر ابن کثیر) دوسری روایت میں ہے کہ ان کی زبانیں اور ہونٹ دونوں کاٹے جا رہے تھے ۔(صحیح ابن حبان، ابن ابی حاتم، ان مردویہ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ بِهِ أَقْتَابُهُ ، فَيَدُورُ بِهَا فِي النَّارِ كَمَا يَدُورُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ، فَيُطِيفُ بِهِ أَهْلُ النَّارِ، فَيَقُولُونَ: يَا فُلَانُ مَا أَصَابَكَ؟ أَلَمْ تَكُنْ تَأْمُرُنَا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُولُ: كُنْتُ آمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِيهِ، وَأَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيهِ،

ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈالا جائے گا اس کی آنتیں نکل آئیں گی اور وہ اس کے ارد گرد چکر کھاتا رہے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد چکر لگاتا ہے، جہنمی جمع ہو کر اس سے پوچھیں گے کہ حضرت! آپ تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے یہ آپ کی کیا حالت ہے؟ وہ کہے گا افسوس میں تمہیں کہتا تھا لیکن خود نہیں کرتا تھا میں تمہیں روکتا تھا لیکن خود نہیں رکتا تھا۔ (مسند احمد) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ إِنَّ اللَّهَ يُعَافِي الْأُمِّيِّينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا لَا يُعَافِي الْعُلَمَاءَ اللہ تعالیٰ ان پڑھ لوگوں سے اتنا درگزر کرے گا جتنا جاننے والوں سے نہیں کرے گا۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَطَّلِعُونَ عَلَى أُنَاسٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُونَ: بِمَ دَخَلْتُمُ النَّارَ؟ فَوَاللَّهِ مَا دَخَلْنَا الْجَنَّةَ إِلَّا بِمَا تَعَلَّمْنَا مِنْكُمْ، فَيَقُولُونَ: إِنَّا كُنَّا نَقُولُ وَلَا نَفْعَلُ (ابن عساکر) جنتی لوگ جہنمیوں کو جھانک کر دیکھیں گے اور دیکھ کر ان سے کہیں گے کہ تمہاری نصیحتیں سن سن کر ہم تو جنتی بن گئے مگر تم جہنم میں کیوں آپڑے؟ وہ کہیں گے افسوس ہم تمہیں کہتے تھے لیکن خود نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کہا حضرت میں بھلائیوں کا حکم کرنا اور برائیوں سے

لوگوں کو روکنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کیا تم اس درجہ تک پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا اگر تم ان تینوں آیتوں کی فضیحت سے نڈر ہو گئے ہو تو شوق سے وعظ شروع کرو۔ اس نے پوچھا وہ تین آیتیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک تو اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (البقرۃ:۴۴) کیا تم لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے تئیں بھولے جا رہے ہو؟ دوسری آیت لِمَ تَقُوْلُوْنَ

مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف:۲-۳) کیوں تم وہ کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔ تیسری آیت حضرت شعیب علیہ السلام کا فرمان وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (ہود:۸۸) یعنی میں جن کاموں سے تمہیں منع کرتا ہوں ان میں تمہاری مخالفت کرنا نہیں چاہتا، میرا ارادہ صرف اپنی طاقت بھر اصلاح کرنا ہے کہو تم ان تینوں آیتوں سے بے خوف ہو؟ اس نے کہا نہیں فرمایا پھر تم اپنے نفس سے شروع کرو۔ (تفسیر مردویہ، ابن کثیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ دَعَا النَّاسَ إِلَى قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ وَلَمْ يَعْمَلْ هُوَ بِهِ لَمْ يَزَلْ فِي ظِلِّ سُخْطِ اللّٰهِ حَتَّى يَكُفَّ أَوْ يَعْمَلَ مَا قَالَ، أَوْ دَعَا إِلَيْهِ جو لوگوں کو کسی قول فعل کی طرف بلائے اور خود نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود آپ عمل کرنے لگ جائے۔ (حلیۃ الاولیاء، طبرانی) مسلم بن عمرو نے کیا خوب کہا

مَا أَقْبَحَ التَّزْهِيدَ مِنْ وَاعِظٍ ... يُزَهِّدُ النَّاسَ وَلَا يَزْهَدُ

لَوْ كَانَ فِي تَزْهِيدِهِ صَادِقًا ... أَضْحَى وَأَمْسَى بَيْتُهُ الْمَسْجِدُ

إِنْ رَفَضَ النَّاسُ فَمَا بَالَهُ ... يَسْتَفْتِحُ النَّاسَ وَيَسْتَرْقِدُ

الرِّزْقُ مَقْسُومٌ عَلَى مَنْ تَرَى ... يُسْقَى لَهُ الْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ

واعظ کا زہد بیان کرنا کس قدر برا ہے کہ لوگوں کو زہد اختیار کرنے کا درس دیتا ہے اور خود زہد اختیار نہیں کرتا، اگر واعظ اپنے زہد بیان کرنے میں سچا ہے تو پھر صبح وشام اس کا گھر مسجد بن جائے گا، اگر لوگوں نے چھوڑ دیا تو اس کا کیا حال ہو گا، خود لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے اور آپ غافل ہو جاتا ہے، رزق جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ کالے اور گورے کو مل کر رہے گا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں زاہد ابو عثمان حیری رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن وہ وعظ و نصیحت کی مجلس میں بیٹھے تو لمبی خاموشی چھا گئی، پھر گویا ہوئے

وَغَيْرُ تَقِيٍّ يَأْمُرُ النَّاسَ بِالتُّقَى ۔۔۔ طَبِيبٌ يُدَاوِي وَالطَّبِيبُ مَرِيضُ

بغیر تقویٰ والا لوگوں کو تقویٰ کی نصیحت کرتا ہے، ڈاکٹر دوا دارو کرتا ہے جب کہ وہ خود بیمار ہے، جب یہ کہہ رہے تھے تو لوگوں نے چیخ وپکار کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ اس پر ابو العتاھیہ شاعر نے کہا

وَصَفْتَ التُّقَى حَتَّى كَأَنَّكَ ذُو تُقَى ۔۔۔ وَرِيحُ الْخَطَايَا مِنْ شَأْنِكَ تُقْطَعُ

تو نے تقویٰ کی صفات بیان کیں گویا کہ تو خود متقی ہے، اور خطاؤں کی ہوائیں تیری وجہ سے کٹتی ہیں۔

حضرت ابو الاسود دؤلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَتَأْتِيَ مِثْلَهُ ۔۔۔ عَارٌ عَلَيْكَ إِذَا فَعَلْتَ عَظِيمُ

يَا أَيُّهَا الرَّجُلُ الْمُعَلِّمُ غَيْرَهُ ۔۔۔ هَلَّا لِنَفْسِكَ كَانَ ذَا التَّعْلِيمُ

تَصِفُ الدَّوَاءَ لِذِي السَّقَامِ وَذِي الضَّنَا ۔۔۔ كَيْمَا يَصِحُّ بِهِ وَأَنْتَ سَقِيمُ

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا ۔۔۔ فَإِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَأَنْتَ حَكِيمُ

فَهُنَاكَ يُقْبَلُ إِنْ وَعَظْتَ وَيُقْتَدَى ۔۔۔ بِالرَّأْيِ مِنْكَ وَيَنْفَعُ التَّعْلِيمُ

ایسے اخلاق سے نہ روک جو خود تو اختیار کرتا ہے، یہ تیرے لیے شرم کی بات ہے جب تو کوئی بڑا کام کرے، اے دوسروں کو تعلیم دینے والے! پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے، تو بیماروں اور کمزوروں کے لیے دوا دارو تجویز کرتا ہے وہ کیسے ٹھیک ہوں گے جب کہ تو خود بیمار ہے، اپنے نفس سے شروع کر

اور اسے گمراہی سے روک، جب تو اسے گمراہی سے روک لے تو پھر تو حکیم بن جائے گا، اس وقت تیری بات قبول کی جائے گی اگر تو نصیحت کرے اور تیری رائے کی پیروی کی جائے اور اس وقت دوسروں کو سکھانا مفید ہو گا۔

مشہور عابد اور واعظ شیخ عبد الواحد بن زید بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ مجھے ایسا شخص دکھائے جو جنت میں میرا ساتھی ہو گا، پھر مجھے خواب میں کہا گیا کہ جنت میں جو تیرا ساتھی ہو گا وہ کوفہ میں رہنے والی ایک عورت میمونہ سوداہے، پھر میں نے اس کی زیارت کے لیے کوفہ جانے کا ارادہ کیا، وہاں مجھے کہا گیا کہ یہاں ایک وادی میں بکریاں چراتی ہے، چنانچہ میں میمونہ سوداء کے پاس پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہ نماز پڑھ رہی ہے اور بکریاں اس کے ارد گرد چر رہی ہیں، ان بکریوں کے درمیان بھیڑیے ہیں، یہ بکریاں ان بھیڑیوں سے ڈرتی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ بھیڑیے ان بکریوں پر حملہ کرتے ہیں، جب میمونہ نے سلام پھیرا تو کہنے لگیں کہ اے ابن زید! یہاں رفاقت کا وعدہ نہیں ہے، رفاقت کا وعدہ تو آخرت میں ہے، پھر میں نے میمونہ سے پوچھا کہ یہ بھیڑیوں اور بکریوں کا کیا قصہ ہے؟ میمونہ نے کہا کہ میں نے اپنے اور اپنے آقا کے درمیان معاملات ٹھیک کر لیے ہوئے ہیں، چنانچہ اس نے بکریوں اور بھیڑیوں کے درمیان حالات ٹھیک کر دیے ہیں۔

میں نے یہ سن کر میمونہ سے کہا مجھے کچھ نصیحت کیجیے، تو وہ کہنے لگیں تعجب اس واعظ پر جسے وعظ کیا جائے، پھر کہنے لگیں اے ابن زید! اگر تو انصاف کا ترازو اپنے جسم پر رکھے تو میں اس میں چھپی ہوئی چیز بتاؤں، اے ابن زید! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جس بندے کو دنیا کی کوئی چیز عطا ہوئی پھر اس کے بعد وہ دوسری چیز کو تلاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خلوت کی محبت سلب کر لیتے ہیں اور اسے قرب کے بعد بُعد میں بدل دیتے ہیں اور انس کو وحشت کے ساتھ بدل دیتا ہے، پھر یہ شعر پڑھنے شروع کیے

يَا وَاعِظًا قَامَ لَا حِسَاب　　يَزْجُرُ قَومًا عَنِ الذُّنُوبِ

تَنهَ عَنهُ وَأَنْتَ السَّقِيمُ حَقًّا　　هَذَا مِنَ الْمُنْكَرِ الْعَجِيبِ

تَنَهَ عَنِ الْغَيِّ وَالتَّمَادِي وَأَنْتَ فِي النَّهْيِ كَالْمُرِيبِ
لَوْ كُنْتَ أَصْلَحْتَ قَبْلَ هَذَا غَيَّكَ أَوْ تُبْتَ مِنْ قَرِيبِ
كَانَ لِمَا قُلْتَ يَا حَبِيبِي مَوْضِعُ صِدْقٍ مِنَ الْقُلُوبِ

نماز و صبر کے ذریعے مدد حاصل کرنے کا حکم

سوال اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو چیزوں کے ذریعے مدد حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، وہ دو چیزیں کون سی ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ہمیں صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، اس پر دلیل یہ ہے وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (۴۵) الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۴۶) البقرۃ، اور (رنج و تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بیشک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر (گراں) نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔ جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں اور ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبر اور نماز یہ دو چیزیں اللہ کی طرف سے مددگار اور معین ہیں اس لیے ان دونوں کے ذریعے اللہ سے مدد چاہو۔ (عبد بن حمید) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبر بندے کا اللہ کے لیے اعتراف ہے اس چیز میں جو اسے اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے، اللہ کے پاس سے اسے ثواب ملنے کی امید ہوتی ہے، مضبوط ترین آدمی بھی ہو تو اسے صبر کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ (کتاب العزاء ابن ابی الدنیا) عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبر دو طرح ہے، ایک صبر ہے مصیبت کے وقت، ایک صبر ہے اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے کا، ان دونوں میں وہ صبر جو مصیبت کے وقت کیا جائے اچھا ہے اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچے یہ سب سے اچھا صبر ہے۔ (ابی حاتم)

حضرت ابن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبر کے دو دروازے ہیں، ایک محبوب چیز میں اللہ کے لیے

صبر کرنا ہے اگرچہ وہ دلوں اور بدنوں پر کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، دوسرا ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرنا اگرچہ خواہشات اس کی طرف الجھیں، جو شخص ایسا ہے وہ صبر کرنے والوں میں سے ہے۔ (در منثور ج ا ص ۱۵۹) حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصَّبْرُ ثَلَاثَةٌ فَصَبْرٌ عَلَى الْمُصِيبَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ صبر تین قسم پر ہے، ایک صبر مصیبت پر، ایک صبر طاعت پر، ایک صبر معصیت پر۔ (کتاب الصبر ابن ابی الدنیا، الثواب لابی الشیخ، مسند الفردوس بماثور الخطاب للدیلمی، در منثور للسیوطی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ كُنْتُ رَدِيفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا غُلَامُ أَوْ يَا بُنَيَّ أَوَ لَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللهُ بِهِنَّ؟ قُلْتُ: بَلَى، قَالَ: احْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَى اللهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، قَدْ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ، فَلَوْ أَنَّ الْخَلْقَ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَرَادُوا أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ، وَإِنْ أَرَادُوا أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ، وَاعْمَلْ لِلَّهِ بِالشُّكْرِ فِي الْيَقِينِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى مَا تَكْرَهُ خَيْرٌ كَثِيرٌ، وَأَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ وَأَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (شعب الایمان، ترمذی)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! یا یوں فرمایا: اے پیارے بیٹے! کیا میں تجھے چند کلمات نہ سکھاؤں جن کے ذریعے اللہ تجھے نفع دے، میں نے عرض کی، ہاں سکھادیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے احکام کی حفاظت کر، اللہ تیری حفاظت کرے گا، اللہ کے احکامات کی حفاظت کر اللہ کو اپنے سامنے پائے گا، خوشحالی میں اللہ کو پہچان وہ مصیبت میں تجھے پہچانے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، جب تو مدد مانگے تو اللہ سے مدد مانگ، جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں قلم خشک ہو چکے ہیں، اگر مخلوق ساری کی ساری اس بات پر اکٹھی ہو جائے کہ وہ

تجھے کسی چیز میں نفع دے، جس کا فیصلہ اللہ نے تیرے لیے نہیں کیا تو وہ تجھے نفع دینے پر قادر نہ ہو سکیں گے، اگر وہ ارادہ کریں کہ تجھے اس چیز میں نقصان پہنچائیں جس کا اللہ نے تیرے لیے ارادہ نہیں کیا تو وہ تجھے نقصان نہیں دے سکتے، اللہ کے لیے عمل کرو شکر کے ساتھ یقین میں، جان لو! جس چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اس پر صبر یہ بہت ہی خیر کی بات ہے، مدد صبر کے ساتھ ہے، کشادگی دکھ کے ساتھ ہے، آسانی تنگی کے ساتھ ہے۔

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كَانَ رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم إِذَا حَزَبَهُ أَمرٌ فَزَعَ إِلَى الصَّلَاةِ (ابو داؤد) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی اہم کام پیش آتا تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كَانَ رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم إِذا كَانَت لَيْلَةُ رِيح كَانَ مَفزَعُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ حَتَّى يَسكُنَ وَإِذَا حَدَثَ فِي السَّمَاءِ حَدَثٌ مِّن كُسُوف شَمس أَو قَمَر كَانَ مَفزَعُهُ إِلَى الصَّلَاةِ جب رات کے وقت تیز ہوا چلتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پناہ مسجد ہی ہوتی تھی، یہاں تک کہ ہوا کا زور تھم جاتا، جب آسمان میں کسی قسم کا وقوعہ ہوتا سورج گرہن یا چاند گرہن ہوتا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھکانہ مسجد ہی ہوتا تھا۔ (ابن ابی الدنیا، ابن عساکر، در منثور)

حضرت مقاتل بن حیان رحمہ اللہ اس آیت میں صبر اور نماز سے مدد چاہنے کے بارے میں فرماتے ہیں اِسْتَعِينُوا عَلَى طَلَبِ الْآخِرَةِ بِالصَّبْرِ عَلَى الْفَرَائِضِ وَالصَّلَاةِ، فَحَافِظُوا عَلَيْهَا، وَعَلَى مَوَاقِيتِهَا، وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فِيهَا، وَرُكُوعِهَا، وَسُجُودِهَا، وَتَكْبِيرِهَا، وَالتَّشَهُّدِ فِيهَا، وَالصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِكْمَالِ طُهُورِهَا، فَذَلِكَ إِقَامَتُهَا وَإِتْمَامُهَا (شعب الایمان)

آخرت طلب کرنے میں فرائض پر صبر کر کے مدد چاہو، نماز کی حفاظت کرو، اس کے اوقات کی پابندی کرو، اس میں قرآن کی تلاوت کرو، اس کے رکوع اور سجدے، اس کی تشہد اور اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف اچھی طرح پڑھو، اسے مکمل پاکیزگی کے ساتھ ادا کرو، یہ اقامت صلاۃ اور اتمام صلاۃ ہے۔

الَّذِينَ يَظُنُّونَ: لفظ ظن اضداد سے ہے کبھی تو اس کے معنی شک کے ہوتے ہیں اور کبھی یقین کے، مراد یہ کہ لفظ ظن مشترک ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ مشترک تو نہیں اس کے معنی فقط گمان غالب کے ہیں لیکن مجازاً کبھی کبھی یقین کو ظن اس لئے بول دیتے ہیں کہ اس میں بھی ایک طرف غالب ہوتی ہے۔ (تفسیر بغوی، تفسیر مظہری، تفسیر جواہر القرآن)

حق تعالیٰ نے جو لفظ ظن ارشاد فرمایا اور علم و یقین کا لفظ نہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ جسے اس امر کا گمان غالب بھی ہو گا کہ میں اللہ سے ملنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ نیکی بدی کا بدلہ دے گا تو وہ اگر عقل صحیح و سلیم رکھتا ہو گا تو طاعت پر قائم رہنا اور معصیت سے مجتنب رہنا ضرر سے بچنے کے لیے اس پر سہل و آسان ہو جائے گا دیکھو اگر کسی کو بظن غالب یہ بات معلوم ہو کہ اس کوزہ کا پانی زہر آلود ہے تو وہ پیاس کی تکلیف اور شدت کو برداشت کر لے گا اور اس پانی کو کبھی بھی نہ پیئے گا۔

ایسے ہی اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ فلاں کوزہ کا پانی امراض سے شفاء دیتا ہے اور بدن میں قوت بخشتا ہے تو وہ اگرچہ تلخ اور بدمزہ ہی کیوں نہ ہو اسے خوشی خوشی پی جائے گا تو جب ایسے قلیل ضرر سے بچنے اور فانی نفع کے حاصل کرنے کے لیے آدمی مشقت کو برداشت کر لیتا ہے تو بھلا وہ شخص جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے وہ تعب و مشقت محبوب حقیقی کی رضا کے لیے کیونکر نہ گوارا کر لے گا اور چونکہ ان تکالیف کا محبوب نے حکم فرمادیا ہے اس لیے اس کی برداشت اور مشغولی میں اسے ایک طرح کی لذت اور مزہ آئے گا، اسی لیے فخر موجودات سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ (یعنی میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے) (حاکم، نسائی)

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: یعنی وہ اس کی توقع رکھتے ہیں کہ اپنے رب کو آخرت میں دیکھنے والے ہیں سچ ہے کہ نماز مؤمن کی معراج ہے بندہ کے لیے رویت باری تعالیٰ کا وسیلہ بن جاتی ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے، وَ مِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (یعنی اور رات کے

کچھ حصے میں تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے فرض زائد ہے عنقریب تمہیں تمہارا رب مقام محمود میں کھڑا کرے گا)(مظہری)

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سویا کرتا تھا ایک رات کا ذکر ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وضو کا پانی اور بعض حاجت کی چیزیں لایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں رہوں فرمایا اس کے سوا کچھ اور؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس یہی، فرمایا اگر یہی مطلوب ہے تو یہ ہمت کر کہ کثرت سے سجدے کیا کر۔ (یعنی کثرت سے نوافل پڑھا کر) (مسلم، بحوالہ مظہری) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب حالتوں میں سجدہ کی حالت خدا تعالیٰ سے زیادہ قرب کی ہے۔ (مسلم، بحوالہ مظہری) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مُلٰقُوْ رَبِّهِمْ میں لقاء سے حشر اور معاملہ خداوندی مراد ہے۔

وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: یعنی جو اسے جانتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف جانے والے ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ نیک و بد کا بدلہ دینے والا ہے جو شخص اس کا لحاظ کرے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے معاملہ پڑتا ہے اور وہاں جزا و سزا بھی ہونی ہے تو اسے صبر آسان ہو جائے گا، اسی لیے جو شخص مصیبت زدہ ہو اس کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا کرے۔ (تفسیر مظہری)

بنی اسرائیل پر نعمتیں اور میدان محشر کا منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۷) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۸) البقرہ

جواب ترجمہ: اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور یہ بات (یاد

کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔

بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد پر جو نعمت الٰہیہ انعام کی گئی تھی اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان میں سے رسول ہوئے، ان پر کتابیں اتریں، انہیں ان کے زمانہ کے دوسرے لوگوں پر مرتبہ دیا گیا جیسے فرمایا وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (الدخان: ۳۲) یعنی انہیں ان کے زمانے کے (اور لوگوں پر) ہم نے علم میں فضیلت دی۔ اور فرمایا وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ ۲۰) یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر انعام کی گئی ہے تم میں اس نے پیغمبر پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنایا اور وہ دیا جو تمام زمانے کو نہیں دیا، تمام لوگوں پر فضیلت ملنے سے مراد ان کے زمانے کے تمام اور لوگ ہیں اس لئے کہ امت محمدیہ ان سے یقیناً افضل ہے اس امت کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ یہ بہترین امت ہے جو لوگوں کے نفع کے لیے نکالی گئی ہے، یہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتی ہے، برائی سے روکتی ہے اور اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا: نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ فائدہ نہ دے گا جیسے فرمایا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر: ۱۸) یعنی کسی کا بوجھ کسی پر نہ پڑے گا اور فرمایا لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (عبس: ۳۷) یعنی اس دن ہر شخص نفسا نفسی میں پڑا ہوا ہو گا اور فرمایا، اے لوگو اپنے رب کا خوف کھاؤ اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ ارشاد ہے وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (البقرۃ: ۴۸) یعنی کسی کافر کی نہ کوئی سفارش کرے نہ اس کی سفارش قبول ہو۔ (ابن کثیر)

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ: ان کفار کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی دوسری جگہ اہل جہنم کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ افسوس آج ہمارا نہ کوئی سفارشی ہے نہ دوست۔

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ: ان کافروں سے فدیہ بھی نہ لیا جائے گا اور جو لوگ کفر پر مر جاتے ہیں وہ اگر زمین بھر کر سونا دیں اور ہمارے عذابوں سے چھوٹنا چاہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا اور جگہ ہے کافروں کے پاس اگر تمام زمین کی چیزیں اور اس کے مثل اور بھی ہوں اور قیامت کے دن وہ اسے فدیہ دے کر عذابوں سے بچنا چاہیں تو بھی کچھ قبول نہ ہو گا اور دردناک عذابوں میں مبتلا رہیں گے اور جگہ ہے، گو وہ زبردست فدیہ دیں پھر بھی قبول نہیں دوسری جگہ ہے آج تم سے نہ بدلہ لیا جائے نہ ہی کافروں سے تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اسی کی آگ تمہاری وارث ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بغیر سفارش اور شفاعت کا آسرا بیکار محض ہے قرآن میں ارشاد ہے اس دن سے پہلے نیکیاں کر لو جس دن نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی اور شفاعت مزید فرمایا يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ (ابراھیم :۳۱) اس دن نہ بیع ہو گی نہ دوستی۔ عدل کے معنی یہاں بدلے کے ہیں اور بدلہ اور فدیہ ایک ہے، ایک روایت میں ہے حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ عدل کے کیا معنی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا فدیہ)

وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ: ان کی مدد بھی نہ کی جائے گی یعنی کوئی حمایتی نہیں ہو گا، قرابتیں کٹ جائیں گی، جاہ و حشم جاتا رہے گا کسی کے دل میں ان کے لئے رحم نہ رہے گا نہ خود ان میں کوئی قدرت و قوت رہے گی اور جگہ ہے وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المؤمنون :۸۸) وہ پناہ دیتا ہے اور اس کی پکڑ سے نجات دینے والا کوئی نہیں، ایک جگہ ہے آج کے دن نہ اللہ کا سا کوئی عذاب دے سکے نہ اس کی سی قید و بند۔

ارشاد ہے مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ تم آج کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے بلکہ وہ سب کے سب آج گردنیں جھکائے تابع فرمان بنے کھڑے ہیں ایک اور آیت میں ہے فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً (الاحقاف :۲۸) اللہ کے قرب

کے لئے وہ اللہ کے سوا جن کی پوجا پاٹ کرتے تھے آج وہ معبود اپنے عابدوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ بلکہ وہ تو غائب ہو گئے مطلب یہ ہے کہ محبتیں فنا ہو گئیں رشوتیں کٹ گئیں، شفاعتیں مٹ گئیں، آپس کی امداد و نصرت نابود ہو گئی معاملہ اس عادل حاکم جبار و قہار اللہ تعالیٰ مالک الملک سے پڑا ہے جس کے ہاں سفارشیوں اور مددگاروں کی مدد کچھ کام نہ آئے بلکہ اپنی تمام برائیوں کا بدلہ بھگتنا پڑے گا، ہاں یہ اس کی کمال بندہ پروری اور رحم و کرم انعام و اکرام ہے کہ گناہ کا بدلہ برابر دے اور نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا بڑھا کر دے۔ (ابن کثیر)

بچوں کا قتل عام

سوال آلِ فرعون بنی اسرائیل کو کس طرح سزا دیتے تھے؟ اور ان کے بچوں کو کیوں قتل کرتے تھے؟

جواب آلِ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو مار دیتے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، ارشاد ہے وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (۴۹) البقرۃ۔

اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی وہ تمہیں بری طرح عذاب دیا کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔

فرعون نے چار سو سال تک حکمرانی کی، اسے نجومیوں نے بتایا کہ تیری سلطنت میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو تیری ہلاکت کا باعث ہو گا، اس پر اس نے شہر میں اپنے اہلکار روانہ کر دیے جن کو یہ ڈیوٹی سونپی کہ شہر کی حاملہ عورتوں کو چیک کریں، اگر وہ بیٹا پیدا کریں تو اسے ذبح کر دیا جائے اور اگر بیٹی پیدا کریں تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے، اس نے ایک ہزار عورتوں پر سو مردوں کو نگران مقرر کر رکھا تھا، ہر سو عورتوں پر دس مردوں کو نگران مقرر کر رکھا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور فرعون کی غرقابی

سوال اس آیت میں کیا بیان کیا گیا، ترجمہ اور مختصر تفسیر کریں

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (۵۰) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو پھاڑ ڈالا تھا چنانچہ تم سب کو بچالیا تھا اور فرعون کے لوگوں کو (سمندر میں) غرق کر ڈالا تھا اور تم یہ سارا نظارہ دیکھ رہے تھے۔

اس آیت شریفہ میں اجمالی طور پر مصریوں سے بنی اسرائیل کی نجات اور آل فرعون کی بربادی اور ہلاکت کا ذکر ہے اللہ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر مصر کی آبادیوں سے نکل جاؤ اس وقت مصر میں فرعون کی حکومت تھی فرعون مصر کے ہر فرمانروا کو کہا جاتا تھا اور اس فرعون کا نام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا بعض مفسرین نے ولید بتایا ہے، بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا نام بھی موسیٰ تھا، اس کا تعلق قوم عاد سے بتاتے ہیں، یہ بڑا سرکش بادشاہ تھا اپنے آپ کو سب سے اونچا معبود منواتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو رات کو لے کر مصر کی آبادی سے نکل گئے اور سمندر کے کنارے پہنچ گئے ان کے نکلنے کی جب فرعون اور آل فرعون کو خبر لگی تو فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔

بنی اسرائیل دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے سورج نکل چکا تھا فرعون جو اپنے لشکروں کے ساتھ پیچھے سے پہنچا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ کہ ہم تو دھر لئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ہرگز نہیں بیشک میرے ساتھ میرا رب ہے اور وہ ضرور مجھے راہ بتائے گا۔

اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تم اپنی لاٹھی سمندر میں مارو! انہوں نے سمندر میں لاٹھی ماری تو سمندر پھٹ گیا اور پہاڑوں کے برابر اس کے ٹکڑے ہوگئے ان پانی کے پہاڑوں کے درمیان زمین خشک ہوگئی اور بنی اسرائیل کے قبیلے ان پہاڑوں کے درمیان سے گزر

گئے۔ فرعون نے بھی اپنی جماعتوں اور لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا اور یہ لوگ بھی سمندر میں داخل ہو گئے بنی اسرائیل کا پار ہونا تھا اور فرعون اور اس کے لشکر کا سمندر میں داخل ہونا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو ملا دیا اور فرعون اپنے لشکروں اور جماعتوں سمیت ڈوب گیا، ان کے ڈوبنے کے اس منظر کو بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، جس کو اس آیت میں وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرعون جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں بھی ایمان لاتا ہوں کہ اس ذات کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ (تفسیر انوار البیان)

کوہ طور پر چالیس راتوں کا اعتکاف

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۵۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا تھا پھر تم نے ان کے پیچھے (اپنی جانوں پر) ظلم کر کے بچھڑے کو معبود بنا لیا پھر اس سب کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کوہ طور پر آکر چالیس دن اعتکاف کریں تو انہیں تورات عطا کی جائے گی؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے، ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سامری جادوگر نے ایک گائے کا بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل کو اسے اپنا معبود قرار دینے اور اس کی عبادت کرنے پر آمادہ کر لیا اور اس طرح وہ شرک میں مبتلا ہو گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع ہوئی وہ گھبرا کر واپس تشریف لائے اور بنی اسرائیل کو توبہ کی تلقین فرمائی، اس توبہ کا ایک حصہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں سے جو لوگ اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے تھے وہ ملوث ہونے والوں کو قتل کریں؛ چنانچہ ان کی ایک بڑی تعداد قتل کی گئی اور اس طرح ان کی توبہ قبول ہوئی۔ توضیح القرآن للشیخ الاسلام عثمانی)

الکتاب اور الفُرقان

سوال اس آیت مبارکہ میں الکتاب اور الفرقان کا ذکر ہے، اس کی وضاحت کی جائے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۵۳) البقرہ

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور قانون فیصل دیا تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

جواب مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو الکتاب ذکر فرمایا گیا ہے اسی کی تفسیر الفرقان کے ساتھ کی گئی ہے، یعنی جسے کتاب کہا گیا وہی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی کتاب ہے۔ (تفسیر در منثور)

مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الْفُرْقَانُ جُمَّاعُ اسْمِ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيل وَالزَّبُور وَالْفرْقَان (در منثور) فرقان تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم کے مجموعے کا نام ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الفرقان سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تورات کے اندر کوئی چیز ہو وہ مراد ہو، یا تورات سے باہر کوئی چیز ہو وہ مراد ہو، ان تین چیزوں سے زائد کوئی چیز نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ تورات کی دو صفتیں ہیں

① ایک یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے اتاری گئی کتاب ہے۔

② دوسرا یہ کہ وہ فرقان ہے، جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے جیسے عربی کا محاورہ ہے رَأَيْتُ الْغَيْثَ وَاللَّيْثَ تُرِيدُ الرَّجُلَ الْجَامِعَ بَيْنَ الْجُودِ وَالْجَرَاءَةِ میں نے غیث اور لیث کو دیکھا اس سے مراد وہ شخص ہے جس میں سخاوت اور بہادری دو چیزیں جمع ہوں، اس کی نظیر جیسے اللہ نے فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا [الْأَنْبِيَاءِ: ۴۸] اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دیا، روشنی دی اور نور دیا۔

دوسری بات کہ فرقان سے مراد تورات کے اندر ہی کوئی چیز ہے وہ ہو سکتی ہے، تو تورات میں دین بیان کیا گیا ہے، کیونکہ جب دین وضاحت کرتا ہے تو حق غالب آتا ہے، باطل سے ممتاز نظر آتا ہے،

اس لیے فرقان سے مراد وہ بعض چیزیں مراد ہیں جو تورات کے اندر موجود ہیں اور تورات کے اندر دین کے اصول اور فروع کا بیان ہے۔

تیسری مراد کی وضاحت یہ ہے کہ فرقان سے مراد وہ چیزیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی ہیں، جیسے ید بیضا، عصا، تمام معجزات، اس لیے اس کو فرقان کہا گیا کیونکہ یہ چیزیں حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ فرقان سے مراد وہ مدد اور وہ فتح ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل کو فرعونیوں پر دی۔ (کبیر ج۳ ص ۵۱۴)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الکتاب سے مراد تورات ہے اور الفرقان سے مراد وہ چیز ہے جس کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان تمیز ہوتی ہے، فرقان سے مراد ہدایت اور گمراہی کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۶۱)

فرّاء رحمہ اللہ اور قطرب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ الکتاب سے مراد تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اور الفرقان سے مراد قرآن مجید ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ (قرطبی)

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی توبہ اور جانوں کا قتل

سوال اس آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَاقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۵۴)البقرہ)

جواب ترجمہ: اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم! حقیقت میں تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے لہٰذا اب اپنے خالق سے توبہ کرو اور اپنے آپ کو قتل کرو تمہارے خالق کے نزدیک یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اس طرح اللہ نے تمہاری توبہ قبول

کرلی۔ بیشک وہی ہے جو اتنا معاف کرنے والا، اتنا رحم کرنے والا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام تورات شریف لے کر واپس بنی اسرائیل کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ بچھڑے کی عبادت میں منہمک ہو چکے ہیں اس پر انہیں بہت زیادہ غصہ آیا اور ان کو بت پرستی سے توبہ کرنے پر متوجہ فرمایا، ان لوگوں کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توجہ دلانے سے اپنی گمراہی کا احساس ہو گیا جیسا کہ سورۃ اعراف میں فرمایا: وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اور جب نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں معاف نہ کرے تو ہم بالکل نقصان میں پڑ جانے والے ہوں گے۔

بچھڑا پرستوں کی توبہ: ان لوگوں کی توبہ کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمایا تھا کہ وہ مقتول ہو جائیں، مفسرین نے لکھا ہے کہ یوں حکم ہوا تھا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی وہ ان لوگوں کو قتل کر دیں۔ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب قتل کرنا شروع کیا تو قاتلین کے سامنے بچھڑے کی عبادت کرنے والوں میں وہ لوگ بھی سامنے آجاتے تھے جو ان کے رشتہ دار اور عزیز قریب تھے لہٰذا وہ قتل کرنے سے ہچکچاتے تھے اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل بھیج دیے تاکہ ایک دوسرے کو نہ دیکھیں اور صبح سے شام تک قتل کا سلسلہ چلتا رہا حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی بادل ہٹا دیا گیا اور توبہ نازل ہو گئی اس وقت تک ستر ہزار آدمی قتل کیے جا چکے تھے، مفسرین کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ سب ہی مقتول نہیں ہوئے بلکہ ستر ہزار کے قتل ہونے پر سب کی توبہ قبول ہو گئی۔ (ابن کثیر، انوار البیان)

آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ کہ تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مستحق عبادت وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اسے چھوڑ کر تم ایسی چیز کی پرستش میں لگ گئے جس کی شکل و صورت تمہارے آدمی نے خود بنائی۔ شرک کی سزا

دوزخ کا دائمی عذاب ہے اس سے بچنے کے لئے توبہ کرلو اور توبہ کی قبولیت کے لیے یہ شرط لگائی کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو اور فرمایا کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے یہ ایک وقتی تکلیف ہے، جس کا سہہ لینا دوزخ کے دائمی عذاب کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہل ہے اور اس عذاب سے بچنا تمہارے لیے بہت بہتر ہے، امت محمدیہ پر اللہ جل شانہٗ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے اس کی توبہ ندامت سے اور آئندہ گناہ کے نہ کرنے کا فیصلہ کرلینے پر اور حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے سے قبول ہو جاتی ہے، کوئی کیسا ہی کتنا بڑا گناہ کرے، کفر اختیار کرے، شرک کا کام کرے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے، سچے دل سے اسلام قبول کرے توحید و رسالت پر ایمان لائے اس کی توبہ قبول ہے۔ (انوار البیان)

اصحاب موسیٰ علیہ السلام موت کے منہ میں

سوال موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایمان لانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کون سی شرط رکھی تھی؟

جواب انہوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے واضح طور پر نہ دیکھ لیں تب تک وہ ایمان نہیں لائیں گے، اس پر یہ دلیل ہے وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (۵۵) البقرہ، اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔ یہ ستر وہ لوگ تھے جن کا انتخاب موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، انہیں موت دینے کے بعد اللہ نے دوبارہ سے زندہ کر دیا تھا، تاکہ یہ اپنی عمریں پوری کرلیں۔

قوم موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی کرم نوازی، بادلوں کا سایہ اور من وسلویٰ

سوال اللہ تعالیٰ نے قومِ موسیٰ پر کیا کرم نوازی فرمائی؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ان کو نئے سرے سے زندگی عطاء فرمائی، ان کو گرمی میں سایہ مہیا کیا، من اور سلویٰ کی شکل میں تیار شدہ کھانا ملتا تھا، قرآن حکیم میں ہے، ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۵۶) وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۵۷) البقرہ۔

پھر موت آجانے کے بعد ہم نے تم کو از سر نو زندہ کر دیا تا کہ احسان مانو۔ اور بادل کا تم پر سایہ کیے رکھا اور (تمہارے لئے) من وسلوٰی اتارتے رہے کہ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ پیو (مگر تمہارے بزرگوں نے ان نعمتوں کی کچھ قدر نہ جانی) اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں كَانَ الْمَنُّ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ فِي مَحَلَّتِهِمْ سُقُوطَ الثَّلْجِ، أَشَدَّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، وَأَحْلَى مِنَ الْعَسَلِ، يَسْقُطُ عَلَيْهِمْ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَى طُلُوعِ الشَّمْسِ، يَأْخُذُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ قَدْرَ مَا يَكْفِيهِ يَوْمَهُ ذَلِكَ، فَإِذَا تَعَدَّى ذَلِكَ فَسَدَ وَلَمْ يَبْقَ، حَتَّى إِذَا كَانَ يَوْمُ سَادِسِهِ، لِيَوْمِ جُمُعَتِهِ، أَخَذَ مَا يَكْفِيهِ لِيَوْمِ سَادِسِهِ وَيَوْمِ سَابِعِهِ، لِأَنَّهُ كَانَ يَوْمَ عِيدٍ لَا يَشْخَصُ فِيهِ لِأَمْرِ مَعِيشَتِهِ وَلَا يَطْلُبُهُ لِشَيْءٍ، وَهَذَا كُلُّهُ فِي الْبَرِّيَّةِ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۶۷)

اولوں کی طرح "من" ان کے گھروں میں اترتا تھا، جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ صبح صادق سے لے کر آفتاب نکلنے تک اترتا رہتا تھا ہر شخص اپنے گھر بار کے لئے اتنی مقدار میں جمع کر لیتا تھا جتنا اس دن کافی ہو، اگر کوئی زیادہ لیتا تو بگڑ جاتا تھا، جمعہ کے دن وہ دو دن کا لے لیتے تھے، جمعہ اور ہفتہ کا اس لئے کہ ہفتہ ان کا بڑا دن تھا۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ الْمَنُّ شَرَابٌ كَانَ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ مِثْلَ الْعَسَلِ، فَيَمْزُجُونَهُ بِالْمَاءِ ثُمَّ يَشْرَبُونَهُ من شہد جیسی چیز تھی جس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۶۷) حضرت شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عَسَلُكُمْ هَذَا جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِنَ الْمَنِّ (تفسیر ابن کثیر ج ا) تمہارا یہ شہد اس "من" کا ستر واں حصہ ہے۔ عبد الرحمن بن زید بن اسلم

رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "من" سے مراد شہد ہے۔

امیہ بن صلت کے شعروں میں یہی "من" شہد کے معنی میں آیا ہے

فَرَأَى اللّٰهُ أَنَّهُمْ بِمَضِيعٍ ... لَا بِذِي مَزْرَعٍ وَلَا مَثْمُورَا

فَسَنَاهَا عَلَيْهِمُ غَادِيَاتٍ ... وَتَرَى مُزْنَهُمْ خَلَايَا وَخُورَا

عَسَلًا نَاطِفًا وَمَاءً فُرَاتًا ... وحليباً ذَا بهجةٍ مرموراً

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں یہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں غرضیکہ "من" کی تفسیر میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کی تفسیریں قریب قریب ایک جیسی ہی ہیں، کسی نے "من" کی تفسیر کھانے کی چیز سے کی ہے، کسی نے "من" کی تفسیر پینے کی چیز سے کی ہے، بہر حال کھانے کی چیز ہو یا پینے کی چیز ہو، یہ سب اللہ تعالیٰ کے احسانات تھے جو ان پر ہوئے تھے، اگر "من" کو تنہا کھایا جاتا تو وہ صرف کھانے کی میٹھی چیز تھی، اگر اسے پانی کے ساتھ ملایا جاتا تو وہ پینے کی لذت دار چیز تھی، اگر کسی اور چیز کے ساتھ اسے ملایا جاتا تو وہ کچھ اور چیز بن جایا کرتی تھی۔ لیکن یہاں "من" سے مراد یہی "من" مشہور نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۶۸)

صحیح بخاری شریف کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ، وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ (بخاری کتاب التفسیر) کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَفِيهَا شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ، وَالْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ عجوہ جو مدینہ کی کھجوروں کی ایک قسم ہے وہ جنتی چیز ہے اور اس میں زہر کا تریاق ہے اور کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے درد کی دوا ہے۔ (ترمذی)

ابن مردویہ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس درخت کے بارے میں اختلاف کیا، جو زمین کے اوپر ہوتا ہے، جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ الْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْأَرْضِ، فَقَالَ نَبِيُّ

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ، وَمَاؤُھَا شِفَاءٌ لِلْعَیْنِ، وَالْعَجْوَۃُ مِنَ الْجَنَّۃِ وَھِیَ شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ بعض کہنے لگے کھمبی زمین کا درخت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کھمبی تو "من" میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے اور عجوہ جنت میں سے ہے اور یہ زہر کا تریاق ہے۔

حضرت سدّی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَمَّا دَخَلَ بَنُو إِسْرَائِیلَ التِّیہَ، قَالُوا لِمُوسَی، عَلَیْہِ السَّلَامُ: کَیْفَ لَنَا بِمَا ھاھنا؟ أین الطَّعَامُ؟ فَأَنزَلَ اللّٰہُ عَلَیھِمُ الْمَنَّ فَکَانَ یَسْقُطُ عَلَی الشَّجَرِ الزَّنْجَبِیلِ، جب بنی اسرائیل میدان تیہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم یہاں کیسے گزارہ کریں گے؟ کھانا کہاں ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر "من" اتارا، یہ "من" سونٹھ (ادرک) ہوتی تھی جو درختوں پر اترتی تھی۔

سلویٰ کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ السَّلْوَی طَائِرٌ شَبِیہٌ بِالسُّمَّانِی، کَانُوا یَأْکُلُونَ مِنْہُ سلویٰ ایک پرندہ ہے جو سمانی (بٹیر) کی طرح ہوتا ہے، جسے وہ لوگ کھایا کرتے تھے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی سلویٰ سے مراد بٹیر ہی لیتے تھے۔ (ابن کثیر) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ أَمَّا السَّلْوَی فَطَیْرٌ کَطَیْرٍ یَکُونُ بِالْجَنَّۃِ أَکْبَرُ مِنَ الْعُصْفُورِ، سلویٰ ایک پرندہ کی طرح کا پرندہ ہے جو جنت میں ہوگا،، یہ جسامت میں چڑیا سے بڑا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ السَّلْوَی مِنْ طَیْرٍ إِلَی الْحُمْرَۃِ، تحشُرھا عَلَیْھِمُ الریحُ الجنوبُ. وَکَانَ الرَّجُلُ یَذْبَحُ مِنْھَا قَدْرَ مَا یَکْفِیہِ یَوْمَہُ ذَلِکَ، فَإِذَا تَعَدَّی فَسَدَ وَلَمْ یَبْقَ عِنْدَہُ، حَتَّی إِذَا کَانَ یَوْمُ سَادِسِہِ لِیَوْمِ جُمُعَتِہِ أَخَذَ مَا یَکْفِیہِ لِیَوْمِ سَادِسِہِ وَیَوْمِ سَابِعِہِ؛ لِأَنَّہُ کَانَ یَوْمَ عِبَادَۃٍ لَا یَشْخَصُ فِیہِ لِشَیْءٍ وَلَا یَطْلُبُہُ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۷۱) سلویٰ ایک قسم کا پرندہ ہے، چڑیا سے کچھ بڑا ہوتا ہے، سرخی مائل رنگ کا، جنوبی ہوائیں چلتی تھیں اور ان پرندوں کو وہاں لا کر جمع کر دیتی تھیں، بنی اسرائیل اپنی ضرورت کے مطابق انہیں پکڑ لیتے تھے اور ذبح کر کے کھاتے تھے، اگر ایک دن گزر کر بچ جاتا تو وہ بگڑ جاتا تھا اور جمعہ کے دن دو دن کے لئے جمع کر لیتے تھے کیونکہ

ہفتہ کا دن ان کے لئے عید کا دن ہوتا تھا، اس دن عبادتوں میں مشغول رہنے اور شکار وغیرہ سے بچنے کا حکم تھا۔

حضرت وہب بن منبہ یمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ السَّلْوَى: طَيْرٌ سَمِينٌ مِثْلُ الْحَمَامِ، كَانَ يَأْتِيهِمْ فَيَأْخُذُونَ مِنْهُ مِنْ سَبْتٍ إِلَى سَبْتٍ سلویٰ ایک موٹا پرندہ ہوتا تھا کبوتر کی طرح کا، جو ان کے پاس آجاتا تھا جسے وہ پکڑ لیتے تھے ایک ہفتے سے دوسرے ہفتے تک۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ ہی سے ایک اور روایت یوں ہے کہ سَأَلَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ، اللَّحْمَ، فَقَالَ اللَّهُ: لَأُطْعِمَنَّهُمْ مِنْ أَقَلِّ لَحْمٍ يُعْلَمُ فِي الْأَرْضِ، فَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ رِيحًا، فَأَذْرَتْ عِنْدَ مَسَاكِنِهِمُ السَّلْوَى، وَهُوَ السُّمَانَى مِثْلَ مِيلٍ فِي مِيلٍ قِيدَ رُمْحٍ إِلَى السَّمَاءِ فَخَبَّؤُوا لِلْغَدِ فَنَتَنَ اللَّحْمُ وَخَنِزَ الْخُبْزُ

بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے گوشت مانگا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں انہیں ایسا گوشت کھلاؤں گا جس کا روئے زمین پر کسی کو پتا نہ ہوگا، پھر اللہ نے ان لوگوں پر ایک ہوا بھیجی، جس نے ان کے ٹھکانوں کے قریب سلویٰ پھینکا، یہ سلویٰ بٹیر تھے، جو ایک میل کی لمبائی چوڑائی میں ایک نیزے کے برابر اونچا ڈھیر ان پرندوں کا ہو جاتا تھا، وہ لوگ اسے اگلے دن کے لیے رکھ دیتے تھے جس سے وہ خراب ہو جاتا تھا اور روٹی گل سڑ جاتی تھی (ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ وَالسَّلْوَى وَهُوَ طَائِرٌ يُشْبِهُ السُّمَانَى أَكْبَرُ مِنْهُ، فَكَانَ يَأْتِي أَحَدُهُمْ فَيَنْظُرُ إِلَى الطَّيْرِ، فَإِنْ كَانَ سَمِينًا ذَبَحَهُ وَإِلَّا أَرْسَلَهُ، فَإِذَا سَمِنَ أَتَاهُ، فَقَالُوا: هَذَا الطَّعَامُ فَأَيْنَ الشَّرَابُ؟ فَأُمِرَ مُوسَى فَضَرَبَ بِعَصَاهُ الْحَجَرَ، فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا، فَشَرِبَ كُلُّ سِبْطٍ مِنْ عَيْنٍ، فَقَالُوا: هَذَا الشَّرَابُ، فَأَيْنَ الظِّلُّ؟ فَظَلَّلَ عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ. فَقَالُوا: هَذَا الظِّلُّ، فَأَيْنَ اللِّبَاسُ؟ فَكَانَتْ ثِيَابُهُمْ تَطُولُ مَعَهُمْ كَمَا يَطُولُ الصِّبْيَانُ، وَلَا يَنْخَرِقُ لَهُمْ ثَوْبٌ، فَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى: {وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى}

سلویٰ بٹیر کے ساتھ ملتا جلتا بلکہ اس سے بڑا ایک پرندہ تھا، ان بنی اسرائیل میں سے کسی کے پاس جب یہ بٹیر آتا تو وہ اس کی طرف دیکھتا تھا، اگر وہ پرندہ موٹا ہوتا تو وہ اسے ذبح کر لیتا تھا، ورنہ اسے چھوڑ دیتا تھا، پھر وہ پرندہ موٹا ہونے کے بعد اس کے پاس آجاتا تھا، ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو کھانے کی چیز ہے، پینے کی چیز کہاں؟ تو پروردگار عالم نے فرمایا کہ "اس پتھر پر اپنا عصا مارو" عصا لگتے ہی اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے، ہر قبیلہ نے ایک ایک چشمہ اپنے لئے بانٹ لیا، پھر سایہ کے طالب ہوئے کہ اس چٹیل میدان میں سایہ بغیر گزر مشکل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کا ان پر سایہ کر دیا، رہ گیا لباس تو قدرت الٰہی سے جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے وہ ان کے قد کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا رہتا تھا، ایک سال کے بچہ کا لباس جوں جوں اس کا قد بڑھتا تھا، لباس بھی بڑھتا جاتا، نہ پھٹتا نہ خراب ہوتا نہ میلا ہوتا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من وسلویٰ نازل فرما دیا ،یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے، بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے اسی کو من کہا گیا ہے اور بٹیریں ان کے پاس جمع ہو جاتیں، ان سے بھاگتی نہ تھیں، یہ ان کو پکڑ لیتے اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلویٰ کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے قرار دی گئیں۔ (تفسیر بیان القرآن)

ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فَكَانَ الرَّجُلُ إِذَا أَخَذَ مِنَ الْمَنِّ وَالسَّلْوَى فَوْقَ طَعَامِ يَوْمٍ فَسَدَ، إِلَّا أَنَّهُمْ كَانُوا يَأْخُذُونَ فِي يَوْمِ الْجُمُعَةِ طَعَامَ يَوْمِ السَّبْتِ فَلَا يُصْبِحُ فَاسِدًا جب کوئی شخص من وسلویٰ ایک دن سے زیادہ حاصل کرتا تو وہ خراب ہو جاتا تھا، مگر جمعہ کے دن جب وہ جمعہ اور ہفتہ دو دن کا من وسلویٰ لیتا تو وہ خراب نہیں ہوتا تھا۔

یہود کی حکم عدولی پر آسمانی عذاب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ (۵۸) فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۵۹) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ اور (بستی کے) دروازے میں جھکے سروں سے داخل ہونا اور یہ کہتے جانا کہ (یا اللہ) ہم آپ کی بخشش کے طلب گار ہیں (اس طرح) ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ (ثواب) بھی دیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ جو بات ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر ایک اور بات بنالی نتیجہ یہ کہ جو نافرمانیاں وہ کرتے آرہے تھے ہم نے ان کی سزا میں ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے آئے اور انہیں ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم ہوا جو ان کی موروثی زمین تھی ان سے کہا گیا کہ یہاں جو عمالیق ہیں ان سے جہاد کرو تو ان لوگوں نے نامردی دکھائی جس کی سزا میں انہیں میدان تیہ میں ڈال دیا گیا، یہاں جس قریہ کا ذکر ہے اس سے مراد بیت المقدس ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اس پاک زمین میں جاؤ جو تمہارے لئے لکھ دی گئی ہے بعض کہتے ہیں اس سے مراد اریحاء ہے بعض نے کہا ہے مصر مراد ہے لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے کہ مراد اس سے بیت المقدس ہے، ابن عباس بھی یہی کہتے ہیں۔ (ابن کثیر)

یہ واقعہ میدان تیہ سے نکلنے کے چالیس سال بعد کا ہے، جب یہ لوگ یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت

میں آگے بڑھ رہے تھے، جمعہ کے دن شام کو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر فتح عطا کی بلکہ سورج کو ان کے لئے ذرا سی دیر ٹھہرا دیا تھا تاکہ فتح ہو جائے فتح کے بعد انہیں حکم ہوا کہ اس شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں۔ جو اس فتح کے اظہار تشکر کا مظہر ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سجدے سے مراد رکوع لیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ سجدے سے مراد یہاں پر خشوع خضوع ہے کیونکہ حقیقت پر اسے محمول کرنا ناممکن ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہ دروازہ قبلہ کی جانب تھا اس کا نام باب الحطہ تھا، علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ دروازے سے مراد جہت قبلہ ہے۔ بجائے سجدے کے اس قوم نے اپنی رانوں پر گھسٹنا شروع کیا اور کروٹ کے بل داخل ہونے لگے سروں کو جھکانے کے بجائے اور اونچا کر لیا حطۃ کے معنی بخشش کے ہیں۔ (ابن کثیر)

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اس سے مراد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہنا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں ان میں گناہوں کا اقرار ہے حسنؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں اللہ ہماری خطاؤں کو ہم سے دور کر دے۔ پھر ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر تم اسی طرح یہی کہتے ہوئے شہر میں جاؤ گے اور اس فتح کے وقت بھی اپنی پستی اور اللہ کی نعمت اور اپنے گناہوں کا اقرار کرو گے اور مجھ سے بخشش مانگو تو چونکہ یہ چیزیں مجھے بہت ہی پسند ہیں میں تمہاری خطاؤں سے درگزر کر لوں گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ : بنی اسرائیل کو حکم کیا گیا کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے اور حطۃ کہتے ہوئے دروازے میں داخل ہوں لیکن انہوں نے بدل دیا اور اپنی رانوں پر گھسٹتے ہوئے اور حطۃ کے بجائے حِنطَةٌ فِي شَعرَةٍ کہتے ہوئے جانے لگے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حِطَّةٌ کے بدلے انہوں نے حِنْطَةٌ حَمْرَاءُ فِيهَا شُعَيْرَةٌ سَوْدَاء کہا تھا ان کی اپنی زبان میں ان کے الفاظ یہ تھے هطا سمعاتا أزبة مزبا عربی زبان میں اس کا معنیٰ ہے سرخ گندم کے دانوں میں کالی گندم کے پروئے ہوئے دانے، اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ان الفاظ کو دوسرے الفاظ میں بدل دیا تھا جو انہیں کہے گئے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی

ان کی اس لفظی تبدیلی کو بیان فرماتے ہیں کہ رکوع کرنے کے بدلے وہ رانوں پر گھسٹتے ہوئے اور حطۃ کے بدلے حنطۃ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ بنی اسرائیل کو جس بات کا حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس پر عمل کرنے کی بجائے اس کا مزاح کیا، تمسخر اڑایا، جو صریح مخالفت اور معاندت تھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا۔

فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ظالموں پر ان کے فسق کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل فرمایا۔ رجز سے مراد عذاب ہے، کوئی کہتا ہے غضب ہے، کسی نے طاعون کہا ہے، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ الطَّاعُونُ رِجْزٌ عَذَابٌ عُذِّبَ بِهِ من كانَ قَبْلَكُمْ طاعون رجز ہے اور یہ عذاب تم سے اگلے لوگوں پر اتارا گیا تھا۔ (نسائی)۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ إِنَّ هَذَا الْوَجَعَ وَالسَّقَمَ رِجْزٌ عُذِّبَ بِهِ بَعْضُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ یہ دکھ اور بیماری رجز ہے تم سے پہلے لوگ انہی سے عذاب دیئے گئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ: يَفْسُقُونَ یہ فِسقٌ سے ہے، عربی زبان میں جب کھجور اپنی گھٹلی سے نکلے تو اس وقت فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ بولتے ہیں، شریعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے معصیت کی طرف نکلنے کو فسق کہا جاتا ہے، شیخ ابو مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں فسق وہ ظلم ہے جس کا تذکرہ عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا میں ہے (تفسیر الکبیر للرازی) ان نافرمانوں پر عذاب اتارنے کی وجہ یہاں بیان کر دی گئی ہے کہ یہ فاسق تھے۔

میدان تیہ میں پتھر سے پانی کے چشمے اُبل پڑے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِذِ اسْتَسْقَى مُوسَى لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۶۰)

(البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، چنانچہ اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر ایک قبیلے نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کرلی، ہم نے کہا اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرنا۔

یہ بھی میدان تیہ کا قصہ ہے۔ اس میدان میں جب بنی اسرائیل کو پیاس لگی اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا سوال کیا، جب موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں پانی کی درخواست کی تو اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لاٹھی کا پتھر پر مارنا تھا کہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اس عصا کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ عام درخت کی لاٹھی تھی، ایک قول یہ ہے کہ یہ جنتی آبنوس سے تھا، اس کی لمبائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر دس ہاتھ تھی، اس لاٹھی کی دو شاخیں تھیں جو اندھیرے میں روشن ہو جاتی تھیں، اسی لاٹھی سے موسیٰ علیہ السلام ٹیک لگاتے تھے، یہی لاٹھی بہت بڑا اژدھا بن جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس پتھر میں لاٹھی مارنے سے چشمے جاری ہوئے تھے یہ ایک ہلکا سا پتھر تھا جو چوکور تھا، سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں رہتا تھا، جب پانی کی حاجت ہوتی تو اسے زمین پر رکھ کر لاٹھی مار دیتے تھے جس سے چشمے جاری ہو جاتے تھے۔ (معالم التنزیل)

جب بنی اسرائیل پانی سے سیراب ہو جاتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو اٹھا کر تھیلے میں رکھ لیتے تھے اور جب پانی پینا چاہتے تھے تو پھر اس میں لاٹھی مار دیتے تھے، جس سے پانی نکلتا، روزانہ چھ لاکھ آدمی اس سے سیراب ہوتے تھے، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلے کے لیے پتھر سے چشمہ پھوٹتا تھا اور ہر قبیلہ اپنے چشمے سے سیراب ہوتا تھا، اس پتھر کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ کوہ طور کا پتھر تھا، یہ شکل میں مربع تھا، اس کی ہر طرف سے تین چشمے جاری ہوتے جو نہر کی صورت

میں ہر قبیلہ کے پاس جاتے، ان کی تعداد چھ لاکھ اور وسعت جگہ بارہ میل تھی، بعض کہتے ہیں کہ یہ پتھر جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ آیا تھا، وراثتاً منتقل ہوتے ہوتے حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا، وہاں سے موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ وہی پتھر ہے جس پر آپ نے غسل کے وقت کپڑے رکھے تھے، جب کہ مخالفین نے آپ کو نامرد کہا تھا اور یہ پتھر کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا، جبریل علیہ السلام نے اللہ کا حکم سنایا کہ اللہ فرماتے ہیں اس پتھر کو ساتھ رکھ لیں، اس میں میری قدرت اور تمہارا معجزہ ہے، یوں موسیٰ علیہ السلام اسے ہر سفر میں ساتھ رکھتے تھے، امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس پتھر پر اللہ نے لاٹھی مارنے کا حکم دیا تھا وہ کوئی خاص پتھر نہیں تھا اس قول کو امام رازی رحمہ اللہ نے حجت میں اظہر اور قدرت میں زیادہ واضح قرار دیا ہے، اس پتھر پر ضرب لگانے سے پانی جاری ہو جاتا اور ضرب ہی لگانے سے پانی رک جاتا تھا، بنی اسرائیل نے عصاء کے گم ہونے کی صورت میں پریشانی کا اظہار کیا تو انہیں فرمایا گیا کہ اسے زبانی حکم دو گے تو بھی اس سے پانی جاری ہو جائے گا۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ: انہوں نے اپنا گھاٹ اس لیے پہچان لیا کہ ان میں سے ہر ایک کو یہی حکم تھا کہ وہ اپنی معین نہر سے پانی پیئے تاکہ پانی کی ضرورت کے وقت ان میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو جائے، گھاٹ کی نسبت ان کی طرف کی جانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ہر قبیلہ کے لیے ان کی جہت سے نکلنے والے پانی کو مباح فرما دیا تو ان کی ملکیت کی طرح ہو گیا اس لیے ان کی طرف نسبت جائز ہو گئی۔ (تفسیر کبیر)

لق و دق میدان میں اللہ جل شانہ، نے بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من و سلویٰ عطا فرمایا اور ان کے پینے کے لیے پتھر سے چشمے جاری فرمائے یہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل پر بہت بڑا انعام تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت بڑا معجزہ بھی تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد کرنے والے نہ بنو۔

لاَ تَعْثَوْا: عثٰی سے مشتق ہے جو خوب زیادہ بڑا فساد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آپس کا قتل و قتال اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا بہت بڑا فساد ہے، نعمتوں کی ناشکری کرنے سے نعمتوں سے محرومی ہو جاتی ہے، سب کو معلوم ہے کہ نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکری اور نافرمانی شرعاً و عقلاً بہت بڑی جہالت اور باعث ہلاکت ہے۔ (تفسیر بغوی، تفسیر انوار البیان)

یہود کی احسان فراموشی اور اس کی سزا

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (٦١) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے لہذا اپنے پروردگار سے مانگیے کہ وہ ہمارے لئے کچھ وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین اگایا کرتی ہے یعنی زمین کی ترکاریاں، اس کی ککڑیاں، اس کی گندم، اس کی دالیں اور اس کی پیاز۔ موسیٰ نے کہا" جو (غذا) بہتر تھی کیا تم اس کو ایسی چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو جو گھٹیا درجے کی ہیں؟ (خیر!) ایک شہر میں جا اترو۔ تو وہاں تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی جو تم نے مانگی ہیں اور ان (یہودیوں پر ذلت اور بیکسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ بے حد زیادتیاں کرتے تھے۔

جب من وسلوی اُترنے لگا تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنا شروع کر دیا، کہنے لگے اے موسیٰ! علیہ السلام یہ تم نے ہمیں کہاں لاڈالا جہاں من وسلوی کے سوا کچھ بھی میسر نہیں آتا، ہم مصر میں تھے تو ہمیں ہر طرح کی سبزی، ترکاری، گیہوں، پیاز اور مسور کی دال ملا کرتی تھی، اے موسیٰ! علیہ السلام ہم روزانہ ایک ہی جیسا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں اور ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس طرح بات کرنا اور پھر بھونڈے طریقے سے چیز مانگنا اللہ کو پسند نہیں آیا، کیونکہ اگر یہ کہتے کہ اے اللہ آپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ نے ہمیں اس ریگستان میں من وسلوی کی نعمت سے نوازا، آپ کی عنایت ہو گی اگر ہمیں سبزی وترکاریاں بھی عطا فرمادیں، یقیناً اگر شکر کا انداز اختیار کرتے تو ان کو ریگستان میں جہاں اور نعمتیں عطا کی گئی تھیں یہ نعمتیں بھی دے دی جاتیں مگر بنی اسرائیل کا سب سے بڑا عیب ہی یہ تھا کہ وہ ہر بات کو ناشکری کا انداز دے دیا کرتے تھے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ اللہ نے تمہیں ایک اعلیٰ اور بہتر نعمت سے نوازا ہے کیا تم اس کے مقابلے میں معمولی اور گھٹیا چیزوں کا مطالبہ کرتے ہو، کیونکہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے مقابلے میں ہر چیز گھٹیا اور ادنیٰ ہے۔

انہوں نے اصرار کیا تو اللہ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ان سے کہہ دو کہ تم سامنے کی بستی میں جاؤ، جو تم نے مانگا ہے وہ سب کچھ تمہیں ملے گا لیکن اللہ کی نعمتوں کو ٹھکرانے کا انجام یہ ہے کہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لئے ذلت وخواری بھی مسلط کر دی گئی ہے، اب تم جہاں بھی رہو دوسروں کی محتاجی اور ذلت کے ساتھ رہو گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم میں اس طرح کے عیب پیدا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ احکام الٰہی کو نہیں مانتے تھے، اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کو ناحق قتل کرتے، نافرمانی کرتے اور حدود الٰہی سے باہر نکل جایا کرتے تھے ان باتوں کا لازمی اثر یہ ہے کہ اللہ نے ان پر ہمیشہ کی ذلت وخواری مسلط کر دی۔ (بصیرت قرآن)

یہود، نصاریٰ، صابی اور ایمان

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر بیان کریں

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۲) البقرہ

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، اور نصاریٰ، صابئین، ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے سو ان کے لیے اجر ہے، ان کے رب کے پاس اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ رنجیدہ ہوں گے۔

قرآن کریم کا اسلوب نگارش بہت ہی خوبصورت ہے، قرآن کریم جہاں نافرمانوں، ناشکر گزاروں کی کارستانیوں اوران کی سزاؤں کا ذکر کرتا ہے ساتھ ہی اہل ایمان، نیکوکاروں، پرہیز گاروں اوراطاعت شعاروں کا تذکرہ نہ صرف احسن انداز میں کرتا ہے بلکہ ان پر بارگاہ ایزدی سے ہونے والی انعامات واحسانات کی بارشوں کا بھی ذکر کرتا ہے، جیسے اس سے پہلے یہود کی خرمستیوں اور نافرمانیوں، ناسپاسیوں اور ناشکر گزاریوں کا ذکر کیا، ان کو ملنے والی سزا کا ذکر کیا تو یہاں اہل ایمان کا بہترین انداز میں ذکر کیا، ان میں جو لوگ نیک تھے ان کے ثواب کا بیان ہو رہا ہے نبی کی تابعداری کرنے والوں کے لئے یہ بشارت تا قیامت ہے کہ نہ مستقبل کا ڈر نہ یہاں حاصل نہ ہونے والی اشیاء کا افسوس و حسرت ہو گی۔

شان نزول: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے جن ایمان والوں سے ملا تھا ان کی عبادت اور نماز روزے وغیرہ کا ذکر کیا تو یہ آیت اتری (ابن ابی حاتم) ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نمازی روزہ دار ایماندار اور اس بات کے معتقد تھے کہ آپ مبعوث ہونے والے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو اس سے بڑا رنج ہوا وہیں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ واضح رہے کہ یہودیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو توراۃ کو مانتا ہو اور سنت موسیٰ علیہ السلام کا عامل ہو لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آجائیں تو ان کی تابعداری نہ کرے تو پھر بے دین ہو جائے گا اسی طرح نصرانیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو انجیل کو کلام اللہ مانے، شریعت عیسوی پر عمل کرے اور اگر اپنے زمانے میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پالے تو آپ کی تابعداری اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرے اگر اب بھی وہ انجیل کو اور اتباع عیسوی کو نہ چھوڑے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہ کرے تو ہلاک ہو گا۔ (ابن ابی حاتم بحوالہ ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر نبی کا تابعدار اس کا ماننے والا ایماندار اور صالح ہے اور اللہ کے ہاں نجات پانے والا لیکن جب دوسرا نبی آئے اور وہ اس سے انکار کرے تو کافر ہو جائے گا۔ قرآن کی ایک آیت تو یہ جو آپ کے سامنے ہے اور دوسری وہ آیت جس میں بیان ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران :۸۵) یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والا ہو گا، ان دونوں آیتوں میں یہی تطبیق ہے کسی شخص کا کوئی عمل کوئی طریقہ مقبول نہیں تاوقتیکہ وہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نہ ہو مگر یہ اس وقت ہے جب کہ آپ مبعوث ہو کر دنیا میں آگئے آپ سے پہلے جس نبی کا جو زمانہ تھا اور جو لوگ اس زمانہ میں تھے ان کے لئے ان کے زمانے کے نبی کی تابعداری اور اس کی شریعت کی مطابقت شرط ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہود کون ہیں؟ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا سے یہود مراد ہیں۔ هَادَ يَهُوْدُ توبہ کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے چونکہ ان لوگوں نے گائے کے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کی تھی اس لیے ان کو ان لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے، ان کا مشہور نام یہود ہے، جماعت کو یہود اور ایک شخص کو یہودی کہتے ہیں، بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے یہودا کی طرف منسوب ہیں، اس لیے ان کو یہودی کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ لفظ تَهَوُّد سے مشتق ہے جو تحرک یعنی

حرکت کرنے کے معنیٰ میں ہے، چونکہ یہ لوگ تورات شریف پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے اور اس طرح ان کا یہ لقب پڑ گیا۔

نصاریٰ کون ہیں؟: نصاریٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو ماننے کے مدعی ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ نصرت سے مشتق ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ فرمایا تو ان کے حواریین نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کہا جیسا کہ سورۃ صف میں مذکور ہے۔ لفظ نصاریٰ کو جمع نصران کی بھی بتایا گیا ہے، جیسا کہ نشوان کی جمع نشاویٰ اور سکران کی جمع سکاریٰ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک بستی میں سکونت اختیار کی تھی جس کو ناصرہ کہا جاتا تھا اس کی وجہ سے ان کو نصاری کہا گیا۔ بہر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو نصاریٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے مدعی ہیں۔

ان دعویداروں میں وہ بھی تھے جو ان کے واقعی اصلی دین پر تھے اور ان کے دین میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی اور وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ان کا دین بدل دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو بھی معبود ماننے لگے، قرآن مجید نے ان کو کسی جگہ عیسائی نہیں فرمایا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت نہیں کی، مشرک ان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا، قرآن نے ان کے لیے لفظ نصاریٰ استعمال فرمایا ہے۔ (تفسیر انوار البیان، تفسیر ابن کثیر)

صابی کون ہیں؟: یہ صَبَاَ، یَصْبَؤُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ زمانہ نزول قرآن میں اس فرقہ کا وجود تھا۔ ان لوگوں کا دین کیا تھا، اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں، حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجوسیت، یہودیت اور نصرایت کے درمیان تھے، ان کا مستقل کوئی دین نہ تھا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ابن ابی الزناد رحمہ اللہ نے اپنے والد سے نقل کیا کہ یہ وہ لوگ تھے جو عراق کے قریب رہتے تھے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لاتے تھے اور سال بھر میں تیس روزے رکھ لیتے تھے اور یمن کی

طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے تھے۔

عبد الرحمن بن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ لوگ موصل کے جزیرہ میں تھے صرف لاَ اِلٰہَ الاَّ اللّٰہُ کہتے تھے۔ خلیل کا قول ہے کہ ان کا دین نصاریٰ کے دین سے ملتا جلتا تھا۔ ان کا قبلہ جنوبی ہوا کی طرف تھا، یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ لوگ نہ دین یہودیت پر تھے نہ نصرانیت پر نہ مجوسیت پر اور مشرک بھی نہ تھے، یہ فطرت پر باقی تھے, ان کا کوئی طے شدہ دین نہ تھا جس کا اتباع کرتے اور بعض علماء کا قول ہے کہ صابئین وہ لوگ ہیں جن کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ (انوار البیان، ابن کثیر)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حاصل قانون کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے یہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے اور ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اِطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحق اجر و نجات اخروی ہو گا۔ (بیان القرآن۔ انوار البیان)

بنی اسرائیل کا ایمان اور بے ایمانی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (٦٣) ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (٦٤) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے (تورات پر عمل کرنے کا) عہد لیا تھا، اور کوہ طور کو تمہارے اوپر اٹھا کھڑا کیا تھا۔ (کہ) جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اس کو مضبوطی سے تھامو اور

اس میں جو کچھ (لکھا) ہے اس کو یاد رکھو، تاکہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو۔ اس سب کے باوجود تم دوبارہ (راہ راست سے) پھر گئے چنانچہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ضرور سخت نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو جاتے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ اس کے بعض احکام بہت سخت ہیں، اس لئے اس سے بچنے کے بہانے تلاش کرنے شروع کر دئے، پہلے تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود کہے کہ تورات پر عمل کرنا ضروری ہے، مطالبہ اگرچہ نامعقول تھا مگر ان پر حجت تمام کرنے کے لئے ان میں سے ستر آدمی منتخب کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر بھیجے گئے (اعراف، ۷: ۱۵۵) جن کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست تورات پر عمل کا حکم دیا، مگر جب یہ واپس لوٹے تو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے تصدیق تو کی کہ اللہ تعالیٰ نے تورات پر عمل کا حکم دیا ہے۔

لیکن ایک بات اپنی طرف سے بڑھادی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جتنا تم سے ہو سکے اتنا عمل کر لینا، لیکن جو نہ ہو سکے وہ ہم معاف کر دیں گے، چنانچہ تورات کے جس حکم میں بھی انہیں کچھ مشکل نظر آتی وہ یہ بہانہ تراش لیتے کہ یہ حکم بھی اسی چھوٹ میں داخل ہے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے کوہ طور ان کے سروں پر بلند کر دیا کہ تورات کے تمام احکام کو تسلیم کرو، جب انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں پہاڑ ان پر گرا نہ دیا جائے تب ان لوگوں نے تورات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

اس آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے کوہ طور کو ان کے سروں پر بلند کرنے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا ہو، جیسا کہ حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نے متعدد تابعین سے نقل کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ کچھ بھی بعید نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور ایسی صورت پیدا فرمادی گئی ہو کہ ان لوگوں کو ایسا محسوس ہوا ہو کہ پہاڑ ان پر آگرے گا مثلاً کوئی زلزلہ آگیا ہو جس سے انہیں ایسا لگا کہ پہاڑ گرنے والا ہے چنانچہ سورۃ اعراف (آیت ۱۷۱) میں اس واقعے کے بارے میں الفاظ یہ ہیں وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ

ظُلَّةٌ وَظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ اس میں لفظ نَتَق استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی لغت میں زور زور سے ہلانے کے آتے ہی (دیکھئے قاموس اور مفردات القرآن) لہٰذا آیت کا یہ ترجمہ بھی ممکن ہے کہ جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر زور سے اس طرح ہلایا کہ ان کو گمان ہوا کہ وہ ان پر گر پڑے گا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ کسی شخص کو ایمان قبول کرنے پر تو زبردستی مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن جب ایک شخص ایمان لے آئے تو اسے نافرمانی پر سزا بھی دی جا سکتی ہے اور ڈرا دھمکا کر حکم ماننے پر آمادہ بھی کیا جا سکتا ہے بنی اسرائیل چونکہ ایمان پہلے ہی لا چکے تھے اس لئے ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرا کر فرمانبرداری پر آمادہ کیا گیا۔ (توضیح القرآن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین کے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھڑنے کا حکم دیا تو وہ پہاڑ اکھڑ کر ان کے اوپر بادل کی طرح ہو گیا ان کے ٹھہرنے کی جگہ فرسخ دو فرسخ تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تورات قبول کرو ورنہ میں تم پر پہاڑ گرا دوں گا، جب انہوں نے محسوس کیا بھاگنے کی صورت نہیں تو تورات کو قبول کر لیا اور اس طرح سجدہ ریز ہوئے کہ خوف سے پہاڑ کی طرف ہی دیکھ رہے تھے یہی وجہ تھی کہ یہود نصف چہرہ پر سجدہ کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی)

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: پھر تم نے عہد و پیمان سے انحراف اور اعراض کیا، شیخ قفال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بالجملہ یہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے قبولیت تورات اور رفع طور کے بعد تورات کے بہت سے احکام سے اعراض کر لیا، اس میں تحریف کر دی، اس پر عمل چھوڑ دیا، انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا، ان کے ساتھ کفر کرتے ہوئے ان کی نافرمانی کی، ممکن ہے اس میں کچھ چیزیں بعض کے ساتھ مخصوص ہوں، بعض احکام پر پہلے لوگوں نے عمل نہ کیا اور بعض پر بعد والوں نے نہ کیا، وہ مقام تیہ میں دن رات متعدد عجائبات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت، ان پر اعتراضات اور انہیں ہر اذیت دیتے رہے، اپنے ٹھکانے میں اعلانیہ معاصی کا ارتکاب کرتے، حتی کہ ان میں بعض زمین میں دھنس گئے، بعض کو آگ نے جلا کر

راکھ کر دیا، طاعون ان پر مسلط کر دیا گیا یہ تمام تورات کے تراجم میں موجود ہے جس کا یہ اقرار کرتے ہیں، پھر ان کے بعد والوں نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں حتی کہ انہیں بیت المقدس کی تخریب وتباہی سے سزا دی گئی، حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کفر کرتے ہوئے انہیں شہید کرنے پر تل گئے، تو ان میں اگرچہ ان کے اعراض تورات کی تفصیل نہیں لیکن یہ معروف ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ ان کے بڑوں کے عناد کی اطلاع دی ہے، جب ان کا حال اپنے نبی اور ان کی کتاب کے ساتھ یہ ہے تو ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اور آپ کے حق ہونے کا انکار کرنا کوئی عجب نہیں۔ (تفسیر کبیر)

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: یہاں فضل و رحمت سے یا توفیق توبہ مراد ہے یا تاخیر عذاب (مدارک وغیرہ) ایک قول یہ ہے کہ فضل الٰہی اور رحمت حق سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک مراد ہے معنی یہ ہیں کہ اگر تمہیں خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی دولت نہ ملتی اور آپ کی ہدایت نصیب نہ ہوتی تو تمہارا انجام ہلاک وخسران ہوتا۔ (کنز الایمان)

اور یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کا فضل تم پر نہ ہوتا تو تم پر ضرور عذاب الٰہی نازل ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین بنایا ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سراپا جود سے عذاب مؤخر کر دیا گیا اور دھنس جانے اور صورتیں بدل جانے کا عذاب اٹھا لیا گیا۔ (تفسیر مظہری)

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ: یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو تم اب بھی خسارہ اور عذاب میں گرفتار ہوتے جس طرح کہ پہلے اگر اللہ کا حکم قبول نہ کرتے تو پہاڑ سے ہلاک کر ڈالے جاتے۔ (مظہری)

بنی اسرائیل کا ذلیل بندر بننا

سوال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ذلیل بندر کیوں بنایا؟

جواب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي

السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (٦٥) فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ (٦٦) البقرہ

ترجمہ: اور تم اپنے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت (ہفتے والے دن) کے معاملے میں حد سے گزر گئے تھے چنانچہ ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ پھر ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت اور ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنا دیا۔

یہ ایلہ بستی کے باشندے تھے، ان پر ہفتہ کے دن تعظیم ضروری کر دی گئی تھی اس دن کا شکار منع کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلیاں اسی دن بکثرت آیا کرتی تھیں، تو انہوں نے مکاری کی، گڑھے کھود لئے، رسیاں اور کانٹے ڈال دیئے، ہفتہ والے دن وہ آ گئیں، یہاں پھنس گئیں، اتوار کی رات کو جا کر پکڑ لیا، اس جرم پر اللہ نے ان کی شکلیں بدل دیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں صورتیں نہیں بدلی تھیں بلکہ دل مسخ ہو گئے تھے یہ صرف بطور مثال کے ہے جیسے عمل نہ کرنے والے علماء کو گدھوں سے مثال دی ہے، لیکن یہ قول غریب ہے اور عبارت قرآن کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے اس آیت کے بعد پھر سورۃ اعراف کی آیت ۱۶۳ میں واضح طور پر موجود ہے وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (الأعراف) اور ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھئے جو سمندر کے کنارے واقع تھی، وہ لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، ہفتہ کے دن تو مچھلیاں بلند ہو ہو کر پانی پر ظاہر ہوتی تھیں اور ہفتہ کے علاوہ باقی دنوں میں غائب رہتی تھیں، اسی طرح ہم نے انہیں ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔

اور سورۃ المائدہ کی آیت ہے قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ

سَوَاءِ السَّبِيلِ (۶۰)(سورۃ المائدہ) آپ ان سے کہیے: کیا میں تمہیں اللہ کے ہاں انجام کے لحاظ سے اس سے بھی بدتر انجام والے کی خبر نہ دوں؟ وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر اس کا غضب نازل ہوا، پھر ان میں سے بعض کو اس نے بندر اور سُؤر بنا دیا اور جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ یہی لوگ درجہ کے لحاظ سے بدتر اور سیدھی راہ سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔ پر نظر ڈالو

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو ان لوگ بندر بن گئے اور بوڑھے خنزیر بنا دیئے گئے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ تمام مرد اور عورت دُم والے بندر بنا دیئے گئے۔ آسمانی آواز آئی کہ تم سب بندر بن جاؤ چنانچہ سب کے سب بندر بن گئے جو لوگ انہیں اس مکروہ حیلہ سے روکتے تھے وہ اب آئے اور کہنے لگے دیکھو ہم پہلے سے تمہیں منع کرتے تھے؟ تو وہ سر ہلاتے تھے یعنی ہاں۔ (تفسیر علامہ ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں تھوڑی مدت میں وہ سب ہلاک ہو گئے، ان کی نسل آگے نہیں چلی، تین دن سے زیادہ کوئی مسخ شدہ قوم زندہ نہیں رہتی، یہ سب بھی تین دن میں ہی یونہی ناک رگڑتے رگڑتے مر گئے، کھانا پینا اور نسل سب منقطع ہو گئی۔ یہ بندر جو اب ہیں اور جو اس وقت بھی تھے یہ تو جانور ہیں جو اسی طرح پیدا کئے گئے تھے، اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے جس طرح کا چاہے بنا دیتا ہے۔

خَاسِئِينَ: کے معنی ذلیل اور کمینہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ان پر جمعہ کی عزت و ادب کو فرض کیا گیا، لیکن انہوں نے جمعہ کے دن کو پسند نہ کیا اور ہفتہ کا دن رکھا، اس دن کی عظمت کے طور پر ان پر شکار کھیلنا وغیرہ اس دن حرام کر دیا گیا، ادھر اللہ کی آزمائش کی بنا پر ہفتہ والے دن تمام مچھلیاں اوپر آجایا کرتی تھیں اور کودتی اچھلتی رہتی تھیں لیکن باقی دنوں میں کوئی نظر ہی نہیں آتی تھی، ایک مدت تک تو یہ لوگ خاموش رہے اور شکار کرنے سے رکے رہے۔

بعد ازاں ان میں سے ایک شخص نے یہ حیلہ نکالا کہ ہفتہ والے دن مچھلی کو پکڑ لیا اور پھندے میں پھانس کر ڈوری کو کنارے پر کسی چیز سے باندھ دیا، اتوار والے دن جا کر نکال لایا اور پکا کر کھائی، لوگوں نے خوشبو پا کر پوچھا، تو اس نے کہا میں نے تو آج اتوار کو شکار کیا ہے آخر یہ راز کھلا تو اور لوگوں نے بھی اس حیلہ کو پسند کیا اور اس طرح وہ سب مچھلیوں کا شکار کرنے لگے پھر تو بعض نے دریا کے آس پاس گڑھے کھود لئے، ہفتہ والے دن جب مچھلیاں اس میں آجاتیں تو اسے بند کر دیتے اور اتوار والے دن پکڑ لاتے کچھ لوگ جو ان میں نیک دل اور سچے مسلمان تھے وہ انہیں روکتے اور منع کرتے رہے.

لیکن ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم ہفتہ کو شکار ہی نہیں کھیلتے، ہم تو اتوار والے دن پکڑتے ہیں، ان شکار کھیلنے والوں اور ان کو منع کرنے والوں کے سوا ایک گروہ ان میں اور بھی تھا، جو مصلحت وقت برتنے والا اور دونوں فرقوں کو راضی رکھنے والا وہ تو پورا ساتھ دیتا تھا، ان کا نہ شکار کھیلتے تھے نہ شکاریوں کو روکتے تھے بلکہ روکنے والوں سے کہتے تھے کہ اس قوم کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو؟ جنہیں اللہ ہلاک کرے گا یا سخت عذاب کرے گا؟ اور تم اپنا فرض بھی ادا کر چکے انہیں منع کر چکے، جب نہیں مانتے تو اب انہیں چھوڑو، یہ جواب دیتے کہ ایک تو اللہ کے ہاں ہم معذور ہو جائیں اس لئے اور دوسرے اس لئے بھی کہ شاید آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں یہ مان جائیں اور عذاب اللہ سے نجات پائیں، بالآخر اس مسلم جماعت نے اس حیلہ جُو فرقہ کا بالکل بائیکاٹ کر دیا اور ان سے بالکل الگ ہو گئے۔

بستی کے درمیان ایک دیوار کھینچ لی اور دروازہ اپنے آنے جانے کا رکھا اور ایک دروازہ ان حیلہ جُو نافرمانوں کے لئے، اس پر بھی ایک مدت اسی طرح گزر گئی، ایک دن صبح مسلمان جاگے، دن چڑھ گیا لیکن اب تک ان لوگوں نے اپنا دروازہ نہیں کھولا تھا اور نہ ان کی آوازیں آرہی تھیں، یہ لوگ حیران تھے کہ آج کیا بات ہے؟ آخر جب زیادہ دیر لگ گئی تو ان لوگوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا، تو وہاں عجب منظر نظر آیا، دیکھا کہ وہ تمام لوگ مع عورتوں بچوں کے بندر بن گئے ہیں، ان کے گھر جو راتوں

کو بند تھے اسی طرح بند ہیں اور اندر وہ انسان بندر کی صورتوں میں ہیں جن کی دُمیں نکلی ہوئی ہیں، بچے چھوٹے بندروں کی شکل میں، مرد بڑے بندروں کی صورت میں، اور عورتیں بندریا بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک پہچانا جاتا ہے کہ یہ فلاں مرد ہے، یہ فلاں عورت ہے، یہ فلاں بچہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ بھی یاد رہے کہ جب یہ عتاب آیا تو نہ صرف وہی ہلاک ہوئے جو شکار کھیلتے تھے بلکہ ان کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہوئے جو انہیں منع نہ کرتے تھے اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور میل جول ترک نہ کیا تھا، صرف وہ بچے جو انہیں منع کرتے رہے اور ان سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تمام اقوال اور قرآن کریم کی کئی ایک آیتیں وغیرہ شاہد ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ ان کی صورتیں بدل دی گئی تھیں، سچ مچ بندر بنا دیئے گئے نہ یہ کہ معنوی مسخ تھا یعنی ان کے دل بندروں جیسے ہو گئے تھے جیسے کہ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے ٹھیک تفسیر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سؤر اور بندر بنا دیا تھا اور ظاہری صورتیں بھی ان کی ان بد جانوروں جیسی ہو گئی تھیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم

سوال بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم کس آیت میں دیا گیا تھا؟

جواب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی اس آیت میں فرمایا

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ (٦٧) البقرہ) ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے بیشک اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو، وہ کہنے لگے کیا تو ہمارا مذاق بناتا ہے؟ موسیٰ نے کہا کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں (جو مذاق میں جھوٹ بولوں)۔

بقرہ عربی زبان میں گائے اور بیل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی لیے شاید بعض حضرات نے اس کا ترجمہ بیل کیا ہے اور ان کا فرمانا ہے کہ قصہ کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ وہ بقرہ ایسا ہو جو ہل جوتنے میں استعمال نہ کیا ہو اور کھیتی کی آبپاشی میں اس کو نہ لگایا گیا ہو۔ یہ کام چونکہ بیل ہی سے ہوتا ہے اس لیے بقرہ سے بیل مراد لیا ہے، بعض حضرات نے اس کا ترجمہ گائے سے کیا ہے۔ چونکہ بقرہ اسم جنس ہے اس لیے گائے کا ترجمہ کرنے کی بھی گنجائش ہے، صاحب تفسیر انوار البیان نے بقرہ کا معنیٰ بیل لکھنے کے بعد اسی کو وزن دار قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ذبح کی جانے والی گائے کی صفات

سوال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اس کی صفات کیا تھیں؟

جواب وہ گائے بہت زیادہ بوڑھی، بہت زیادہ جوان نہ ہو، خوب زرد ہو جو اسے دیکھے اسے اچھی لگے، وہ کھیتی باڑی کے لئے استعمال نہ ہوئی ہو، کھیتی کو پانی لگانے کے کام میں استعمال نہ کی گئی ہو، عیوب سے صحیح سالم ہو، قرآن میں ہے

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لا فَارِضٌ وَلا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ (٦٨) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ (٦٩) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ (٧٠) قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لا ذَلُولٌ تُثِيرُ الأَرْضَ وَلا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (۷۱) البقرہ

وہ بولے اپنے رب سے ہمارے لئے درخواست کرو کہ ہم کو اچھی طرح سمجھا دے کہ وہ (گائے) کیسی ہو؟ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، (بس) درمیانی عمر کی ہو۔

لہذا جو تم کو حکم دیا گیا ہے (اس کی تعمیل) کرو۔ انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے درخواست کیجیے کہ ہم کو یہ بھی بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا، پروردگار فرماتا ہے کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں (کے دل) کو خوش کر دیتا ہو، انہوں نے کہا، ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر ہمیں بتائے کہ وہ کس قسم کی ہے کیونکہ وہ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور پتہ لگا لیں گے۔ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے محنت کرنے والی نہیں، جو زمین کو جوتتی ہو یا کھیتی کو پانی دیتی ہو، بے عیب ہے، اس میں کوئی داغ نہیں انہوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی، پھر انہوں نے اسے ذبح کر دیا اور وہ کرنے والے تو نہیں تھے۔

چند الفاظ کی وضاحت: فَارِضٌ کا معنیٰ ہے بہت زیادہ بوڑھی، بِكْرٌ کا معنی ہے بہت زیادہ جوان، عَوَانٌ کا معنی ہے ان دونوں صفات کے درمیان والی، یہ مضبوط بھی ہوتی ہے اور بہت زیادہ خوبصورت بھی لگتی ہے، فَاقِعٌ کا معنیٰ ہے بہت زیادہ صاف رنگ والی، زرد رنگ والی، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ فَاقِعٌ بہت زیادہ زرد رنگ کو کہا جاتا ہے جیسے مختلف رنگوں کی تاکید کے لیے مختلف الفاظ ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں جیسے أَصْفَرُ فَاقِعٌ بہت زیادہ زرد رنگ، أَسْوَدُ حَالِكٌ بہت زیادہ سیاہ رنگ، أَبْيَضُ يَقَقٌ بہت زیادہ سفید رنگ، أَحْمَرُ قَانٍ بہت زیادہ سرخ رنگ، أَخْضَرُ نَاضِرٌ، بہت زیادہ سبز رنگ۔ اسی طرح اس گائے کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا رنگ اس طرح کا ہو کہ دیکھنے والے کو خوش کر دے، زرد رنگ اس لیے ذکر کیا گیا تاکہ دیکھنے والے کو ایسا لگے کہ اس کے جسم سے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔

حجت بازی کا انجام: بنی اسرائیل کی سرکشی و سرتابی اور ان کی حجت بازی کا یہاں بیان ہو رہا ہے کہ حکم پاتے ہی انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ شقیں نکالنے اور بار بار سوال کرنے لگے، ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ إِنَّمَا أُمِرُوا بِأَدْنَى بَقَرَةٍ، وَلَكِنَّهُمْ لَمَّا شَدَّدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ شَدَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ؛ وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّهُمْ لَمْ يَسْتَثْنُوا مَا بُيِّنَتْ لَهُمْ آخِرَ الْأَبَدِ

(تفسیر طبری (۲/۲۰۵) انہیں ادنیٰ درجے کی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اپنے اوپر شدت کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کر دی، اللہ کی قسم! اگر وہ انشاء اللہ کے ساتھ استثنانہ کرتے تو وہ سختی ان سے کبھی نہ ٹلتی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل اگر ادنیٰ قسم کی گائے بھی لا کر ذبح کر دیتے تو یہ ان کی طرف سے کافی ہو جاتی۔ (مسند البزار) اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ نے إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً الفاظ استعمال فرمائے ہیں، یہ عموم پر دلالت کرتے ہیں، کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو اس حکم کے عموم پر عمل ہو جاتا، اگر وہ دورانِ گفتگو انشاء اللہ نہ کہتے تو جس طرح کی گائے انہوں نے تلاش کر کے ذبح کی ہے، ایسی گائے انہیں کبھی نہیں مل سکتی تھی، اللہ نے انہیں ادنیٰ سی، عام قسم کی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، مگر انہوں نے اپنے لیے سختی اور شدت کا انتخاب کیا، اپنے لیے مشکل راستے کو چنا، تو اللہ نے ان پر سختی کر دی، ان کی پسند کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا، آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو ان کے لیے جس قسم کی گائے ملی ہے، وہ کبھی نہ مل سکتی۔

زرد رنگ کی گائے اور زرد رنگ کی جوتی: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَنْ لَبِسَ نَعْلًا صَفْرَاءَ لَمْ يَزَلْ فِي سُرُورٍ مَا دَامَ لَابِسَهَا، وَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى: {صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ} تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۹) جو زرد جوتی پہنے وہ ہمیشہ خوش و خرم رہے گا اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وہ خوب زرد رنگ کی ہو، اس کا رنگ دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے کہ الصُّفْرَةُ تَسُرُّ النَّفْسَ. وَحَضَّ عَلَى لِبَاسِ النِّعَالِ الصُّفْرِ (قرطبی ج ۱ ص ۴۵۱) زردی دل کو خوش کرتی ہے اور آپ رضی اللہ عنہ زرد جوتی پہننے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے مَنْ لَبِسَ نَعْلَ جِلْدٍ أَصْفَرَ قَلَّ هَمُّهُ، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُولُ، صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ (تفسیر قرطبی ج ا ص ۴۵۱) جس نے زرد چمڑے کے جوتے پہنے اس کا غم ہلکا ہو گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہو، اس کا رنگ دیکھنے والوں کو اچھا لگتا ہے۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اَنَّ الْخُفَّ الْأَحْمَرَ خُفُّ فِرعَونَ وَالْخُفَّ الْأَبيَضَ خُفُّ وَزِيرِهِ هَامَانَ وَالْخُفَّ الْأَسوَدَ خُفُّ الْعُلَمَاءِ وَرُوِيَ اَنَّ خُفَ النَّبِي عَلَيهِ السَّلَامُ كَانَ اَسوَدُ (ج ا ص ۱۶۰) سرخ رنگ کا جوتا فرعون کا تھا، سفید جوتا اس کے وزیر ھامان کا تھا، کالا جوتا علماء کا ہوتا ہے اور روایت کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا (نعلین مبارک) کالا ہوتا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد سخت سیاہ رنگ ہے، لیکن اول قول ہی صحیح ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ ہم یوں کہیں کہ اس کی شوخی اور چمکیلے پن سے وہ مثل کالے رنگ کے لگتا تھا۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إِذَا نَظَرْتَ إِلَى جِلْدِهَا يُخَيَّلُ إِلَيْكَ أَنَّ شُعَاعَ الشَّمْسِ يَخْرُجُ مِن جِلدِهَا (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۳۰۰) اس کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا گویا سورج کی شعائیں اس سے اٹھ رہی ہیں۔

تورات میں ہے کہ أَنَّهَا كَانَتْ حَمْرَاءَ، فَلَعَلَّ هَذَا خَطَأٌ فِي التَّعْرِيبِ أَوْ كَمَا قَالَ الْأَوَّلُ: إِنَّهَا كَانَتْ شَدِيدَةَ الصُّفْرَةِ تَضْرِبُ إِلَى حُمْرَةٍ وَسَوَادٍ، والله أعلم (تفسیر ابن کثیر ج ا) اس کا رنگ سرخ بیان کیا گیا ہے لیکن شاید عربی کرنے والوں کی غلطی ہے واللہ اعلم چونکہ اس رنگ اور اس عمر کی گائیں بھی انہیں بکثرت نظر آئیں۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ گائے کام کرنے والی نہیں، ہاں کھیتی کا کام کرتی ہے، لیکن پانی نہیں پلاتی، مگر یہ قول غلط ہے اس لئے کہ ذلول کی تفسیر یہ ہے کہ وہ ہل نہیں جوتتی اور نہ پانی پلاتی ہے، اس میں نہ کوئی داغ دھبہ ہے، اب اتنی بڑی کدوکاوش کے بعد بادلِ ناخواستہ وہ اس کی قربانی کی طرف متوجہ ہوئے،

اسی لئے فرمایا کہ یہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے اور ذبح نہ کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے اس لئے کہ انہیں اپنی رسوائی کا خیال تھا کہ نہ جانے کون قاتل ہو؟ بعض کہتے ہیں اس کی قیمت سن کر گھبرا گئے تھے، لیکن بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کل تین دینار اس کی قیمت لگی تھی، لیکن یہ تین دینار والی گائے کے وزن کے برابر سونے والی دونوں روایتیں اسرائیلی روایتیں ہیں، ٹھیک بات یہی ہے کہ ان کا ارادہ حکم کی بجا آوری کا تھا ہی نہیں، لیکن اب اس قدر وضاحت کے بعد اور قتل کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے انہیں یہ حکم ماننا ہی پڑا۔

گائے کا پسِ منظر: بنی اسرائیل میں ایک نوجوان تھا، جو اپنی والدہ کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کرتا تھا، یہ نوجوان تہائی رات کے گزر جانے کے بعد اٹھ جاتا تھا، پھر نماز ادا کرتا تھا، پھر تہائی رات ماں کے سرہانے کے پاس بیٹھا رہتا تھا، اپنی ماں کو تسبیح پڑھنے، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھنے، اللہ اکبر کہنے اور الحمد للہ کہنے کی تلقین کرتا رہتا تھا اور اپنی ماں سے کہتا تھا، اے میری ماں! اگر آپ رات کی عبادت کرنے سے کمزور ہیں تو پھر اللہ کی بڑائی بیان کریں، اللہ کی تسبیح کریں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھیں، اس نوجوان کا یہ عمل مسلسل تھا، جب صبح ہوتی تو یہ نوجوان پہاڑ پر چلا جاتا، جہاں سے وہ لکڑیاں چن کر اپنی پیٹھ پر لادتا، پھر بازار جا کر انہیں بیچتا تھا، جتنا اللہ چاہتا تھا اتنی لکڑیاں بک جاتی تھیں، ان سے جو کچھ اسے ملتا تھا اس میں سے تہائی صدقہ کر دیتا تھا، تہائی اپنی عبادت کے لیے رکھ دیتا تھا اور تہائی اپنی والدہ کو دیتا تھا، اس کی ماں آدھا استعمال کرتی اور آدھا صدقہ کر دیتی تھی، اس کا ہمیشہ یہی عمل ہوتا تھا۔

جب ماں بہت عرصہ تک اس کا یہ عمل دیکھتی رہیں تو ایک دن ماں نے اپنے بیٹے کو کہا: اے میرے پیارے بیٹے! میں نے تیرے باپ سے وراثت میں ایک گائے پائی ہے، میں نے اس گائے کو گردن پر ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رب کے نام کی مہر لگا کر گائیوں میں چھوڑ دیا ہے، میں تجھے بتاتی ہوں کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ اس کی شکل کیسی ہے؟ جب تو اس گائے کے پاس جائے گا تو

تُو اسے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رب کا نام لے کر پکارے گا تو وہ ایسا ہی کرے گی جیسے اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا، اس کی ماں نے کہا، اس گائے کی علامت یہ ہے،

لَيسَت بِهَرمَةٍ وَلَا فُتيَةٍ غَير أَنَّهَا بَينَهُمَا وَهِي صَفرَاءُ فَاقِعٌ لَونُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ إِذَا نَظَرتَ إِلَى جِلدِهَا يخَيَّل إِلَيكَ أَنَّ شُعَاعَ الشَّمسِ يَخرُجُ مِن جِلدِهَا وَلَيسَت بِالذَّلُولِ وَلَا صَعبَةٍ تُثِيرُ الأَرضَ وَلَا تَسقِي الحَرثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا وَلَونُهَا وَاحِدٌ

وہ بوڑھی نہیں ہے، وہ جوان نہیں ہے، وہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہے، وہ گہرے زرد رنگ کی ہے، دیکھنے والوں کو اس کا رنگ اچھا لگتا ہے، جب تو اس کی طرف دیکھے گا تو ایسے لگے گا جیسے اس کی جلد سے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں، وہ ذلول یعنی کھیتی باڑی کرنے والی، مشکل کام کرنے والی یعنی زمین پھاڑے، زمین کو پانی سے سیراب کرے ایسی نہیں ہے، وہ داغ دھبے سے محفوظ ہے، اس کا رنگ ایک ہی ہے۔

جب تو اسے دیکھے تو اسے گردن سے پکڑ لے، وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے معبود کے حکم سے تیری پیروی کرے گی، وہ نوجوان چل پڑا، اپنی ماں کی وصیت کو پلے باندھ لیا، جنگل میں دو دن یا تین دن چلتا رہا، یہاں تک کہ جس صبح اس کی واپسی تھی اس نے گائے کو آواز دی، اس نے کہا، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے خدا کے نام کے ساتھ تو میرے پاس آجا، چنانچہ گائے متوجہ ہوئی اور اس نے چرواہے کو چھوڑ دیا، آکر اس نوجوان کے سامنے کھڑی ہو گئی، اس نے اسے گردن سے پکڑ لیا، گائے نے اس سے بات کی، اور کہا، اے اپنی ماں کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے والے نوجوان! مجھ پر سوار ہو جا، یہ تیرے لیے آسان ہے۔

نوجوان نے کہا: میری والدہ نے تجھ پر سوار ہونے کا نہیں کہا تھا، اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تجھے ہانک کر لاؤں، اس لیے میں اس کی بات کی پیروی کرنا پسند کرتا ہوں۔

گائے نے کہا: یعقوب کے رب کی قسم! اگر تو مجھ پر سوار ہوتا تو تو مجھ پر قدرت نہ پاتا، اے اپنی ماں

کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے والے نوجوان! چلیے، گائے نے ایک جملہ کہا کہ لَوْ أَنَّكَ أَمَرْتَ هَذَا الْجَبَلَ أَنْ يَّنْقَلِعَ لَكَ مِنْ أَصْلِهِ لَانْقَلَعَ لِبِرِّكَ بِوَالِدَتِكَ وَلِطَاعَتِكَ إِلٰهَكَ اگر تو اس پہاڑ کو حکم دیتا کہ وہ تیرے لیے جڑ سے اکھڑ جائے تو تیرا ماں کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے اور اپنے رب کی اطاعت کرنے کی وجہ سے وہ تیرے لیے اکھڑ جاتا۔

چنانچہ وہ نوجوان چل پڑا، جب وہ اپنی منزل سے ایک دن کی مسافت پر تھا تو راستے میں اسے اللہ کا دشمن شیطان مل گیا، شیطان نے اس چرواہے کا روپ دھارا ہوا تھا، جو گائیاں چراتا تھا۔ شیطان نے کہا: اے نوجوان! اس گائے کو کہاں لے کر جارہے ہو؟ اس پر سوار کیوں نہیں ہو جاتے؟ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم تھک چکے ہو، میرا خیال یہ ہے کہ تمہارے پاس اس دنیا میں اس گائے کے علاوہ کوئی مال نہیں ہے، میں تجھے اتنی مزدوری دوں گا جو تجھے نفع دے گی، اس کا تجھے کوئی نقصان نہیں ہو گا، میں ایک چرواہا ہوں، جو گائیاں چراتا ہوں، مجھے اپنے گھر جانے کا شوق ہوا تو میں نے اپنے بیلوں میں سے ایک بیل پر اپنا کھانا، اپنا توشہ لاد لیا تھا، جب آدھا راستہ طے کر لیا تو میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا، میں قضائے حاجت کے لیے گیا، بیل پہاڑی کے درمیان میں پہنچ گیا، اس نے مجھے چھوڑ دیا، میں اسے تلاش کرتا رہا، لیکن میں اس پر قدرت نہ پا سکا، اب مجھے اپنی جان کے چلے جانے کا خطرہ ہے، میرے پاس توشہ نہیں ہے، پانی تک نہیں ہے، اگر آپ مجھے اپنی گائے پر سوار کر لیں جو مجھے میری چراگاہ تک پہنچا دے تو تُو مجھے موت سے نجات دلا دے گا، میں اس کے بدلے میں تجھے دو گائیاں دوں گا۔

نوجوان نے کہا: اگر اللہ کے علم میں ہو کہ تو یقین والا ہے تو وہ تجھے بغیر توشے اور پانی کے تیری منزل پر پہنچا دے، لیکن میں تجھے سوار نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، اس لیے کہ میں تو حکم کا غلام ہوں، اگر میرے سردار کو علم ہو جائے کہ میں نے اس گائے کے معاملے میں اس کی نافرمانی کی ہے تو وہ مجھے ہلاک کر دے اور مجھے سخت سزا دے اس لیے میں تیری خواہش کو اپنے سردار کی خواہش پر ترجیح نہیں دے سکتا، اس لیے اے آدمی! تو سلامتی کے ساتھ روانہ ہو جا۔

شیطان نے اسے کہا: میں ہر اس قدم کے بدلے میں جو تو میرے گھر کی طرف لے چلے گا ایک درھم دوں گا، یہ بہت بڑا مال ہے اور تو میری موت کے عوض اس گائے کا فدیہ دے گا۔

نوجوان نے کہا: میرا سردار ایسا ہے جس کے پاس زمین کا سونا اور چاندی ہے، اگر تو مجھے کچھ دینا چاہتا ہے تو اسے پتا چل جائے گا کہ یہ تو تُو نے اس کے مال میں سے دیا ہے، اس لیے تو مجھے آسمان کے سونے اور چاندی میں سے دے تاکہ میں اسے کہہ سکوں کہ یہ تیرے مال میں سے نہیں ہے۔

شیطان نے کہا: کیا آسمان میں سونا چاندی ہوتا ہے؟ یا کوئی اس پر قدرت رکھتا ہے؟

نوجوان نے کہا: تو کیا بندہ وہ کر سکتا ہے جس کا اسے اس کے آقا نے حکم نہ دیا ہو؟ جس طرح تو آسمان کے سونے چاندی پر قدرت نہیں رکھتا ہے، اسی طرح میں بھی تجھے اپنی گائے پر سوار نہیں کر سکتا ہوں۔

شیطان نے کہا: مجھے یوں لگ رہا ہے کہ تو اپنے معاملے میں سب سے زیادہ عاجز غلام ہے۔

نوجوان نے کہا: عاجز تو وہ ہوتا ہے جو اپنے رب کی نافرمانی کرے۔

شیطان نے کہا: کیا وجہ ہے کہ میں آپ کے پاس توشہ اور مال نہیں دیکھ رہا؟

نوجوان نے کہا: میرا توشہ تقویٰ ہے، خشک گھاس میرا کھانا ہے، پہاڑی چشموں سے پانی پیتا ہوں۔

شیطان نے کہا: کیا میں تجھے ایسا کام نہ بتاؤں جو تیری راہنمائی کرے؟

نوجوان نے کہا: اپنے آپ کو ہی حکم دو، میں تو اگر اللہ چاہے ہدایت پر ہی ہوں۔

شیطان نے کہا: آپ نصیحت قبول کیوں نہیں کر رہے؟

نوجوان نے کہا: نصیحت وہ شخص کرتا ہے جو اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے، جو حق اس کے ذمہ ہوتا ہے وہ اسے ادا کرتا ہے، اگر تو شیطان ہے تو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں، اگر تو کوئی آدمی ہے تو چلا جا مجھے تیری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

نوجوان کی یہ گفتگو سن کر شیطان تین گھنٹے تک اسی جگہ پر جم گیا، یہ نوجوان ابھی ادھر ہی کھڑا

تھا کہ اس کے سامنے ایک پرندہ اڑتے ہوئے آموجود ہوا، جس نے اس نوجوان سے گائے کو چھیننا چاہا، نوجوان نے گائے کو آواز دی اور کہا کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے معبود کے نام کے ساتھ تجھے میں کہتا ہوں کہ میری طرف آجا، چنانچہ گائے اس کی طرف آگئی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

گائے نے کہا: اے نوجوان! کیا تو نے اس پرندے کی طرف دیکھا ہے جو اڑتا ہوا تیرے سامنے آیا؟ وہ اللہ کا دشمن شیطان تھا، جو مجھے چھیننا چاہتا تھا، جب تو نے مجھے یعقوب کے معبود کے نام سے پکارا تو فرشتوں میں سے ایک فرشتہ آگیا، جس نے مجھے اس سے چھین کر تیری طرف لوٹایا، یہ اس لیے ہوا کہ تو اپنی والدہ کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہے اور اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے، اب تو چل میں اب اس وقت تک تیرے سے جدا نہیں ہوں گی جب تک کہ تو اپنے گھر نہ پہنچ جائے، انشاء اللہ، یہ نوجوان اپنی ماں کے پاس گیا، اسے یہ سارا واقعہ بتایا۔

والدہ نے کہا: اے میرے بیٹے! میں تجھے دیکھ رہی ہوں کہ تو اپنی پیٹھ پر دن رات لکڑیاں اٹھاتا ہے، جا اور جا کر اس گائے کو بیچ دے، اس کی قیمت لے لے اور اپنے کو مضبوط کرلے۔

نوجوان نے کہا: میں اسے کتنے میں بیچوں؟

والدہ نے کہا: میری خوشی سے اسے تین دیناروں میں بیچ دے۔

چنانچہ نوجوان بازار کی طرف روانہ ہوگیا، پھر اللہ نے اس کی طرف فرشتوں میں سے ایک فرشتہ بھیجا، تاکہ وہ اپنی مخلوق کو اپنی قدرت دکھائے۔

فرشتہ نے نوجوان سے کہا: اے نوجوان! یہ گائے کتنے میں بیچے گا؟

نوجوان نے کہا: میں اپنی والدہ کی رضامندی سے اسے تین دینار میں بیچوں گا۔

فرشتہ نے کہا: تو اسے چھ دینار میں بیچ دے، والدہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوجوان نے کہا: اگر تو مجھے اس کے وزن کے برابر بھی دینار دے دے تو میں اپنی والدہ کی اجازت کے

بغیر نہیں بیچوں گا، چنانچہ نوجوان نکلا اور اس بات کے بارے میں اپنی والدہ کو بتایا۔

والدہ نے کہا: میری رضامندی سے اسے چھ دینار میں ہی بیچ دو، چنانچہ نوجوان چلا گیا اور فرشتے کے پاس آیا۔

فرشتہ نے پوچھا: تو نے کیا کیا؟

نوجوان نے کہا: میں اپنی والدہ کی رضامندی سے اسے چھ دینار میں بیچوں گا۔

فرشتہ نے کہا: بارہ دینار لے لے، لیکن والدہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوجوان نے کہا: ایسا نہیں ہو گا۔ چنانچہ نوجوان اپنی والدہ کی طرف چلا گیا۔

والدہ نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! وہ شخص جو تیرے پاس آیا ہے وہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو انسانی صورت میں تیرے پاس آیا ہے، جب وہ تیرے پاس آئے تو تُو اسے کہہ کہ میری والدہ تجھے سلام کہتی ہیں، اور یوں کہتی ہیں کہ تم مجھے کیا کہتے ہو کہ میں یہ گائے کتنے کی بیچوں؟

فرشتہ نے اسے کہا: اے نوجوان! تیری اس گائے کو موسیٰ بن عمران خریدے گا، اس مقتول کی خاطر جو بنی اسرائیل میں قتل کیا جائے گا، وہ بہت مالدار آدمی تھا، اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کے چچا کے بہت زیادہ بیٹے تھے، وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان کو کیسے قتل کریں اور اس کا مال وغیرہ لے لیں، چنانچہ انہوں نے اس لڑکے کو اپنے گھر بلایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات گراں گزری تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ ایک گہرے زرد رنگ کی گائے لے لیں، اسے ذبح کریں پھر اس لڑکے کو اس کا ایک ٹکڑا ماریں، چنانچہ انہوں نے اس نوجوان کی گائے کا رخ کیا، انہوں نے اس گائے کو اس نوجوان سے اس شرط پر خریدا کہ وہ لوگ اس کے چمڑے کو دیناروں سے بھر دیں گے، پھر اسے ذبح کریں گے، پھر اسے مقتول لڑکے کو لگائیں گے، چنانچہ وہ اٹھ کھڑا ہوا جس نے اٹھتے ہی کہا کہ مجھے میرے چچا زاد بھائیوں نے مارا ہے، باقی لوگ میرے قتل سے بری ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے

انہیں پکڑا۔

نوجوانوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے؟ کہ ہم نے اپنے چچا کے بیٹے کو ظلماً مارا ہے، انہیں علم تھا کہ وہ رسوا ہو جائیں گے، اس لیے انہوں نے اس گائے کے چمڑے کو دیناروں کے ساتھ بھر دیا، پھر اس نوجوان کے حوالے کر دیا، اس نوجوان نے ان دیناروں کا دو تہائی بنی اسرائیل کے فقیروں پر تقسیم کر دیا اور تہائی کے ساتھ اپنے کو مضبوط کیا۔ (روح البیان)

چنانچہ بنی اسرائیل کو چالیس سال کی تلاش کے بعد ان صفات کی حامل گائے مل ہی گئی، انہوں نے اسے ذبح کیا اور مقتول کے جسم کے ساتھ لگایا تو میت بول پڑی کہ مجھے کس نے مارا، یوں بنی اسرائیل کے اندر اٹھنے والا ایک بہت بڑا طوفان تھم گیا۔

فائدہ: اس واقعہ سے کئی مسئلے معلوم ہوئے۔

① جو اپنے عیال کو اللہ کے سپرد کرے اللہ تعالیٰ اس کی ایسی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔

② جو اپنا مال اللہ کے بھروسہ پر اس کی امانت میں دے اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔

③ والدین کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

④ غیبی فیض قربانی و خیرات کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

⑤ راہ خدا میں نفیس مال دینا چاہیے۔

⑥ گائے کی قربانی افضل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ گائے ذبح کرنے کے بعد اس کا کون سا حصہ مردے کو مارا گیا تھا، حضرت ضحاک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو زبان کاٹ کر ماری گئی تھی۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گائے کی دائیں ران کاٹ کر مردے کو ماری گئی تھی۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گائے کی دُم کاٹ کر مردے کو ماری گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کان کی جڑوں کی نرم ہڈی میت کو ماری گئی۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گائے کے شانوں کے درمیان سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میت

کو مارا گیا تھا۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس گائے کی ہڈی اس میت کو ماری گئی تھی۔ جب اس مردے کو یہ ہڈی یا گوشت کا ٹکڑا مارا گیا تو اللہ نے اس کی روح لوٹا دی، پھر وہ بول پڑا، اس نے بتایا کہ فلاں شخص نے قتل کیا ہے، اس سے زیادہ اس نے کوئی گفتگو نہیں کی، اس کے بعد وہ پھر مر گیا۔ (در منثور ج ۱)

قتل ہونے والا کون تھا؟ قتل ہونے والا کون تھا؟ اس بارے میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ یہ عامیل بن شراحیل تھا، بعض مفسرین نے اس کا نام قیل کے ساتھ نکار لکھا ہے، اس کو قتل کرنے والے کون تھے؟ اس بارے میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسے مارنے والا بھتیجا تھا، بعض کہتے ہیں کہ اسے مارنے والے چچازاد بھائی تھے، تفسیر بحر العلوم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ بنی اسرائیل کو تورات میں یہ کہا گیا تھا کہ جو شخص دو بستیوں کے درمیان مقتول پایا جائے جس کے قاتل کا پتا نہ چل رہا ہو تو اسے ان دونوں میں جو سب سے زیادہ قریب ہے اس پر قیاس کرنا چاہیے، چنانچہ بنی اسرائیل کے دو بھائیوں نے اپنے چچازاد بھائی کا ارادہ کیا، جس کا نام عامیل تھا، اسے انہوں نے قتل کر ڈالا، تاکہ اس کی وراثت پائیں، ان دونوں بھائیوں کے چچا کی بیٹی بہت ہی خوبصورت تھی، جوان تھی، ان دونوں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ عامیل اس کے ساتھ شادی کر لے گا، پھر اسے اٹھا کر بستی کی ایک طرف لے گئے، جب بستی کے لوگ صبح اٹھے تو مقتول ان کے سامنے تھا، بستی والے مقتول کو اٹھا کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس لائے۔ (بحر العلوم ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ ج ۱)

پھر ارباب تفسیر کا کہنا ہے کہ قاتل اور سبب قتل میں اختلاف ہے، حضرت عطاء رحمۃ اللہ اور سدی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بہت ہی مالدار شخص تھا اور اس کا ایک چچازاد بھائی تھا، جو مسکین تھا، اس کے علاوہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا، جب چچازاد کی عمر کافی ہو گئی تو اس مسکین نے وراثت پانے کے لیے اسے قتل کر ڈالا، بعض یوں کہتے ہیں کہ عامیل کے نکاح میں اس کے چچا کی بیٹی تھی، بنی اسرائیل میں اس کے حسن و جمال کے مقابلے میں کوئی لڑکی نہیں تھی، تو عامیل کو اس کے چچازاد نے

اس لیے قتل کیا تاکہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرلے۔ ابن کلبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو اس کے بھتیجے نے قتل کیا، جب اس نے اسے قتل کیا تو اسے اپنی بستی سے اٹھا کر کسی دوسری بستی میں لے گیا اور اسے وہاں پر ڈال دیا، بعض یہ کہتے ہیں کہ اس نے مقتول کو دو بستیوں کے بیچ میں ڈال دیا تھا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی ایک مسجد تھی جس کے بارہ دروازے تھے، یہود کے ہر قبیلے کے لیے ایک دروازہ تھا تو مقتول کو ایک قبیلے کے دروازے پر ڈال گئے تھے۔ (الکشف والبیان عن تفسیر القرآن مؤلفہ احمد الثعلبی ج ا ص ۲۱۳) بہر حال جو بھی تھا ان کے مقتول کا پتا چلانے کے لیے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا گیا، جس سے ایک بڑا فتنہ بنی اسرائیل سے ختم ہو گیا۔

مقتول کے قاتل کی تلاش

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (۷۲) فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۷۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اور اس کے بعد اس کا الزام ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے، اور اللہ کو وہ راز نکال باہر کرنا تھا جو تم چھپائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس (گائے) کے ایک حصے سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں (اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

بنی اسرائیل کا جو شخص قتل کر دیا گیا تھا، پھر اس کی لاش کو پھینک دیا گیا تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی گئی تھی، موسیٰ علیہ السلام نے انہیں قاتلوں کی تلاش کا طریقہ بتایا تھا، یہ ساری بات اس سے پہلے والی آیات میں بیان ہو چکی ہے، یہ واقعہ کا ابتدائی حصہ ہے، جو اس سے پہلے بیان ہو چکا وہ واقعہ کا آخری حصہ ہے۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا: پھر تم مقتول کے قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگانے لگے۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ: یہ صیغہ اسم فاعل کا ہے، نکالنے والا کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اللہ اسے ظاہر کرنے والا۔

مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ: تم چھپاتے تھے کا مطلب یہ ہے کہ قاتل قتل کو چھپاتا تھا۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا: ہم نے انہیں کہا کہ اس گائے کو ذبح کرنے کے بعد اس کا کچھ حصہ اس مقتول کے جسم کے ساتھ لگاؤ تو وہ خود بولے گا، چنانچہ ان لوگوں نے ایسا کیا تو وہ زندہ ہو کر بولا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: بنی اسرائیل کے مقتول کے جسم کے ساتھ جب گوشت کا ٹکڑا لگایا گیا تو اسے اللہ نے زندہ کیا، وہ بولا، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے سامنے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا کہ میں اسی طرح مردوں کو زندہ کروں گا، انسانوں کے مرنے کے بعد آخرت میں انہیں زندہ کیا جائے گا۔

اس سورت میں پانچ جگہ مرنے کے بعد جینے کا بیان ہوا ہے ایک تو آیت ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرۃ:۵۶) میں اور دوسرا بنی اسرائیل کے اس قصے میں، تیسرا ان کے قصے میں جو ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے اور ایک اُجاڑ بستی پر ان کا گزر ہوا تھا، چوتھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں کے مار ڈالنے کے بعد زندہ ہو جانے میں، پانچواں زمین کی مردنی کے بعد روئیدگی کو موت وزیست سے تشبیہ دینے میں ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے ابورزین عقیلی رحمہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح جلائے گا فرمایا کبھی تم بنجر زمین پر گزرے ہو؟ کہا ہاں فرمایا پھر کبھی اس کو سرسبز وشاداب بھی دیکھا ہے؟ کہا ہاں فرمایا اسی طرح موت کے بعد زندگی ہے۔

قرآن کریم میں ایک اور مقام پر یوں ہے وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ (یس ۳۳) یعنی ان منکرین کے لئے مردہ زمین میں بھی ایک نشانی ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس میں سے دانے

نکالتے ہیں جسے یہ کھاتے ہیں اور جس میں ہم کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کرتے ہیں اور چاروں طرف نہروں کی ریل پیل کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان پھلوں کو مزے مزے سے کھائیں حالانکہ یہ ان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا یا پیدا کیا ہوا نہیں کیا پھر بھی یہ شکر گزاری نہ کریں گے؟ (تفسیر ابن کثیر)

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی نشانیاں دکھا رہا ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اس میں سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ہر چیز ظاہر ہو کے رہے گی۔ یہ اشارہ ان باتوں کی طرف ہو گا جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی اور جن کو چھپانے کے لیے دین میں طرح طرح کی تحریفیں کیں لیکن اب وہ قرآن اور آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی تھیں، یہ اس بات کی کھلی ہوئی نشانی تھی کہ خدا سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش ایک بے سود کوشش ہے، وہ ایک دن سارے رازوں سے پردہ اٹھا دے گا۔ (تفسیر تدبر قرآن)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم لوگ سمجھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ مردے زندہ کرنے پر قادر ہے اور روز جزا مردوں کو زندہ کرنا اور حساب لینا حق ہے۔

پتھر دل لوگ

سوال سورۃ البقرہ کی اس آیت مبارکہ میں پتھر دل لوگ کن کو اور کیوں کہا گیا ہے؟

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۷۴) البقرہ

جواب ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، گویا کہ وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں

پھر ان سے پانی نکلتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو زجر و توبیخ کی گئی ہے کہ اس قدر زبردست معجزے اور قدرت کی نشانیاں دیکھ کر پھر بھی بہت جلد تمہارے دل سخت پتھر بن گئے کہ اب کبھی نرم ہی نہیں ہوں گے یہی وجہ ہے کہ ایمان والوں کو اس طرح کی سختی سے روکا گیا اور کہا گیا أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (الحدید۱۶) یعنی کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اللہ کے نازل کردہ حق سے کانپ اٹھیں؟ اور اگلے اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جائیں جن کے دل لمبا زمانہ گزرنے کے بعد سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس مقتول کے بھتیجے نے اپنے چچا کے دوبارہ زندہ ہونے اور بیان دینے کے بعد جب مر گیا تو کہا کہ اس نے جھوٹ کہا اور پھر کچھ وقت گزر جانے کے بعد بنی اسرائیل کے دل پھر پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں نکلتی اور بہنے لگتی ہیں، بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں، بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں لیکن ان کے دل کسی وعظ و نصیحت سے کسی پند و موعظت سے نرم ہی نہیں ہوتے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پتھروں میں ادراک اور سمجھ ہے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا [الإسراء: ۴۴] یعنی ساتوں آسمان اور زمینیں اور ان کی تمام مخلوق اور ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو، اللہ بردباری والا اور بخشش والا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ہر پتھر سے پانی نکلتا ہے یا پانی کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے، یا خوف خداوندی سے پہاڑ کی چوٹی سے گر پڑتا ہے، یہی پیغام قرآن کریم دیتا ہے۔ (ابن کثیر)

ابو علی جبانی رحمہ اللہ نے پتھر کے خوف سے گر پڑنے کی تاویل اولوں کے برسنے سے کی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ بھی غیر درست بتلاتے ہیں اور فی الواقع یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ اس میں لفظ کے ظاہری معنیٰ کو بے دلیل کو چھوڑنا لازم آتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

حضرت یحیٰ بن یعقوب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہریں بہہ نکلنے سے یہاں زیادہ رونا مراد ہے، پھٹ جانا اور پانی کا نکلنا اس سے مراد کم رونا ہے، بعض پتھر اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں سے مراد دل کا رونا ہے جس میں آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے، بعض کہتے ہیں پتھر کی نسبت خشوع کی طرف کرنا یہ مجازاً کہا گیا ہے جیسے دوسرے مقام پر ارادہ کی نسبت دیوار کی طرف مجازاً کی گئی ہے، ارشاد ہے {يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ} یعنی دیوار گر پڑنا چاہ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مجاز ہے۔ حقیقتاً دیوار کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ کرام کہتے ہیں ایسی تاویلوں کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ جو صفت جس چیز میں چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہے إِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا (الاحزاب:۷۲) ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، انہوں نے اس کے اٹھانے سے مجبوری ظاہر کی اور ڈر گئے۔

سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (الرحمٰن) اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔ سورۃ النحل میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ (۴۸) (النحل) کیا وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں طرف جھکے جا رہے ہیں اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ فصلت میں ارشاد فرمایا کہ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (فصلت ۱۱) اس نے زمین و آسمان سے کہا کہ تم خوشی سے یا ناخوشی سے آجاؤ، انہوں نے کہا ہم خوشی خوشی حاضر ہیں۔ سورۃ الحشر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (الحشر ۲۲) اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تو اسے دیکھتا کہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ پھٹ پھٹ جاتا۔

سورۃ فصلت میں اللہ تعالیٰ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت ۲۱) یعنی گناہ گار لوگ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم سے اس اللہ نے بات کرائی جو ہر چیز کو بولنے کی طاقت عطا فرماتا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے اُحد پہاڑ کی نسبت فرمایا هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت رکھتے ہیں (بخاری) اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کھجور کے جس تنے کے ساتھ سہارا لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے جب منبر بنا اور اس کھجور کے تنے کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ (مسلم)
میں مکہ کے اس پتھر کو اب بھی پہچانتا ہوں جو میری نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ حجر اسود کے بارے میں ہے کہ جس نے اسے حق کے ساتھ بوسہ دیا ہو گا یہ اس کے ایمان کی گواہی قیامت والے دن دے گا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مٹی بھی تسبیح کرتی ہے، جب اس سے دیوار کی لپائی کی جاتی ہے تو یہ اس وقت بھی تسبیح کرتی ہے۔ (کتاب العظمۃ ابو الشیخ اصبہانی)

حضرت ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کھیتی تسبیح کرتی ہے تو اس کا ثواب کاشتکار کو ملتا ہے، ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب سایہ ڈھلتا ہے تو ہر جانور اور پرند سجدہ کرتا ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ کہتے

ہیں کہ ایک آدمی نے دروازہ کی آواز سنی تو کہا کہ یہ تسبیح کر رہا ہے۔ ابورزین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نجم اس گھاس اور بیل کو کہا جاتا ہے جس کا تنا نہ ہو اور درخت اس کو کہا جاتا ہے جس کا تنا ہو یہ دونوں سجدہ کرتے ہیں اور ان دونوں کا سایہ ہے۔ حضرت مطرف رحمہ اللہ اپنے گھر میں داخل ہوتے تو تسبیح ادا کرتے تھے ان کے ساتھ ان کے گھر کے برتن بھی تسبیح کرتے تھے۔ (العظمت ابوالشیخ)

اب انٹرنیٹ کا زمانہ ہے، دنیا بھر کے لوگ اللہ کی قدرت کے پھیلے شاہکار کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرتے اور نیٹ پر پھینکتے چلے جاتے ہیں، شرق سے غرب تک، شمال سے جنوب تک ہر شخص کسی نہ کسی شغل میں مشغول دکھائی دیتا ہے، ایسے ایسے درختوں کی تصویریں دیکھی گئی ہیں جو اپنا سر زمین پر رکھ کر اللہ کو سجدہ کرتے نظر آتے ہیں، ایسے ایسے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں جن پر واضح طور پر لفظ اللہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ایسے پتھر دکھائی دیتے ہیں جو واضح طور پر حالت سجدہ میں ہیں۔

یہود کی طرف سے آسمانی کتب میں ردوبدل

سوال قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کیا فرمانا چاہتے ہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۷۵) البقرہ

جواب ترجمہ: مومنو! کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے ہیں، پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد اس میں ردوبدل کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو واضح بتانا چاہتے ہیں کہ یہود کے بارے میں تم پر امید ہو کہ یہ تمہارے تابعدار ہو جائیں گے، یہود کا یہ گمراہ فرقہ جس کے آباؤاجداد نے واضح دلائل اور معجزات دیکھے جو

اِنہوں نے نہیں دیکھے تو اس کے بعد اُن کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے تھے، ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو بے جا تاویلات میں پڑا ہوا ہے، واضح طور پر بات جاننے بوجھنے کے باوجود یہ اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی باتوں کی مخالفت کرتے ہیں، انہیں واضح طور پر علم ہے کہ ہم غلطی پر ہیں، انہیں پتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے کلام میں تبدیلی کی ہے، اس میں تحریف کی ہے، تو جیسے دوسرے مقام پر سورۃ المائدہ میں فرمایا کہ ان کی طرف سے عہد وپیمان کی دھجیاں اڑانے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی ہے، اسی بناء پر ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر ڈالا ہے، وہ اللہ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعض اہل علم نے بیان کیا کہ أَنَّهُمْ قَالُوا لِمُوسَى: يَا مُوسَى، قَدْ حِيلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ رُؤْيَةِ اللهِ تَعَالَى، فَأَسْمِعْنَا كَلَامَهُ حِينَ يُكَلِّمُكَ. فَطَلَبَ ذَلِكَ مُوسَى إِلَى رَبِّهِ تَعَالَى فَقَالَ: نَعَمْ، مُرْهم فَلْيَتَطَهَّرُوا، وَلْيُطَهِّرُوا ثِيَابَهُمْ وَيَصُومُوا فَفَعَلُوا، ثُمَّ خَرَجَ بِهِمْ حَتَّى أَتَوُا الطُّوْرَ، فَلَمَّا غَشِيَهُمُ الْغَمَامُ أَمَرَهُمْ مُوسَى أَنْ يَسْجُدُوا، فَوَقَعُوا سُجُودًا، وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ تَعَالَى، فَسَمِعُوا كَلَامَهُ يَأْمُرُهُمْ وَيَنْهَاهُمْ، حَتَّى عَقَلُوا عَنْهُ مَا سَمِعُوا. ثُمَّ انْصَرَفَ بِهِمْ إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَلَمَّا جَاءُوهُمْ حَرَّفَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ مَا أَمَرَهُمْ بِهِ، وَقَالُوا حِينَ قَالَ مُوسَى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ: إِنَّ اللهَ قَدْ أَمَرَكُمْ بِكَذَا وَكَذَا. قَالَ ذَلِكَ الْفَرِيقُ الَّذِينَ ذَكَرَهُمُ اللهُ: إِنَّمَا قَالَ كَذَا وَكَذَا خِلَافًا لِمَا قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُمْ. (تفسیر ابن کثیر)

ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے اور اللہ کے دیدار کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی ہے، جب اللہ آپ سے بات کرے تو ہمیں اس کی بات سنا، موسیٰ نے اپنے رب سے اجازت طلب کی، اللہ نے فرمایا: ہاں! انہیں حکم دے کہ وہ پاک صاف ہو جائیں اور اپنے کپڑے بھی پاک صاف کر لیں، روزہ رکھ لیں، چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا، پھر انہیں لے کر نکلے، طور پہاڑ پر آئے، جب انہیں بادلوں نے ڈھانپ لیا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا کہ وہ سجدہ کریں، چنانچہ وہ سجدہ

میں پڑ گئے اور ان کے رب نے ان سے بات کی، انہوں نے اپنے رب کا کلام سنا جو انہیں حکم دے رہا تھا اور انہیں منع کر رہا تھا، انہوں نے اللہ کا جو کلام سنا اسے سمجھ بھی لیا، پھر موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر بنی اسرائیل کی طرف لوٹے، جب آپ علیہ السلام ان کے پاس پہنچے تو ان میں سے ایک گروہ نے اس میں تحریف کر ڈالی جس کا اس نے انہیں حکم دیا تھا، جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے ایسے حکم دے رہا ہے تو یہودیوں کے اس گروہ نے کہا جس کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کیا ہے کہ اللہ تو ایسے ایسے کہہ رہا ہے، اللہ نے جو کچھ فرمایا تھا یہ اس کے الٹ کہہ رہا تھا۔

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان لوگوں نے توراۃ میں تحریف کی تھی یہی عام معنی ٹھیک ہیں جس میں وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں گے اور اس بد خصلت والے دوسرے یہودی بھی۔ قرآن میں ہے وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ [التَّوْبَة: ٦] یعنی مشرکوں میں سے کوئی اگر تجھ سے پناہ طلب کرے تو تو اسے پناہ دے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔

تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ کا کلام اپنے کانوں سے سنے بلکہ قرآن سنے تو یہاں بھی کلام اللہ سے مراد تورات ہے۔ یہ تحریف کرنے والے اور چھپانے والے ان کے علماء تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف ان کی کتاب میں تھے ان سب میں انہوں نے تاویلیں کر کے اصل مطلب دور کر دیا تھا، اسی طرح حلال کو حرام، حرام کو حلال، حق کو باطل، باطل کو حق لکھ دیا کرتے تھے۔

قرآن کریم کی سورۃ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ} [آل عمران: ۷۲] یعنی اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے کہا، ایمان والوں پر جو اترا ہے اس پر دن کے شروع حصہ میں ایمان لاؤ پھر آخر میں کفر کرو تا کہ خود ایمان والے بھی اس دین سے پھر جائیں۔

یہ لوگ اس فریب سے یہاں کے راز معلوم کرنا اور انہیں اپنے والوں کو بتانا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے تھے مگر ان کی یہ چالاکی نہ چلی اور یہ راز اللہ نے کھول دیا جب یہ یہاں

ہوتے اور اپنا ایمان اسلام ظاہر کرتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے پوچھتے کیا تمہاری کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ نہیں؟ وہ اقرار کرتے۔ جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے تو وہ انہیں ڈانٹتے اور کہتے اپنی باتیں ان سے کہہ کر کیوں ان کے ہاتھوں میں اپنی مخالفت کے ہتھیار دے رہے ہو؟

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ والے دن یہودیوں کے قلعہ تلے کھڑے ہو کر فرمایا يَا إِخْوَانَ الْقِرَدَةِ وَالْخَنَازِيرِ، وَيَا عَبَدَةَ الطَّاغُوتِ اے بندر اور خنزیر اور طاغوت کی عبادت کرنے والوں کے بھائیو! تو وہ آپس میں کہنے لگے یہ ہمارے گھر کی باتیں انہیں کس نے بتادیں؟ خبردار! اپنی آپس کی خبریں انہیں نہ دو ورنہ انہیں اللہ کے سامنے تمہارے خلاف دلائل میسر آجائیں گے اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گو تم چھپاؤ لیکن مجھ سے تو کوئی چیز چھپ نہیں سکتی تم جو چپکے چپکے اپنوں سے کہتے ہو کہ اپنی باتیں ان تک نہ پہنچاؤ اور اپنی کتاب کی باتوں کو چھپاتے ہو تو میں تمہارے اس برے کام سے بخوبی آگاہ ہوں، تم جو اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہو۔ تمہارے اس اعلان کی حقیقت کا علم بھی مجھے اچھی طرح ہے۔

یہود کا نفاق اور درر حنا پن

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۷۶) أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۷۷) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب یہ لوگ ان (مسلمانوں) سے ملتے ہیں جو پہلے ایمان لا چکے ہیں تو (زبان سے) کہہ دیتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں، اور جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں جاتے ہیں تو (آپس میں ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ: کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو

اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ (مسلمان) تمہارے پروردگار کے پاس جاکر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کیا یہ لوگ (جو ایسی باتیں کرتے ہیں) یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو ان ساری باتوں کا خوب علم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں؟

عام منافقین کا طریقہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور تنہائیوں میں اپنے سرغنوں سے کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اسی طرح یہودی منافق بھی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر کردیتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور اسی ظاہر کرنے میں یہ بھی کہہ جاتے تھے کہ تورات شریف میں ایسا ایسا لکھا ہے اور اس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بشارت اور آپ کی علامات اور صفات موجود ہیں اور ان علامات اور صفات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ واقعی اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ (انوار البیان)

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اہل مدینہ (اوس اور خزرج) نے یہود مدینہ سے مشورہ کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہماری ملاقات ہوئی ہے اور ہم لوگ ان پر ایمان لائے ہیں اور وہ ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لارہے ہیں، ان کے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے تو سادہ دل یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہاں ان پر ایمان لاؤ وہ نبی ہیں۔ پھر جب تنہائیوں میں ایک دوسرے سے ملتے تو آپس میں کہتے کہ تم لوگ عجیب ہو مسلمانوں کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتے ہو اور ان کو یہ بھی بتاتے ہو کہ ان کا ذکر اور نعت وصفت تورات شریف میں موجود ہے یہ تو تم اپنے اوپر حجت قائم کررہے ہو جب قیامت کا دن ہوگا تو مسلمان اللہ پاک کے حضور میں تم پر حجت قائم کردیں گے اور خود تم اپنے اقرار سے پکڑے جاؤ گے کہ تم نے ان سے تو کہا کہ واقعی نبی ہیں اور خود ان کی نبوت کو نہ مانا تمہارا اقرار خود تم پر حجت ہوگا لہٰذا ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جو تمہارے خلاف حجت بنیں تم اتنی بھی سمجھ نہیں رکھتے خود اپنے اقرار کی چھری سے خود اپنے ذبح کا انتظام کر رہے ہو۔ (در منثور)

یہ کیسی بیوقوفی کی بات ہے کہ مسلمانوں پر حق ظاہر کر کے خود اس کے خلاف کرو گے تو قیامت کے دن مسلمان تم پر حجت قائم کریں گے اور دلیل سے مغلوب کر دیں گے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مؤاخذہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے وہ سب کچھ جانتا ہے جو دلوں میں ہے اسے اس کا بھی پتہ ہے اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ اگر مسلمانوں سے حق کو چھپایا تو اللہ پاک کے حضور میں اس وجہ سے کفر کے عذاب سے کیونکر خلاصی ہو گی کہ ہم نے مسلمانوں کو صحیح بات نہ بتائی تھی۔ جب شقاوت کسی کو گھیر لیتی ہے تو وہ جان بوجھ کر اسی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ (انوار البیان)

یہودیوں کا ان پڑھ گروہ

سوال اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان کیا؟

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (۷۸) البقرہ

جواب ترجمہ: اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں جو کتاب نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور وہ محض اٹکل پچو باتیں بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہودیوں کے ایک چالاک، مکار اور شاطر گروہ کا ذکر کیا تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور پر پہنچا تھا، واپسی پر موسیٰ علیہ السلام اللہ کی باتیں لوگوں کو سناتے تو یہ گروہ ان کی باتوں کو رد کرتا جاتا اور کہتا جاتا کہ اللہ نے یوں نہیں یوں فرمایا ہے، اب یہاں ایسے طبقے کا ذکر فرمایا ہے جو ان پڑھ ہے، جس کے پاس سوائے خواہشات اور نیک تمناؤں کے کچھ بھی نہیں ہے، ان کا کہنا تھا کہ ہم تو اللہ کی اولاد ہیں، ہم تو اللہ کے دوست ہیں، اس وجہ سے ہمیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے، ہمیں سزا نہیں ملے گی اگر ملی بھی تو صرف اتنے دن جتنے دن ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

تو یہ وہ گروہ تھا جسے اس بات سے کوئی سروکار نہ تھی کہ تورات میں کیا لکھا ہوا ہے، وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتے تھے، جیسے مسلمانوں میں قرآن کے بے شمار حافظ ہیں جو لکھنا پڑھنا بلکہ اپنے قلم

سے دستخط کرنا بھی نہیں جانتے مگر ان کے سینے میں اللہ کی کتاب کے تیس سپارے محفوظ ہوتے ہیں، وہ بہت عمدہ قرآن پڑھ لیتے ہیں مگر اس قرآن میں لکھا ہوا کیا ہے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے، اس کے معنی اور مفہوم، اس کی تفسیر اور تشریح سے یہ لوگ ناواقف ہیں، اسی بناء پر بہت سی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں، ہزاروں بچے ہر سال حافظ قرآن بن جاتے ہیں مگر قرآنی مفاہیم، مطالب، معانی اور مقاصد سے نا آشنا ہوتے ہیں، پھر یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے، اسی طرح یہودیوں میں بھی ایک طبقہ تھا جسے کوئی پتا نہیں تھا کہ تورات میں لکھا ہوا کیا ہے۔

ویلٌ سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کیا فرمارہے ہیں؟

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (۷۹) البقرہ

جواب ترجمہ: سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ روپیہ کمائیں پھر افسوس ہے ان کے ہاتھوں کے لکھنے پر اور افسوس ہے ان کی کمائی پر۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے سخت وعید سنا رہے ہیں جو اپنے ہاتھوں کی تحریر کردہ چیزوں کو اللہ کی طرف سے اترنے والی کتاب کے طور پر دکھاتے پھرتے ہیں، یقیناً عام لوگ تو کسی بھی مذہب میں اس طرح کی جسارت اور ہمت نہیں کرسکتے، یہ کسی بھی طبقہ کے علماء سُوء ہی ہوسکتے ہیں، جس طرح یہود کے علماء سُوء کرتے تھے، اپنے خیالات کو وحی الٰہی قرار دیتے تھے، اس لیے ان کے لیے اللہ نے سزا سنائی کہ ان کے لیے وَیل ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں هَؤُلَاءِ صِنْفٌ آخَرُ مِنَ

الْيَهُودِ، وَهُمُ الدُّعَاةُ إِلَى الضَّلَالِ بِالزُّورِ وَالْكَذِبِ عَلَى اللهِ، وَأَكْلِ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ یہ یہود کی ایک دوسری قسم ہے، یہ وہ لوگ تھے جو جھوٹ، اللہ پر افترا پردازی کے ذریعے گمراہی کی طرف بلاتے تھے، لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے ہڑپ کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

ان بگڑے ہوئے، پڑھے لکھے جہلاء کے لیے سزا بھی سخت تجویز کی گئی ہے، کہ ان کے لیے وَیل ہے، وَیل کا معنی ہے ہلاکت، تباہی، بربادی، لغت کے لحاظ سے یہ مشہور کلمہ ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ زیاد بن فیاض رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ابو عیاض رحمہ اللہ سے سنا کہ وَیل جہنم کی پیپ کو کہا جاتا ہے، یعنی ان علماء سُوء کو جہنم کی پیپ پلائی جائے گی۔ عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَیل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، اگر اس میں پہاڑوں کو لا کر ڈالا جائے تو وہ بھی دُھول ہو جائیں۔

آقائے نامدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، وَيْلٌ وَادٍ فِي جَهَنَّمَ، يَهْوِي فِيهِ الْكَافِرُ أَرْبَعِينَ خَرِيفًا قَبْلَ أَنْ يَبْلُغَ قَعْرَهُ وَیل جہنم کی اس وادی کا نام ہے جس میں کافروں کو ڈالا جائے گا وہ چالیس سال میں اس کی گہرائی تک پہنچیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۲)

آقائے نامدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، الْوَيْلُ جَبَلٌ فِي النَّارِ. وَهُوَ الذِي أُنْزِلَ فِي الْيَهُودِ، لِأَنَّهُمْ حَرَّفُوا التَّوْرَاةَ، زَادُوا فِيهَا مَا أَحَبُّوا، وَمَحَوْا مِنْهَا مَا يَكْرَهُونَ، وَمَحَوا اسْمَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ التَّوْرَاةِ. وَلِذَلِكَ غَضِبَ اللهُ عَلَيْهِمْ، فَرَفَعَ بَعْضَ التَّوْرَاةِ. فَقَالَ: {فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ} [البقرة: ۷۹] (تفسیر طبری ج ۲)

ویل جہنم میں ایک پہاڑ ہے، یہ بات یہودیوں کے لیے اتاری گئی ہے کیونکہ انہوں نے تورات میں تحریف کر دی تھی، جو چیز انہیں پسند تھی اسے زیادہ کر دیتے تھے اور جو چیز انہیں پسند نہیں تھی اسے مٹا دیتے تھے، انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تورات سے مٹا دیا تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ ان پر غصے ہوا اور تورات کو اٹھا لیا تھا، اور اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا، ان کے لیے ویل ہے بہ سبب اس کے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے وَیل ہے بہ سبب اس کے جو وہ کماتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ إِنَّهُ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ وَیل دردناک عذاب کو کہتے ہیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إِنَّهُ مَسِيلُ صَدِيدِ أَهْلِ جَهَنَّمَ وَیل اس نالی کو کہا جاتا ہے جس سے اہل جہنم کی پیپ بہہ رہی ہو گی۔ خلیل بن احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وَیل سخت ترین شراروں کو کہا جاتا ہے، سیبویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وَیل کا معنیٰ ہے ہلاکت میں پڑنا۔

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ «وَيْلٌ» يَتَضَمَّنُ نِهَايَةَ الْوَعِيدِ وَالتَّهْدِيدِ فَهَذَا الْقَدْرُ لَا شُبْهَةَ فِيهِ سَوَاءٌ كَانَ الْوَيْلُ عِبَارَةً عَنْ وَادٍ فِي جَهَنَّمَ أَوْ عَنِ الْعَذَابِ الْعَظِيمِ (تفسیر کبیر للرای ج ا ص ۵۶۵) ویل چاہے جہنم کی وادی کا نام ہو، چاہے بڑے عذاب کا نام ہو، ویل کا لفظ انتہائی وعید اور ڈراوے کو شامل ہے۔

جہنم سے متعلق یہود کی خام خیالی

سوال یہود کا یہ قول جو قرآن میں موجود ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً (البقرہ ۸۰)

جواب ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو ہی نہیں سکے گی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہودی لوگ کہا کرتے تھے کہ الدُّنْيَا سَبْعَةُ آلَافِ سَنَةٍ فَاللَّهُ تَعَالَى يُعَذِّبُهُمْ مَكَانَ كُلِّ أَلْفِ سَنَةٍ يَوْمًا، فَكَانُوا يَقُولُونَ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُعَذِّبُنَا سَبْعَةَ أَيَّامٍ (تفسیر کبیر ج ا ص ۵۶۶) دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے، پس اللہ تعالیٰ انہیں ہر سال کے بدلے میں ایک دن عذاب دے گا، وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سات دن عذاب دے گا۔

حضرت اصم رحمہ اللہ نے بعض یہود کی یہ بات نقل کی ہے، وہ کہتے تھے کہ أَنَّهُمْ عَبَدُوا الْعِجْلَ سَبْعَةَ أَيَّامٍ فَكَانُوا يَقُولُونَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُعَذِّبُنَا سَبْعَةَ أَيَّامٍ (تفسیر کبیر) انہوں نے بچھڑے کی پوجا سات دن کی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہمیں سات دن عذاب دے گا۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے ان دونوں باتوں کو کمزور اور ضعیف قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال اور سات دن کے عذاب میں کسی قسم کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ لوگ چالیس دن تک آگ میں رہنا مانتے تھے کیونکہ ان کے بڑوں نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی بعض کا قول ہے کہ یہ دھوکہ انہیں اس سے لگا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ تورات میں ہے کہ جہنم کے دونوں طرف زقوم کے درخت تک چالیس سال کا راستہ ہے تو وہ کہتے تھے کہ اس مدت کے بعد عذاب اٹھ جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر کہا کہ چالیس دن تک تو ہم جہنم میں رہیں گے پھر دوسرے لوگ ہماری جگہ آجائیں گے یعنی آپ کی امت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا نہیں بلکہ تم ہی تم ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں پڑے رہو گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں فتح خیبر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور ہدیہ بکری کا پکا ہوا زہر آلود گوشت آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہاں کے یہودیوں کو جمع کرلو پھر ان سے پوچھا مَن أَبُوكُمْ؟ تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا: فلاں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹے ہو بلکہ تمہارا باپ فلاں ہے۔

انہوں نے کہا: بجا ارشاد ہوا وہی ہمارا باپ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟

دیکھو اب میں کچھ اور پوچھتا ہوں سچ سچ بتانا۔

انہوں نے کہا: اے ابو القاسم! اگر جھوٹ کہیں گے تو آپ کے سامنے نہ چل سکے گا ہم تو آزما چکے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟ بتاؤ جہنمی کون لوگ ہیں؟

انہوں نے کہا: کچھ دن تو ہم ہیں پھر آپ کی امت۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اخسأوا، وَاللّٰهِ لَا نَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا

مجھ سے دور ہو جاؤ، اللہ کی قسم ہم ہر گز تمہاری جگہ نہیں لیں گے۔

آپ ﷺ نے پوچھا: هَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟

اگر میں تم سے ایک سوال کروں تو کیا تم سچ بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا: اے ابو القاسم! ہاں

پھر آپ ﷺ پوچھا: هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هَذِهِ الشَّاةِ سُمًّا؟ اچھا بتلاؤ اس گوشت میں تم نے زہر ملایا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: فَمَا حَمَلَكُمْ عَلَى ذَلِكَ؟ ایسا کرنے پر تمہیں کس نے اکسایا تھا؟ انہوں نے کہا: اگر آپ سچے ہیں تو یہ زہر آپ ﷺ کو ہر گز ضرر نہ دے گا اور اگر جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ (مسند احمد بخاری، نسائی)

جنتی کون اور دوزخی کون؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۱) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۲) البقرہ

جواب ترجمہ: (آگ تمہیں) کیوں نہیں (چھوئے گی)؟ جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں تو وہ جنت کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

ان دو آیتوں میں جنتی اور دوزخی ہونے کا ضابطہ بتایا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے طریقہ سے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید بھی ہے جو اوپر کی آیت میں مذکور تھا۔ پہلی آیت میں یوں فرمایا کہ تمہارے پاس اپنے دعوے کی کوئی دلیل نہیں اور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہے، اور ان دو آیتوں میں جو ضابطہ جنت اور دوزخ کے داخلے کا ذکر فرمایا ہے اس میں یہ بتا دیا کہ تم لوگ

ضابطہ کے مطابق ان لوگوں کے زمرہ میں آتے ہو جن کو ہمیشہ دائمی عذاب ہو گا۔

ارشاد فرمایا کہ تم یہ جو کہتے ہو کہ دوزخ میں ہمیشہ نہ رہیں گے صرف چند دن عذاب ہو گا تمہاری بات غلط ہے، تم ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہو، ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص برائی کرے اور اس کی برائی ہر طرف سے اس کو گھیر لے کہ وہ کفر اختیار کرے جو سب سے بڑی برائی ہے تو وہ دوزخ والا ہے اس میں ہمیشہ رہنا ہو گا، تم لوگ خاتم النبیین ﷺ کی نبوت اور رسالت کے منکر ہونے کی وجہ سے کافر ہو لہٰذا ضابطہ کے مطابق ہمیشہ دوزخ میں رہو گے اور اہل جنت وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے جنہوں نے اللہ کے سب نبیوں کو مانا خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کو مانا اور اعمال صالحہ انجام دیئے، یہ حضرات ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد وپیمان کی اجمالی فہرست

سوال اس آیت مبارکہ میں کیا بیان کیا جارہا ہے؟

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (۸۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے اچھا سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا پھر سوائے چند آدمیوں کے تم میں سے سب منہ موڑ کر پھر گئے۔

بنی اسرائیل کو جو احکام دیئے گئے اور ان سے جن چیزوں پر عہد لیا گیا ان کا ذکر ہو رہا ہے ان کی عہد شکنی کا ذکر ہو رہا ہے انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ توحید کو تسلیم کریں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں، یہ حکم نہ صرف بنی اسرائیل کو ہی دیا گیا بلکہ تمام مخلوق کو دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلا أَنَا فَاعْبُدُونِ [الْأَنْبِيَاءِ: ۲۵] یعنی تمام رسولوں کو ہم نے یہی حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ قابل عبادت میرے سوا اور کوئی نہیں سب لوگ میری ہی عبادت کریں اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اُعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ [النَّحْلِ: ۳۶] یعنی ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔

سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور اس کے تمام حقوق میں بڑا حق یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور دوسرے کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ اب حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا بیان ہو رہا ہے بندوں کے حقوق میں ماں باپ کا حق سب سے بڑا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ [لُقْمَانَ: ۱۴] میرا شکر کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی احسان مان اور میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَقَضَى رَبُّكَ أَلا تَعْبُدُوا إِلا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا} (الاسراء ۲۳) تیرے رب کا فیصلہ ہے کہ اس کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان اور عمدہ سلوک کرتے رہو

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ عَلَى وَقْتِهَا قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ. قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ یارسول اللہ! کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کو وقت پر ادا کرنا پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، پوچھا: پھر کونسا؟ فرمایا: پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ (بخاری و مسلم)

ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ أَبِرُّ؟ قَالَ: أُمَّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمَّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أَبَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ (ابوداؤد) یارسول اللہ! میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ، پوچھا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے

ساتھ، پھر پوچھا کس کے ساتھ؟ فرمایا! اپنے باپ کے ساتھ اور قریب والے کے ساتھ پھر اور قریب والے کے ساتھ۔

یتیم ان چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں جن کے لیے کمائی کرنے والا ان کے آباء میں سے کوئی نہ ہو، اہل لغت کہتے ہیں کہ اولادِ آدم میں یتیم وہ ہے جس کا باپ نہ ہو اور جانوروں میں یتیم وہ ہے جس کی ماں نہ ہو، مسکین ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش اور دیگر ضروریات پوری طرح مہیانہ کر سکتے ہوں۔ پھر فرمایا لوگوں کو اچھی باتیں کہا کرو، یعنی ان کے ساتھ نرم کلامی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا کرو، بھلی باتوں کا حکم اور برائی سے روکا کرو، حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں بھلائی کا حکم دو، برائی سے روکو، بردباری، درگزر اور خطاؤں کی معافی کو اپنا شعار بنالو یہی اچھا اخلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا، وَإِنْ لَمْ تَجِدْ فَالْقَ أَخَاكَ بِوَجْهٍ مُنْطَلِقٍ (مسند احمد) اچھی چیز کو حقیر نہ سمجھو اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو اپنے بھائیوں سے ہنستے ہوئے چہرے سے ملاقات تو کر لیا کرو۔

یہودِ مدینہ کے تین قبائل

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (۸۴) البقرہ

جواب ترجمہ: پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔

اوس اور خزرج انصار مدینہ کے دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کی آپس میں کبھی بنتی نہ تھی، ہمیشہ آپس میں جنگ و جدال رہتا تھا۔ مدینے کے یہودیوں کے بھی تین قبیلے تھے، بنی

قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنی نضیر تو خزرج کے طرف دار اور ان کے بھائی بند بنے ہوئے تھے، بنی قریظہ کا بھائی چارہ اوس کے ساتھ تھا۔ جب اوس و خزرج میں جنگ ٹھن جاتی تو یہودیوں کے یہ تینوں گروہ بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ان سے مل کر ان کے دشمن سے لڑتے۔

دونوں طرف کے یہودی یہودیوں کے ہاتھ مارے بھی جاتے، یہ ان کے دین میں ان پر حرام تھا اور موقع پا کر ایک دوسرے کے گھروں کو بھی اجاڑ ڈالتے، دیس نکالا بھی دے دیا کرتے تھے اور مال و دولت پر بھی قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ جب لڑائی موقوف ہوتی تو مغلوب فریق کے قیدیوں کا فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہم میں سے جب کوئی قید ہو جائے تو ہم فدیہ دے کر چھڑا لیں اس پر جناب باری تعالیٰ انہیں فرماتا ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ میرے اس ایک حکم کو تو تم نے مان لیا لیکن میں نے کہا تھا کہ آپس میں کسی کو قتل نہ کرو گھروں سے نہ نکالو اسے کیوں نہیں مانتے؟ کسی حکم پر ایمان لانا اور کسی کے ساتھ کفر کرنا یہ کہاں کی ایمانداری ہے؟

آیت میں فرمایا کہ اپنے خون نہ بہاؤ اور اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو یہ اس لیے کہ ہم مذہب سارے کے سارے ایک جان کی مانند ہیں حدیث میں بھی ہے کہ مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَوَاصُلِهِمْ بِمَنْزِلَةِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمَّى وَالسَّهَرِ (مسلم) تمام ایماندار دوستی، اخوت، صلہ رحمی اور رحم و کرم میں ایک جسم کے مثل ہیں کسی ایک عضو کے درد سے تمام جسم بیتاب ہو جاتا ہے، بخار چڑھ جاتا ہے راتوں کی نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تورات میں ان کے لیے ایک دوسرے کا خون بہانا حرام قرار دیا تھا، قیدیوں کا فدیہ ان پر فرض کر دیا تھا، جب لڑائی رک جاتی تو یہ لوگ تورات کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے سے فدیے کا مطالبہ کرتے تھے، ایک دوسرے سے خون بہا مانگتے تھے، ان کے اپنے مطلب اور مفاد میں جانے والے تورات کے احکام انہیں یاد رہتے تھے اور ان پر عمل بھی کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اور بھی بہت سی باتوں کا حکم دیا تھا وہ ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے تھے۔

عبد خیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم سلمان بن ربیعہ کی ماتحتی میں بَلَنْجَر میں جہاد کر رہے تھے، محاصرہ کے بعد ہم نے اس شہر کو فتح کیا، جس میں بہت سے قیدی بھی ملے، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک یہود لونڈی کو سات سو میں خریدا، راس الجالوت کے پاس جب ہم پہنچے تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور فرمایا یہ لونڈی تیری ہم مذہب ہے، میں نے اسے سات سو میں خریدا ہے، اب تم اسے مجھ سے خرید لو اور آزاد کر دو، اس نے کہا بہت اچھا، میں چودہ سو دیتا ہوں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تو چار ہزار سے کم نہیں بیچوں گا، اس نے کہا پھر میں نہیں خریدتا، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا سن یا تو تو اسے خرید ورنہ تیرا دین جاتا رہے گا، تورات میں لکھا ہوا ہے کہ إِنَّكَ لَا تَجِدُ مَمْلُوكًا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا اشْتَرَيْتَهُ فَأَعْتَقْتَهُ بنو اسرائیل کا کوئی بھی شخص گرفتار ہو جائے تو اسے خرید کر آزاد کیا کرو۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَى تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو اور انہیں ان کے گھر سے بے گھر بھی نہ کیا کرو۔ اب یا تو تورات کو مان کر اسے خرید یا تورات کا منکر ہونے کا اقرار کر! وہ سمجھ گیا اور کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم شاید عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں۔

چنانچہ وہ چار ہزار لے آیا، آپ رضی اللہ عنہ نے دو ہزار لے لئے اور دو ہزار لوٹا دیئے، بعض روایتوں میں ہے کہ عبد اللہ بن سلام کوفہ میں راس الجالوت کے پاس سے گزرے اور یہ ان لونڈیوں کا فدیہ نہیں دیتا تھا جن کے ساتھ عربوں نے صحبت کی ہوتی تھی اور ان لونڈیوں کا فدیہ دے دیا کرتا تھا جن کے ساتھ عربوں نے صحبت نہیں کی ہوتی تھی، اس پر حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا کہ دونوں طرح کی لونڈیوں کا فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کریم کی آیت بھی اسی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

غرض آیت میں یہودیوں کی مذمت ہے کہ وہ احکام الٰہیہ کو جانتے ہوئے پھر بھی پس پشت ڈال دیا کرتے تھے، امانت داری اور ایمانداری ان سے اٹھ چکی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

نشانیاں، آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق، آپ ﷺ کی جائے پیدائش، جائے ہجرت وغیرہ سب چیزیں ان کی کتاب میں موجود تھیں، لیکن یہ ان سب کو چھپائے ہوئے تھے اور اتنا ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ کی مخالفت کرتے تھے، اسی باعث ان پر دنیوی رسوائی آئی اور کم نہ ہونے والے اور دائمی آخرت کا عذاب بھی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

یہودیوں کی عہد شکنی

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَى تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۸۵) أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۸۶) البقرہ)

جواب ترجمہ: اس کے بعد (آج) تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرتے ہو، اور اپنے ہی میں سے کچھ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو، اور ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کر کے (ان کے دشمنوں کی) مدد کرتے ہو، اور اگر وہ (دشمنوں کے) قیدی بن کر تمہارے پاس آجاتے ہیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کو (گھر سے) نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب (تورات) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس کی رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، لہٰذا نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہو گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

شان نزول: توریت میں بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں وطن سے نہ نکالیں اور جو بنی اسرائیل کسی کی قید میں ہو اس کو مال دے کر چھڑالیں اس عہد پر انہوں نے اقرار بھی کیا اپنے نفس پر شاہد بھی ہوئے لیکن قائم نہ رہے اور اس سے پھر گئے صورت واقعہ یہ ہے کہ نواح مدینہ میں یہود کے دو فرقے بنی قُرَیظہ اور بنی نُضَیر سکونت رکھتے تھے اور مدینہ شریف میں دو فرقے اوس و خزرج رہتے تھے بنی قریظہ اوس کے حلیف تھے اور بنی نضیر خزرج کے یعنی ہر ایک قبیلہ نے اپنے حلیف کے ساتھ قسما قسمی کی تھی کہ اگر ہم میں سے کسی پر کوئی حملہ آور ہو تو دوسرا اس کی مدد کرے گا۔

اوس اور خزرج باہم جنگ کرتے تھے بنی قریظہ اوس کی اور بنی نضیر خزرج کی مدد کے لئے آتے تھے اور حلیف کے ساتھ ہو کر آپس میں ایک دوسرے پر تلوار چلاتے تھے بنی قریظہ بنی نضیر کو اور وہ بنی قریظہ کو قتل کرتے تھے اور ان کے گھر ویران کر دیتے تھے انہیں ان کی رہائش گاہوں سے نکال دیتے تھے لیکن جب ان کی قوم کے لوگوں کو ان کے حلیف قید کرتے تھے تو وہ ان کو مال دے کر چھڑا لیتے تھے مثلاً اگر بنی نضیر کا کوئی شخص اوس کے ہاتھ میں گرفتار ہوتا تو بنی قریظہ اوس کو مالی معاوضہ دے کر اس کو چھڑا لیتے باوجودیکہ اگر وہی شخص لڑائی کے وقت ان کے موقع پر آجاتا تو اس کے قتل میں ہرگز دریغ نہ کرتے۔

اس فعل پر ملامت کی جاتی ہے کہ جب تم نے اپنوں کی خونریزی نہ کرنے ان کو بستیوں سے نہ نکالنے ان کے اسیروں کو چھڑانے کا عہد کیا تھا اس کے کیا معنی کہ قتل و اخراج میں تو درگزر نہ کرو اور گرفتار ہو جائیں۔ تو چھڑاتے پھرو عہد میں سے کچھ ماننا اور کچھ نہ ماننا کیا معنی رکھتا ہے۔ جب تم قتل و اخراج سے باز نہ رہے تو تم نے عہد شکنی کی اور حرام کے مرتکب ہوئے اور اس کو حلال جان کر کافر ہو گئے۔

رُوح القدس سے کون مراد ہے؟

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں اور روح القدس سے کیا مراد ہے؟

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (۸۷) البقرہ

جواب ترجمہ: اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد بھی پے در پے رسول بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور روح لقدس سے اس کی تائید کی کیا جب تمہارے پاس کوئی وہ حکم لایا جسے تمہارے دل نہیں چاہتے تھے تو تم اکڑ بیٹھے پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کیا۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی سرکشی اور تمرد کا ذکر فرمارہے ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی جسے ان کے پیروکاروں نے بدل ڈالا، اس میں تحریف کر ڈالی، اس کے احکامات کو تبدیل کیا، ان میں بے جا تاویلات سے کام لیا، یہ لوگ کسی بات کو نہیں مانتے یہ محض اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں، حالانکہ ان کے بعد بھی اللہ نے لگاتار رسول اور نبی بھیجے، جس طرح تورات ہدایت اور روشنی کا مینار تھی اسی طرح اس کے بعد آنے والی کتابیں بھی روشنی کا مینار تھیں۔

غرض پے در پے یکے بعد دیگرے انبیاء کرام علیہم السلام بنی اسرائیل میں آتے رہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوا، انہیں انجیل ملی، جس میں بعض احکام تورات کے خلاف بھی تھے، اسی لئے انہیں نئے نئے معجزات بھی ملے جیسے مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کر دینا، مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک مار کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اڑا دینا، بیماروں کو اپنے دم جھاڑ سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اچھا کر دینا، بعض بعض غیب کی خبریں اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے دینا وغیرہ، آپ علیہ السلام کی تائید پر روح القدس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کو لگا دیا لیکن بنی اسرائیل اپنے کفر اور تکبر میں اور بڑھ گئے اور

زیادہ حسد کرنے لگے اور ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ برے سلوک سے پیش آئے۔ کہیں جھٹلاتے اور کہیں مار ڈالتے تھے محض اس بنا پر کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ان کی طبیعتوں کے خلاف ہوا کرتی تھی ان کی رائے اور ان کے قیاسات اور ان کے بنائے ہوئے اصول واحکام ان کی قبولیت سے ٹکراتے تھے اس لئے دشمنی پر تل جاتے تھے۔

روح القدس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جیسے قرآن شریف میں اور جگہ ہے نزلَ بِهِ الرُّوحُ الأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ [بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ] } [الشُّعَرَاءِ: ۱۹۳-۱۹۵] یعنی ااس قرآن کریم کو لے کر روح الامین علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اترے ہیں، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ڈرانے والے ہوں، یہ قرآن عربی زبان میں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَ لِحَسَّانَ بْنِ ثَابِتٍ منبرًا فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَ يُنَافِحُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اللَّهُمَّ أَيِّدْ حَسَّانَ بِرُوحِ الْقُدُسِ كَمَا نَافَحَ عَنْ نَبِيِّكَ (بخاری) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے مسجد میں منبر رکھوایا وہ مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! حسان کی مدد روح القدس سے فرما جیسے کہ یہ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب دیتے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ

أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانَ، وَهُوَ يُنْشِدُ الشِّعْرَ فِي الْمَسْجِدِ فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أُنْشُدُ فِيهِ، وَفِيهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْكَ. ثُمَّ التَفَتَ إِلَى أَبِي هُرَيْرَةَ، فَقَالَ: أَنْشُدُكَ اللَّهَ أَسَمِعْتَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول: أَجِبْ عَنِّي، اللَّهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ فَقَالَ: اللَّهُمَّ نَعَمْ

حضرت حسان رضی اللہ عنہ (خلافت فاروقی کے زمانے میں) ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف تیز نگاہیں اٹھائیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تو اس وقت بھی ان

شعروں کو یہاں پڑھتا تھا جب یہاں تم سے بہتر شخص موجود تھے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا ابو ہریرہ! تمہیں اللہ کی قسم کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہیں سنا؟ کہ اے حسان! تو مشرکوں کے اشعار کا جواب دے اے اللہ! تو حسان کو روح القدس کے ذریعے مضبوط کر۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اللہ کی قسم! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔ (بخاری، مسلم، تفسیر ابن کثیر ج ۱)

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حسان تم ان مشرکین کی ہجو کرو جبریل علیہ السلام بھی تمھارے ساتھ ہیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے شعر میں بھی جبریل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی بابت پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں اللہ کی قسم! اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے کہو کیا خود تمہیں معلوم نہیں کہ وہ جبریل امین ہیں، اور وہی میرے پاس بھی وحی لاتے ہیں، ان سب نے بیک زبان ہو کر کہا کہ بے شک ایسا ہی ہے۔ (ابن اسحاق بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَخَ فِي رُوعِي: إِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا وَأَجَلَهَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ (ابن حبان، شرح السنہ للبغوی)

جبریل علیہ السلام نے میرے دل میں کہا کہ کوئی شخص اپنی روزی اور زندگی پوری کئے بغیر نہیں مرتا، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور دنیا کمانے میں دین کا خیال رکھو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روح القدس سے مراد اسم اعظم لیا ہے، جس کے ذریعے عیسی علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اسم اعظم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روح سے مراد وہ فرشتہ ہے جو باقی فرشتوں پر محافظ ہے۔

ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قدس سے مراد خود اللہ تعالیٰ ہیں (تفسیر ابن کثیر ج ۱) علامہ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قدس سے مراد برکت ہے۔ مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قدس سے مراد اللہ ہے اور روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ روح سے مراد انجیل ہے، جیسے قرآن میں قرآن کو روح کہا گیا ہے اسی طرح انجیل کو بھی روح کہا گیا ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح یعنی انجیل کے ساتھ قوت دی۔ ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہاں روح القدس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

یہود کی رعونت، مکاری اور انکار حق

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ (۸۸) وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ (۸۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ (۹۰) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ہمارے دل غلاف میں ہیں۔ نہیں! بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی (یعنی قرآن) جو اس (تورات) کی تصدیق بھی کرتی ہے جو پہلے سے ان کے پاس ہے (تو ان کا طرز عمل دیکھو) باوجود یکہ یہ خود شروع میں کافروں (یعنی بت پرستوں) کے خلاف (اس کتاب کے حوالے سے) اللہ سے فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چیز ان کے پاس آگئی جسے انہوں نے پہچان بھی لیا، تو اس کا انکار کر بیٹھے، پس پھٹکار ہے اللہ کی ایسے کافروں پر۔ بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا صرف اس جلن کی

بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فضل کا کوئی حصہ (یعنی وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہ رہا ہے (کیوں) اتار رہا ہے؟ چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں۔ اور کافر لوگ ذلت آمیز سزا کے مستحق ہیں۔

یہودی اسلام کو قبول نہیں کرتے تھے اور خاتم النبیین ﷺ پر ایمان نہیں لاتے تھے آپ کی سچائی کی علامات اور معجزات دیکھ کر بھی منحرف تھے اور اس گمراہی کو اپنے لیے کمال اور باعث فخر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور پردے پڑے ہوئے ہیں کسی کی بات ہمارے دلوں میں اثر نہیں کر سکتی اور اپنے دین کے علاوہ ہم کوئی دوسرا دین قبول نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ شانہ، نے ان کی تردید فرمائی۔ کہ یہ بات کو سنتے اور سمجھتے ہیں اور حق بھی جانتے ہیں لیکن حق سے ان کو تنفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ملعون قرار دیدیا ہے لعنت اور پھٹکار میں گرفتار ہیں دلوں پر پردے اور غلاف کچھ نہیں کفر کی پھٹکار اور لعنت کے سبب ایمان سے محرومی ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

ان کے اس جملے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شیخی بگھارتے تھے کہ ہمارے دلوں پر ایک حفاظتی غلاف ہے جس کی وجہ سے کوئی غلط بات ہمارے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی اور یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے آپ سے مایوس کرنے کے لئے طنزاً یہ کہتے تھے کہ آپ تو بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے اور ہمیں اسلام کی دعوت دینے کی فکر میں نہ پڑو۔ (توضیح القرآن)

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا: جب یہودیوں کی بت پرستوں سے جنگ ہوتی یا بحث و مباحثہ ہوتا تو وہ یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ یا اللہ! آپ نے تورات میں جس آخری نبی کی خبر دی ہے اسے جلدی بھیج دیجئے تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر بت پرستوں پر فتح حاصل کریں، مگر جب وہ نبی حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے تو وہ حسد میں مبتلا ہو گئے کہ انہیں بنی اسرائیل کے بجائے بنی

اسماعیل میں کیوں بھیجا گیا؟ چنانچہ یہ جان لینے کے باوجود کہ آنحضرت ﷺ پر وہ ساری علامتیں صادق آتی ہیں جو تورات میں نبی آخر الزماں ﷺ کی بیان کی گئی ہیں انہوں نے آپ کو ماننے سے سے انکار کر دیا۔ (توضیح القرآن)

اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بَغۡیًا: میں یہ بتایا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو دوزخ کا مستحق اس لیے بنایا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے اختیار فرمانے سے عناد ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبوت اور رسالت عطا کرے اور جس بندے پر چاہے اپنی کتاب اتارے، اسے پورا پورا اختیار ہے، اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا اور یہ ضد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو کیوں نبی بنایا اور فلاں کو نہیں بنایا؟ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو کر کافر ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہوئے اور اللہ کے رسول محمد رسول اللہ ﷺ اور اللہ کی کتاب قرآن مجید کے منکر ہو کر کفر ہی کفر میں ترقی کرتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے، لہٰذا آخرت میں ذلت کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

لفظ اشتروا کے بارے میں مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ

باعُوْا وَشَرَوا بِحَسْبِ ظَنِّهِمْ اور صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: اَی بَاعُوا، فَالاَنفُس بِمَنزِلَةِ المُثمن والكُفر بِمَنزِلَةِ الثَّمَن لاَنَّ اَنفُسَهُمُ الخَبِيثَةُ لَا تُشتَرىٰ بَل تُبَاعُ وَ هُوَ عَلَى الاِستِعَارَةِ أَى أَنَّهُم اختَارُوا الكُفرَ عَلَى الاِيمَانِ وَبَذَلُوا أَنفُسَهُم فِيهِ

یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچ دیا اور ان کے عوض کفر کو بطور قیمت کے لے لیا اور یہ معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان کے خبیث نفس خریداری کے قابل نہیں بیچنے ہی کے لائق ہیں مطلب یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بیچ ڈالا یعنی برباد کر دیا اور کفر کو بطور قیمت کے حاصل کر لیا۔ (انوار البیان)

کسی پر ایمان اور کسی کا انکار

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کریں

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹۱) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں ہم تو اسی کو مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اسے نہیں مانتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے کہہ دو پھر تم کیوں اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

یہود کو جب یہ کہا جاتا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ، ان کی تصدیق کرو اور ان کی پیروی کرو تو وہ کہہ دیتے تھے کہ ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف اتاری گئی ہے یعنی تورات اور انجیل کے علاوہ ہم کسی چیز پر ایمان لانے والے نہیں ہیں، حالانکہ وہ ان کتابوں کے بھی منکر ہیں اور ان کے بعد اتاری جانے والی کتاب قرآن کریم کے بھی منکر ہیں، حالانکہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جو اس سے پہلے اترنے والی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، تورات اور انجیل جو ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اس میں بھی تصدیق موجود ہے، قرآن کریم کے مطابق یہود نبی کریم ﷺ کو اس طرح جانتے اور پہچانتے تھے جس طرح انسان اپنی اولاد کو پہچانتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا انکار تورات و انجیل سے بھی انکار کے مترادف ہے۔

اس حجت کو قائم کرکے اب دوسری طرح حجت قائم کی جاتی ہے کہ اچھا تورات اور انجیل پر اگر تمہارا ایمان ہے پھر اگلے انبیاء علیہم السلام جو انہی کی تصدیق اور تابعداری کرتے ہوئے بغیر کسی نئی شریعت اور نئی کتاب کے آئے تو تم نے انہیں قتل کیوں کیا؟ اللہ نے ان کا قتل تم پر حرام کیا تھا، تم

پر تو اللہ کی طرف سے یہ بات لازم تھی کہ تم ان کی پیروی کرو، ان کی بات مانو، مگر تم نے ازروئے حسد و تکبر ان کی بات کو جھٹلایا اور انہیں جان سے مار ڈالا، معلوم ہوا کہ تمہارا ایمان نہ تو اس کتاب پر ہے نہ اُس کتا بپر، تم محض خواہش کے بندے نفس کے غلام اپنی رائے اور قیاس کے غلام ہو۔

پھر فرمایا کہ اچھا موسیٰ سے واضح نشانیاں، قاطع دلائل دیکھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ہی معبود ہے، ان سے تو تم نے بڑے بڑے معجزے دیکھے، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک، خون وغیرہ جو ان کی بد دعا سے بطور معجزے ظاہر ہوئے، لکڑی کا سانپ بن جانا، ہاتھ کا روشن چاند بن جانا، دریا کو چیر دینا اور پانی کو پتھر کی طرح بنا دینا، بادلوں کا سایہ کرنا، من و سلویٰ کا اترنا، پتھر سے نہریں جاری کرنا وغیرہ تمام بڑے بڑے معجزات جو ان کی نبوت کی اور اللہ کی توحید کی روشن دلیلیں تھیں سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر گئے ادھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا اب بتاؤ کہ خود تورات پر اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی تمہارا ایمان کہاں گیا؟ کیا یہ بدکاریاں تمہیں ظالم کہلوانے والی نہیں؟

مِن وَّرَاءِ یعنی بعدہ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَى مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ [الْأَعْرَافِ: ۱۴۸] یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر اللہ کے ساتھ مناجات کے لیے جانے کے بعد ان کی قوم نے بچھڑے کو معبود بنالیا اور اپنی جانوں پر اس گوسالہ پرستی سے واضح ظلم کیا جس کا احساس بعد میں خود انہیں بھی ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِنْ لَمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ} [الْأَعْرَافِ: ۱۴۹] یعنی جب انہیں ہوش آیا نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کو محسوس کرنے لگے اس وقت کہا اے اللہ! اگر تو ہم پر رحم نہ کرے اور ہماری خطا نہ بخشے تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

روشن دلائل کے باوجود بچھڑا پرستی کا ظلم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ (۹۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اور خود موسیٰ تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، پھر تم نے ان کے پیٹھ پیچھے یہ ستم ڈھایا کہ گائے کے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام بھی کھلی ہوئی اور واضح دلیلیں لے کر آئے جو تم نے خود دیکھیں جس سے ان کا رسول اللہ ہونا واضح ہو گیا اور انہوں نے پوری طرح توحید کی دعوت دی اور تم کو جم کر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کی تبلیغ کی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لیکن جب وہ کوہ طور پر تورات شریف لینے چلے گئے تو تم لوگوں نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تمہارا یہ غیر اللہ کی پرستش کرنا صریح ظلم تھا، راہِ حق کے خلاف چلنا دلائل واضحہ اور آیات بینات سامنے ہوتے ہوئے منکر ہو جانا سراسر ظلم ہے، جو تمہاری پرانی عادت ہے، تمہارے اسلاف کی حرکتیں تمہارے سامنے ہیں جن کا تم کو علم ہے لیکن ابھی تک ان کو پیشوا بنائے ہوئے ہو اور انہیں کی راہ پر گامزن ہو۔

جب پہاڑ قومِ موسیٰ پر سائبان بن گیا

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کی جائے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب ہم نے تم (لوگوں) سے مضبوط عہد لیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا) کہ جو (کتاب) ہم نے تم کو دی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور (جو تمہیں حکم ہوتا ہے اس

کو) سنو تو وہ (جو تمہارے بڑے تھے) کہنے لگے ہم نے سن تو لیا لیکن مانتے نہیں اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا گویا ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔ (اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جس طبیعت اور مزاج کی تھی اس کا جگہ جگہ قرآن کریم نے ذکر کیا ہے، ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت تنگ کیا، دریا عبور کرنے کے بعد تو موسیٰ علیہ السلام کو یہاں تک مجبور کر دیا کہ وہ اللہ کی ملاقات کرانے اور اللہ کا کھلی آنکھوں دیدار کرانے کے مطالبے پر انہیں طور پہاڑ کی طرف لے گئے تھے، جب سارے جتن کرنے کے باوجود اس قوم کی ہٹ دھرمی، ضد اور نافرمانی ختم نہ ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ يَا رَبِّ إِنَّ عِبَادَكَ لَمْ يَقْبَلُوا كِتَابَكَ وَعَصَوا أَمرَكَ (تفسیر مقاتل ج۱ص ۱۲۴) اے میرے پروردگار! تیرے بندوں نے تیری کتاب کو قبول نہیں کیا اور تیرے حکم کی نافرمانی کی ہے۔

تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکایت پر ان سے فرمایا کہ میں اپنی قدرت سے ایک بڑی نشانی آپ کو دے رہا ہوں، وہ یہ کہ جس پہاڑ پر آپ میرے سے ہم کلام ہوتے ہیں، جس پہاڑ پر آپ کی قوم کے لوگوں نے حق کا مشاہدہ کیا، اس پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح ان کے سروں پر چھا جائے اور زبانِ حال سے یہ اعلان کرے کہ موسیٰ اللہ کا سچا پیغامبر ہے، تورات اللہ کی سچی کتاب ہے، اگر موسیٰ اور تورات اللہ کی طرف سے سچے نہ ہوتے تو پھر تم اللہ کی قدرت سے ظاہر ہونے والی نشانیاں نہ دیکھ پاتے۔

رب تعالیٰ نے کچھ فرشتوں اور حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا، انہوں نے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر ان کے سروں پر بلند کر دیا، یہ پہاڑ آسمان اور ان کے سروں کے درمیان تھا، اس پہاڑ اور ان کے سروں کے درمیان ایک میل کا فاصلہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس وقت بھی فرمایا کہ تورات کو مانو ورنہ یہ پہاڑ تمہارے سروں کو کچل دے گا، اللہ کی قدرت سے طور پہاڑ ان کے سروں پر سائبان کی طرح دکھائی دینے لگا اور زبان حال سے بنی اسرائیل کو کہنے لگا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی مانو، میں اللہ کی قدرت کی نشانی بن کر تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام میری پشت پر کئی بار اللہ سے ہم کلام ہو چکا ہے، تمہاری ہدایت اور راہنمائی کے لیے دی جانے والی تورات میری پشت پر ہی اسے ملی ہے، میں پتھروں کا مجموعہ ہوں، میں پہاڑ ہوں مگر اللہ کے حکم کے سامنے میں جھکا ہوا ہوں، تمہیں اللہ کی قدرت کی کاریگری دکھا رہا ہوں، مگر تم کس قدر ضدی اور ہٹ دھرم ہو کہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔

تفسیر مقاتل میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب انہیں فرمایا کہ تورات کے احکامات کو پوری قوت کے ساتھ مانو، ورنہ پہاڑ تمہیں کچل ڈالے گا، انہوں نے کہا کہ پہاڑ سے آپ ہمیں ڈراتے ہیں ہم اس بناء پر آپ کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ وہ پہاڑ اپنی جگہ پر چلا گیا، مگر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ جی! آپ جس تورات کو ماننے کا کہہ رہے ہیں اس میں سخت احکامات ہیں، ہمارے لیے بچھڑے کو ماننا اس تورات کے شدت پسندانہ احکامات ماننے سے زیادہ آسان تھا، یہاں اگر احکامات نہ مانیں تو سزا ملتی ہے مگر بچھڑا تو سزا نہیں دیتا۔

رَفَعنَا فَوقَکُم اور نَتَقنَا الجَبَلَ: اس مقام پر اللہ نے رَفَعنَا فَوقَکُم استعمال فرمایا، دوسرے مقام پر سورۃ الاعراف میں نَتَقنَا الجَبَلَ کا لفظ استعمال فرمایا، ان دونوں جملوں کا مطلب واضح ہے اور اہل لغت کے ارشادات کی روشنی میں بھی دکھائی دے رہا ہے نَتَقَ الوِعَا عربی میں اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی مشکیزے وغیرہ کو اس لیے اوپر کیا جاتا ہے جب اس کے اندر سے سارا پانی نکالنا مقصود ہوتا ہے، کسی برتن کو انڈیلنے کے لیے اس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر الٹا کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر کا سارا پانی باہر نکل آئے، اسی طرح اللہ نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر ان کے اوپر کھڑا کر دیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تسلیم کرو ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر آن گرے گا۔

اساس البلاغہ میں ہے وَنَتَقَ اللهُ الجَبَلَ رَفَعَهُ مُزَعْزِعاً فَوْقَهُم اللہ تعالیٰ نے پہاڑ اٹھایا درانحالیکہ وہ اسے ان پر زور زور سے حرکت دے رہا تھا، الصحاح تاج اللغۃ میں ہے وإذ نَتَقْنا الجَبَلَ، أَي زَعزَعنَاهُ ہم نے اسے زور زور سے جھنجھوڑا، خلیل بن احمد کی کتاب العین میں ہے وَنَتَقَتِ المَلَائِكَةُ جَبَلَ الطُّورِ أَي اقتَلَعُوهُ مِن أَصلِهِ حَتَّى أَطَّلَعُوهُ عَلَى عَسكَرِ فرشتوں نے کوہ طور کو ہلایا یعنی اسے جڑ سے اکھاڑا یہاں تک کہ اسے لشکر پر معلق کر دیا۔

معجم الوسیط میں ہے نَتَقًا رَفعُهُ مِن مَكَانِه لِيُرمَى بِهِ نتق کا معنیٰ ہے کسی چیز کو پھینکنے کے لیے اٹھانا، يُقَال نَتَقَ الْحَجَرَ وَهَزَّهُ وَنَفَضَهُ کہا جاتا ہے اس نے پتھر اٹھایا، اسے حرکت دی اور اسے پھینک دیا، تحفۃ الاریب بما فی القرآن من غریب میں ہے {نتقنا}: رفعنا ہم نے بلند کیا، بعض کہتے ہیں اس کا معنیٰ ہے اقتلعنا ہم نے اسے جڑ سے اکھاڑا، لسان العرب میں حدیث کا حوالہ دے کر کہا گیا کہ نَتَقنَا کا معنیٰ اقْتُلِع مِنْ مَكَانِهِ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑا گیا تھا، مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار میں اس کا معنیٰ لکھا ہوا ہے اَلنَّتقُ وَهُو أَن يُّقلَعَ الشَّيءُ فَيُرفَعَهُ مِن مَكَانِهِ لِيُرمَى بِهِ نَتْقٌ کا معنیٰ ہے کسی چیز کو اکھاڑا جائے پھر اسے اس کی جگہ سے اٹھایا جائے تاکہ اسے پھینکا جائے۔

ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ نَتَقنَا کا معنیٰ ہے زَعزَعنَاهُ فَاستَخرَجنَاهُ مِن مَّكَانِهِ ہم نے اسے زور زور سے حرکت دی پھر ہم نے اسے اس کی جگہ سے نکالا (الغریبین فی القرآن والحدیث)، المعجم الاشتقاقی میں ہے أنه اقتُلِع مِن مَّكَانِهِ ورُفِعَ فَوقَهُم پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر ان پر بلند کیا گیا، ابو نصر فارابی کی الصحاح الجوہری میں ہے کہ گھوڑے کو فَرَسٌ نَاتِقٌ، اس وقت بولتے ہیں جب وہ اپنے سوار کو اچھال اچھال کر تھکا دے، اسی طرح کنویں کے اندھر سے ڈول نکال نکال کر باہر انڈیلنے کو کہا جاتا ہے نَتَقْتُ الغَرْب مِنَ البئرِ، ان لغوی اور شرعی دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ یہ پہاڑ ان پر اکھاڑ کر معلق کر دیا گیا تھا،

بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ یہ پہاڑ سروں کے اوپر نہیں تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے سروں کے اوپر ہے، حالانکہ یہ قرآنی الفاظ کے معنیٰ اور مفہوم کے بالکل خلاف ہے، جیسے نَتَق اور رَفَعنَا فَوقَکُم کے الفاظ سے واضح ہے۔ پھر یہاں ایک باریک اشکال ہوتا ہے کہ دین میں سختی نہیں ہے جب کہ یہاں ایسے معلوم ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور کیا جا رہا تھا، حالانکہ یہاں بھی زور وزبردستی والی بات نہیں تھی، بلکہ بنی اسرائیل کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیگر بہت سے معجزات عطاء فرمائے تھے، اسی طرح ایک بڑا معجزہ یہ بھی عطا فرمایا کہ پہاڑ اپنی جڑوں سے اکھڑ کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح دکھائی دینے لگا، یہ آیتہ اللہ کا آخری مظاہرہ تھا، جو ان کی ہدایت وراہنمائی کے لیے کیا گیا تھا۔

بچھڑے کی محبت: حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پہاڑ پر اللہ سے ہمکلام ہونے اور تورات لینے کے لیے گئے تو اپنے پیروکاروں سے فرمایا کہ طور پہاڑ پر میرے اعتکاف کی مدت ایک مہینہ ہو گی، یہ مختصر سی مدت مکمل ہو گی تو میں تمہارے پاس واپس آجاؤں گا، میرے بھائی ہارون علیہ السلام تمہارے پاس رہیں گے، تمہاری دیکھ بھال کرتے رہیں گے، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر پہنچے تو یہ ایک ماہ کی مدت چالیس دنوں میں بدل گئی، اس تاخیر کے باعث بنی اسرائیل میں تشویش کی لہر دوڑ گئی، اس تشویش کا سامری نے خوب فائدہ اٹھایا، اسے پتا چل گیا تھا کہ بنی اسرائیل اس تاخیر کی وجہ سے پریشان ہیں، اس نے ان لوگوں کو کہا کہ تم نے قبطیوں سے جو زیورات ادھار لیے تھے وہ میرے حوالے کرو تاکہ میں انہیں کام میں لا کر تمہارے فائدے کا سامان تیار کروں، یہ زیورات ان لوگوں نے فرعون والوں سے ادھار لیے تھے، اتنے میں وہ دریا کے اندر غرق ہو گئے تو یہ سارے زیورات انہی کے پاس رہ گئے تھے۔

سامری منافق آدمی تھا، باہر سے مسلمان اور اندر سے کفر وشرک سے بھرا ہوا تھا، جب بنی اسرائیل نے سونے کے تمام زیورات لا کر سامری کے حوالے کر دیے تو اس نے انہیں بھٹی میں ڈال

کر پگھلا دیا، اس سے اس نے بچھڑے کا جسم تیار کیا، پھر ایک مٹھی مٹی کی اس میں ڈال دی، جس سے اس نے آواز نکالی، اس آواز کو سننا تھا کہ سامری ایک اور گمراہی میں مبتلا ہو گیا، کہنے لگا کہ موسیٰ سے بھول ہو گئی ہے، جس رب کی تلاش میں وہ طور پر گیا وہ تو یہی بچھڑا ہے، لوگو! موسیٰ اور تمہارا معبود تو یہی ہے۔

چنانچہ سامری نے بنی اسرائیل کو ترغیب دینا شروع کر دی کہ وہ اس بچھڑے کی پوجا پاٹ شروع کر دیں، بنی اسرائیل نے اس کی اس گمراہ کن دعوت کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا، حضرت ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ اس بچھڑے کی پوجا نہ کریں، لوگوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد ہی ہم بچھڑے کی پوجا سے رک سکتے ہیں، جب تک وہ نہیں آجاتے تب تک ہم اس کی پوجا کرتے رہیں گے، ادھر طور پہاڑ پر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دے دی کہ ان کے طور پر آنے کے بعد ان کی قوم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے۔

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: طور پر آنے میں آپ نے جلدی کیوں کی؟

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: تاکہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں۔

اللہ تعالیٰ نے اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ جس قوم کی ہدایت کے لیے آپ اس قدر فکر مند ہیں وہ گمراہ ہو چکی ہے، آپ کی قوم نے آپ کے طور پر آنے کے بعد بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ سنا تو سخت پریشان ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ سے پوچھا: کس نے انہیں بچھڑے کی پوجا پر لگایا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سامری نے ان کے لیے بچھڑا بنایا ہے۔

موسیٰ نے پوچھا: اس بچھڑے میں روح کس نے پھونکی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: روح تو میں نے ہی پھونکی ہے۔

موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! سامری نے ان کے لیے بچھڑا بنا کر انہیں گمراہ کر دیا ہے اور تو نے اس

میں روح پھونک کر میری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

وہ ستر لوگ جوان کے ساتھ طور پہاڑ کی طرف گئے تھے ان کے علاوہ باقی لوگ آزمائش میں پڑ گئے تھے، اللہ نے قرآن میں بھی واضح کیا کہ ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا اور سامری نے انہیں گمراہ کیا۔ موسیٰ فرطِ جذبات میں وہاں سے اُتر کر قوم کی طرف آئے، جب دریا کے کنارے پہنچے تو لوگوں کی بانت بانت کی بولیاں سنیں، آوازیں اٹھ رہی تھیں، ان کے ساتھ موجود ستر لوگوں کو طور پر ہونے والی گفتگو اور ہمکلامی کا تو علم تھا مگر پیچھے گوسالہ پرستوں نے کیا غضب ڈھایا؟ موسیٰ نے انہیں بالکل ابھی تک نہیں بتایا تھا، اس لیے جب ساحل کے قریب پہنچے تو بچھڑے کے قریب سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، ان ہمرائیوں نے کہا کہ محلہ میں کوئی لڑائی وغیرہ ہو رہی ہے، جس پر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بتایا کہ یہ لڑائی نہیں ہے بلکہ فتنے کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، اس کے بعد قوم کے ساتھ غصے میں بات کرنے لگے کہ مجھ سے اتنی کون سی دیر ہو گئی تھی کہ تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی؟ اور یہ ظلم تم نے ڈھالیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام غصہ میں باتیں کرتے جا رہے تھے اور مارے غصے کے کانپ بھی رہے تھے، اسی کپکپاہٹ کے عالم میں آپ کے ہاتھ سے تورات کی تختیاں بھی گر گئیں اور ان میں سے دو تختیاں ٹوٹ بھی گئیں۔

تفسیر مقاتل میں ہے فَغَضِبَ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ فَانْكَسَرَ مِنْهَا لَوْحَانِ فَارْتَفَعَ مِنَ اللَّوْحِ بَعْضُ كَلَامِ اللهِ پس موسیٰ غصہ میں ہوئے، تختیاں پھینک دیں، پس ان میں سے دو تختیاں ٹوٹ گئیں، ان پر لکھے ہوئے کلام اللہ شریف کا کچھ حصہ بھی اٹھ گیا تھا۔ (تفسیر مقاتل ج ا ص ۱۰۵)

جلال موسوی کو دیکھتے ہوئے بنی اسرائیل نے اپنی بے قصوری کا اعتراف کیا، انہوں نے کہا کہ اہلِ مصر کا جو زیور ہمارے اوپر لدا ہوا تھا وہ ہم سے سامری نے مانگا اور اس کے بعد اس نے اس زیور کو پگھلا کر اس کا بچھڑا بنایا، یوں سامری نے یہ گمراہ کن کام کیا ہے۔

جلال موسوی تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا، اپنے سگے بھائی ہارون علیہ السلام کو سر کے بالوں اور داڑھی سے پکڑ لیا، کہ آپ کی موجودگی میں یہ لوگ شرک میں پڑ گئے، انہوں نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے میں نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ یہ شرک ہے، گمراہی ہے، تم اس میں مت پڑو، مگر انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ہم اس سے رک نہیں سکتے، چنانچہ میرے سمجھانے پر یہ غصے میں آئے، قریب تھا کہ یہ مجھے بھی قتل کر ڈالتے، جب میں نے ان کے بدلتے تیور دیکھے تو خیال آیا کہ اگر میں مزید کچھ کرتا ہوں تو ان لوگوں اور کامل مسلمانوں کے درمیان خونریز لڑائی چھڑ سکتی ہے، یوں یہاں کے رہنے والے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے تھے، اور آپ بھی مجھے کہتے کہ تو نے تفرقہ پھیلایا ہے، اس لیے میں خاموش رہا اور آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، اس لیے آپ میرے سر اور داڑھی کے بال چھوڑ دیں اور دشمنوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دیں اور مجھے ظالموں میں شمار نہ کریں۔

حضرت ہارون علیہ السلام بڑی فصیح اور بلیغ گفتگو کرنے والے تھے، ان کی زبان بڑی صاف تھی، ان کی شُستہ کلامی نے موسیٰ علیہ السلام کے جلال کو جمال میں بدل ڈالا، مگر جلال موسوی ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کے بعد اپنے جلال کا رخ سامری کی طرف موڑ لیا، سامری کو متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ تو نے یہ کیا شعبدہ بازی کی ہے؟

سامری نے کہا: میں نے ایسی بات دیکھی جو بنی اسرائیل میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی، وہ یہ کہ جب فرعون کو اللہ نے دریا میں غرق کیا، تو اس کے غرق ہونے کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان حائل تھے، میں نے دیکھا کہ جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی سُم کے نیچے آنے والی مٹی میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور سُرخ زمین پر سبزہ اُگنا شروع ہو جاتا ہے، تو میں نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے سُموں کی خاک سے ایک مٹھی بھر لی، اس

مٹی کو میں نے بچھڑے کے منہ میں ڈال دیا، جس سے اس میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے اور بچھڑا آواز دینے لگا۔

حضرت جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کو فرس الحیات (زندگی کا گھوڑا) کہا جاتا ہے، جس چیز کو بھی اس کے سم لگتے ہیں تو اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے، میرے دل میں ایسی ہی بات آئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی گفتگو سن کر فرمایا کہ اچھا تو نے ایسا کیا تو اس کا انجام اور اس کی سزا یہ ہے کہ زندگی میں جو بھی تیرے پاس آئے تو اس کے لیے تیرے منہ سے ایک ہی جملہ نکلے کہ میرے پاس نہ آنا میں اچھوت ہوں، دنیا میں یہی کہتا پھرے گا اور آخرت کی سزا کا جو وعدہ ہے وہ کبھی ٹلنے والا نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو کہا کہ وہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ سامری کے پاس نہ جائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سامری کا نام موسیٰ بن ظفر تھا، یہ ایک منافق شخص تھا جو اسلام ظاہر کرتا تھا، یہ ایسی قوم میں سے تھا جو گائے کی پوجا کیا کرتی تھی، چنانچہ اس کے دل میں بھی گائے کی محبت تھی، کہتے ہیں کہ یہ زرگر تھا، اس نے آٹھ ہزار انسانوں کو گمراہ کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سامری کو قتل کرنا چاہتے تھے مگر اللہ نے فرمایا کہ اسے قتل نہ کرو اس لیے کہ یہ سخی آدمی ہے، لیکن اسے تم اپنے سے دور کر دو، بعض کتابوں میں ہے جب کبھی یہ کسی کو ہاتھ لگاتا یا اسے کوئی ہاتھ لگاتا تو دونوں بخار میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ (الکشف والبیان عن تفسیر القرآن)

سامری کو موسیٰ علیہ السلام نے لَا مِسَاسَ فرمایا تو اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا، چنانچہ یہ بھاگ گیا اور جنگل کے جانوروں کے ساتھ مارا مارا پھرتا تھا، وحشی جانوروں کے ساتھ گھومتا تھا۔

جلال موسوی ابھی بھی ٹھنڈا نہیں ہوا، سامری کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو بچھڑا تو نے ان لوگوں کو معبود بنا کر دیا ہے اب اس کا حشر نشر کروں گا، ہم اسے جلائیں گے، اسے جلا کر راکھ کریں گے،

پھر راکھ کو سمندر میں اڑا کر بہادیں گے، یہ بات واضح طور پر سن لو کہ معبود، پرستش کے لائق، عبادت کا مستحق صرف اکیلا اللہ ہے۔

بچھڑا سازی کی مہم کے ذیل میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے کچھ اور واقعات بھی قلمبند کیے ہیں، تفسیر مجاہد میں ایک واقعہ تحریر ہے کہ مَرَّ هَارُونُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالسَّامِرِيِّ وَهُوَ يَصْنَعُ الْعِجْلَ، فَقَالَ لَهُ: مَا تَصْنَعُ؟ قَالَ: أَصْنَعُ مَا يَضُرُّ وَلَا يَنْفَعُ، قَالَ هَارُونُ: اللَّهُمَّ أَعْطِهِ مَا سَأَلَكَ عَلَى مَا فِي نَفْسِهِ، فَلَمَّا قَفَا هَارُونُ، قَالَ السَّامِرِيُّ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنْ يَخُورَ، فَخَارَ، فَكَانَ إِذَا خَارَ سَجَدُوا، وَإِذَا خَارَ رَفَعُوا رُءُوسَهُمْ، وَإِنَّمَا خَارَ لِدَعْوَةِ هَارُونَ (تفسیر مجاہد ج ا ص ۴۶۵)

حضرت ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گزرے تو وہ بچھڑا بنا رہا تھا، ہارون علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ تو کیا کر رہا ہے؟ سامری نے کہا کہ میں وہ چیز بنا رہا ہوں جو نقصان دے سکتی ہے اور نہ ہی نفع، ہارون علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے اللہ! اس کے دل میں جو ہے اور جس کا اس نے سوال کیا ہے وہ اسے دے دے، جب ہارون علیہ السلام پیچھے مڑے تو سامری نے کہا: اے میرے اللہ! میں تجھ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ یہ بچھڑا بولے، چنانچہ بچھڑا بولا، جب بچھڑا بولا تو وہ لوگ سجدے میں گر گئے، جب وہ بولا تو سجدے سے اپنے سروں کو اٹھایا، بچھڑا ہارون علیہ السلام کے دعا کرنے کی وجہ سے بولا تھا۔

بچھڑے کا انجام: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلال ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا، آپ علیہ السلام نے سامری کو بنی اسرائیل کے محلے سے نکلنے کا حکم جاری فرمایا، اس کے بعد تمام برائیوں اور شرکیات کی جڑ بچھڑے کا رخ کیا، اس کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا، اسے جلایا، اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا کر دریا میں ڈال دیا، ابھی بھی جلال ٹھنڈا نہیں ہوا، لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔

بچھڑے کی راکھ بنا کر اڑا ڈالی، ان کو بتا دیا کہ یہ واقعی کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہے، مگر اس کے باوجود ان لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کی محبت موجود تھی، اس کے لیے اللہ نے فرمایا کہ ان کے دل میں بچھڑے کی محبت ڈال دی گئی تھی۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کی راکھ بنا کر جس دریا میں ڈالی تھی جب بچھڑے سے محبت رکھنے والا کوئی شخص اس سے پانی پیتا تو اس کا چہرہ سونے کی طرح پیلا ہو جاتا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے فَمَا شَرِبَ أَحَدٌ مِنْ ذَلِكَ الْمَاءِ مِمَّنْ كَانَ يَعْبُدُ الْعِجْلَ إِلَّا اصْفَرَّ وَجْهُهُ مِثْلَ الذَّهَبِ جو شخص بچھڑے کی عبادت کیا کرتا تھا جب وہ اس پانی میں سے پیتا تو اس کا چہرہ سونے کی طرح ہو جاتا تھا۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے قشیری کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں میں جب کوئی شخص اس سے پانی پیتا تھا تو وہ پاگل ہو جاتا تھا۔ (قرطبی بحوالہ ابن کثیر ج ۱)

بنی اسرائیل کی توبہ کا عجیب واقعہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلال ابھی تک اسی طرح ہے، آپ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں رجوع کریں، اس سے معافی مانگیں، چنانچہ وہ لوگ اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوئے، ندامت کے مارے انہوں نے اپنی انگلیاں دانتوں میں دے لیں اور پکار اٹھے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ کیا تو ہم خسارے میں چلے جائیں گے۔

بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے عرض کرنے لگے، اے موسیٰ! ہماری توبہ کیسے قبول ہو گی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، تم ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ ایک دوسرے کو قتل کرنا اور توبہ کرنا تمہارے رب کے نزدیک بہتر ہے، انہوں نے کہا کہ ہم ایسا کریں گے، وہ اس طرح برضا و خوشی قتل ہونے کے لیے تیار ہو گئے، چنانچہ جب صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے باقی ماندہ بارہ ہزار لوگوں کو جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو تلواروں اور خنجروں کے ساتھ قتل کریں، لوگ اپنے گھروں سے نکل نکل کر صحنوں میں بیٹھ رہے تھے، ایک دوسرے کو کہتے جاتے تھے کہ یہ تمہارے بھائی

ہیں، تمہارے پاس تلواریں لہراتے ہوئے آئیں گے، پس تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو، جو شخص اپنی جگہ سے اٹھے گا یا بھاگے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی، چنانچہ جتنا جس قدر کوئی کسی کا قریبی رشتہ دار تھا وہ اپنے ہاتھ سے اپنے رشتہ دار کو قتل کر رہا تھا، باپ بیٹے کو، بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو۔

جمعہ کے دن سورج نکلنے کے وقت سے لے دوپہر تک انہوں نے قتل و قتال کا یہ سلسلہ جاری رکھا، اللہ تعالیٰ نے ایسا اندھیرا طاری کر دیا تھا کہ کوئی کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا، چنانچہ قتل ہونے والوں کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی، تورات کے مطابق تین ہزار لوگ قتل ہوئے، جب ستر ہزار لوگ قتل کر دیے گئے تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر رحمت نازل فرمادی، ایسا ہوا کہ اب تلواریں چلانے والے تلواریں چلاتے تو ان کی تلواروں نے کاٹنا بند کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو اطلاع دی کہ رحمت نازل ہوگئی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو بتایا کہ رحمت نازل ہوچکی ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے ایک منادی کو حکم دیا، جس نے آواز دی کہ تلواریں اپنے بھائیوں سے اٹھالو، اللہ تعالیٰ نے قتل ہونے والوں کو شہید قرار دیا ہے، زندوں کی اللہ نے توبہ قبول کرلی ہے، جنہوں نے قتل پر صبر کیا مگر انہیں قتل نہیں کیا گیا تو انہیں معاف کر دیا ہے، جو لوگ موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے مر گئے تھے اور وہ بچھڑے کی پوجا میں مبتلا ہوگئے تھے وہ دوزخ میں جائیں گے، جو قتل ہونے سے بھاگا اس پر اللہ نے لعنت کر دی ہے، ذلت اور پھٹکار اس پر ڈال دی گئی ہے۔

ان کا ایک دوسرے کو قتل کرنا عجیب طرح کا تھا کہ ایک شخص اپنے لوگوں میں آتا اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے تھے، دس آدمیوں میں سے تین کو قتل کر دیتا تھا، باقیوں کو چھوڑ دیتا تھا، اسی طرح بیس میں سے پانچ کو قتل کر دیتا تھا اور ان کو بھی مار دیتا تھا جن پر شہادت لکھی ہوئی تھی، ان کو چھوڑ دیتا تھا جن کے قتل کا فیصلہ نہیں ہوا ہوتا تھا، یوں اللہ نے سب کو نہیں قتل کروایا تاکہ بچ جانے والے اللہ کی اس عظیم نعمت کو یاد رکھیں کہ وہ اس بری طرح قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔

یہاں تک مروی ہے کہ ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ قتل کی کیا صورت ہو گی ؟ توانہوں نے فرمایا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھیں گے اور جنہوں نے نہیں کی تھی وہ انہیں قتل کریں گے، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں ایک کالا بادل طاری کر دوں گا جس سے یہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے، جب یہ سیاہ بادل بلند ہوا تو موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، اتنی دیر دعا مانگی کہ وہ تھک گئے تو یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ موسیٰ اللہ سے رحم کی دعا کیجیے، کئی ان کے ہاتھ تھام رہے تھے تا کہ آپ اللہ سے دعا کریں۔

موسیٰ علیہ السلام غم گین بھی ہوئے، اللہ نے پوچھا، موسیٰ کس وجہ سے غم گین ہو؟ ان کے قتل ہونے کی وجہ سے ؟ یہ تو کوئی غم زدہ ہونے والی بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ میرے پاس زندہ ہوں گے ان کو رزق دیا جائے گا، جو باقی رہیں گے ان کی توبہ میں قبول کروں گا، اس بات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خوش ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ يَا مُوسىٰ أَمَا يُرضِيكَ أَنِّي أَدخَلتُ القَاتِلَ وَالمَقتُولَ الجَنَّةَ؟ قَالَ: بَلىٰ يَارَبِّ، موسیٰ! کیا تو راضی ہے کہ میں قاتل اور مقتول دونوں کو جنت میں داخل کر دوں ؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، اے میرے رب! (الھدایہ الی بلوغ النھایہ) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی کتاب قصص الانبیاء میں لکھتے ہیں ثُمَّ سَارَ بِهِمْ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ مُتَوَجِّهًا نَحْوَ الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ، وَأَخَذَ الْأَلْوَاحَ بَعْدَ مَا سَكَتَ عَنْهُ الْغَضَبُ (قصص الانبیاء ج ۲) پھر موسیٰ انہیں لے کر بیت المقدس کی طرف چلے، غصہ تھمنے کے بعد تختیاں لے لیں۔

بچھڑے کو تہس نہس کرنے، تباہ و برباد کرنے، اس کے تار پود بکھیرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلال کم ہوا، غصہ ٹھنڈا ہوا تو ان تختیوں کو اپنے دست مبارک میں لیا، جو وہ طور سے اپنی قوم کے لیے لے کر آئے تھے، ان میں جو احکامات اور وظائف تھے ان کے بارے میں اپنی قوم کو آگاہ کیا تو وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو گئے کہ اس میں جو احکامات ہیں یہ تو بہت مشکل ہیں، چنانچہ جب انہوں نے پس و پیش سے کام لیا تو اللہ نے یہی طور پہاڑ اٹھوا کر ان کے اوپر کھڑا کر دیا، یہ اس خوفناک

منظر کو دیکھ کر گھبرا گئے تختیاں اپنے داہنے ہاتھوں میں لے کر طور پہاڑ کو دیکھنے لگے اور موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کا اعلان کر دیا۔

مباہلہ کی دعوت

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر بیان کریں

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۹۴) البقرہ

جواب ترجمہ: کہہ دو اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر خصوصیت کے ساتھ سوائے اور لوگوں کے تمہارے ہی لئے ہے تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان یہودیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زبانی پیغام دیا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو مقابلہ میں آؤ ہم تم مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اسے ہلاک کر دے۔ لیکن ساتھ ہی پیشین گوئی بھی کر دی کہ یہ لوگ ہرگز اس پر تیار نہیں ہوں گے چنانچہ یہی ہوا کہ یہ لوگ مقابلہ پر نہ آئے اس لئے کہ وہ دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آسمانی کتاب قرآن کریم کو سچا جانتے تھے اگر یہ لوگ اس اعلان کے تحت مقابلہ میں نکلتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ روئے زمین پر ایک یہودی بھی باقی نہ رہتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَلَوْ أَنَّ الْيَهُودَ تَمَنَّوُا الْمَوْتَ، لَمَاتُوا، وَرَأَوْا مَقَاعِدَهُمْ مِنَ النَّارِ، وَلَوْ خَرَجَ الَّذِينَ يُبَاهِلُونَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَرَجَعُوا لَا يَجِدُونَ مَالًا وَلَا أَهْلًا اگر یہود موت کی آرزو کرتے تو مر جاتے اور اپنے ٹھکانے دوزخ میں دیکھ لیتے، اگر وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے نکلتے تو واپسی پر اپنا مال دیکھتے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کو دیکھتے۔ (مسند احمد)

سورۃ جمعہ میں بھی اسی طرح کی دعوت انہیں دی گئی ہے قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ* وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ* قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ} [الْجُمُعَةِ: ٦-٨]

فرمادیجیے، اے وہ لوگو جو یہودی ہوگئے ہو اگر تمہارا خیال ہے کہ بے شک تم اور لوگوں کے علاوہ اللہ کے دوست ہو تو پس تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو، انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے وہ موت کی تمنا نہیں کریں گے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے، فرمادیجیے، جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمہیں پہنچ کر رہے گی، پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

یہودی اور نصرانی اپنے کو اللہ کی اولاد اور اللہ کے دوست سمجھتے تھے، اسی کا ذکر ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ:۱۸) اور یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم تو اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا دعویٰ تھا کہ ہمارے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جاسکتا۔ ارشاد ہے لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى (البقرۃ:۱۱۱) جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جائیں گے، اس لئے انہیں کہا گیا کہ آؤ اس کا فیصلہ اس طرح کرلیں کہ دونوں فریق میدان میں نکل کر اللہ سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو ہلاک کردے، لیکن چونکہ اس جماعت کو اپنے جھوٹ کا علم تھا اس لئے تیار نہ ہوئی اور اس کا جھوٹ سب پر کھل گیا، اسی طرح جب نجران کے نصرانی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، بحث مباحثہ ہو چکا تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ

وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ [آلِ عِمْرَانَ: ٦١]

پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقتِ حال تو معلوم ہو ہی چلی ہے تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا والتجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

اس کھلے چیلنج کے باوجود وہ لوگ پس وپیش سے کام لینے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہرگز اس نبی سے مباہلہ نہ کرو اگر تم نے ان سے مباہلہ کیا تو تم برباد ہو جاؤ گے، چنانچہ مباہلہ سے انکار کر دیا جھک کر صلح کر لی اور دب کر جزیہ دینا منظور کر لیا، آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ امین بنا کر بھیج دیا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں چنانچہ دعوتِ مباہلہ سُن کر وفدِ نجران نے مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے جواب دینگے، آخر مجلسِ مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کُن باتیں کہی ہیں تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں، پس ایک نبی سے مباہلہ وملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہ ہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب الٰہی سے نہ بچے اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے، بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں، کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں۔

یہ ہی تجویز پاس کر کے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے، آپ ﷺ حضرت حسن، حسین، فاطمہ، علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لئے باہر تشریف لا رہے تھے، یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا، آخر انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے، حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا، ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ (تفسیر عثمانی)

عمر کی طولانی عذاب ربّانی سے بچا نہیں سکتی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۹۵) وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۹۶) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (ہم بتائے دیتے ہیں کہ) انہوں نے اپنے جو کرتوت آگے بھیج رکھے ہیں، ان کی وجہ سے یہ کبھی ایسی تمنا نہیں کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (بلکہ) یقیناً تم ان لوگوں کو پاؤ گے کہ انہیں زندہ رہنے کی حرص دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے، یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں کا ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک ہزار سال عمر پائے، حالانکہ کسی کا بڑی عمر پالینا اسے عذاب سے دور نہیں کر سکتا۔ اور یہ جو عمل بھی کرتے ہیں اللہ اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

موت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کا ذریعہ ہے، مگر یہود دنیا کی حرص وہوس کے باعث موت کی تمنا نہیں کر سکتے، ان کی کوتاہ اعمالیاں اور سیاہ بختیاں جو ملائکہ لکھ کر آگے روانہ کر چکے ہیں ان کو پیش

نظر رکھتے ہوئے یہ موت کی تمنا نہیں کرتے۔

باقی کافروں کی بہ نسبت یہود دنیا کے زیادہ لالچی ہیں، انہیں ہر وقت دنیاوی اغراض وسامان آرائش کی فکر رہتی ہے۔ قرآن کریم نے ان کی درست نقشہ کشی فرمائی ہے کہ ان میں ایک ایک شخص ہوس دنیا کی خاطر ہزاروں سال زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے، اللہ فرماتے ہیں اگر ان کی اتنی لمبی عمر ہو بھی جائے تو عمر کی طوالت انہیں عذاب سے بچا نہیں سکتی، کسی کی بڑی عمر اللہ کے عذاب کو ٹال نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں ان کی کوتاہ بختیاں اور بد اعمالیاں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں حیرت واستبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے اس لئے وہ اگر طول عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں رہنے کی تمنا کریں یہ ہے حیرت وتعجب کی بات، پس باوجود اعتقاد آخرت کے طول عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اُخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی۔ (بیان القرآن)

یہود کی طرف سے سوالات کی بوچھاڑ اور جبریل

سوال ان آیات مبارکات کی تفسیر کریں

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۹۷) مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ (۹۸) البقرہ

جواب ترجمہ: کہہ دو کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو (اس کو غصے میں مر جانا چاہئے) اس نے تو (یہ

کتاب) خدا کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کی ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے، جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا خدا دشمن ہے۔

امام جعفر طبری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں اس پر تمام مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو اپنا دوست بتایا تھا اس وقت ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی لیکن بعض کہتے ہیں کہ امر نبوت کے بارے میں جو گفتگو ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔ بعض کہتے ہیں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کا جو مناظرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں ہوا تھا اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہودیوں کی ایک جماعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوال کرتے ہیں جن کے صحیح جواب نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اگر آپ سچے نبی ہیں تو ان کے جوابات دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہتر ہے جو چاہو پوچھو، مگر عہد کرو کہ اگر میں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا، تو تم میری نبوت کا اقرار کر لو گے اور میری فرمانبرداری کے پابند ہو جاؤ گے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا اور عہد دیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح اللہ جل شانہ کی شہادت کے ساتھ ان سے پختہ وعدہ لے کر انہیں سوال کرنے کی اجازت دی۔

انہوں نے کہا پہلے تو یہ بتائیے کہ تورات نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس پر کس چیز کو حرام کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

نَشَدْتُكُمْ بِالَّذِي أَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلَى مُوسَى، هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ إِسْرَائِيلَ يَعْقُوبَ مَرِضَ مَرَضًا شَدِيدًا فَطَالَ سَقَمُهُ مِنْهُ، فَنَذَرَ لِلَّهِ نَذْرًا لَئِنْ عَافَاهُ اللَّهُ مِنْ سَقَمِهِ لَيُحَرِّمَنَّ أَحَبَّ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ إِلَيْهِ، وَكَانَ أَحَبُّ الطَّعَامِ إِلَيْهِ لُحُومَ الْإِبِلِ وَأَحَبُّ الشَّرَابِ إِلَيْهِ أَلْبَانَهَا؟

جب حضرت یعقوب علیہ السلام ایک بیماری (عرق النساء) میں سخت بیمار ہوئے تو نذر مانی کہ اگر اللہ مجھے اس مرض سے شفا دے تو میں اپنی کھانے کی سب سے زیادہ مرغوب چیز اور سب سے زیادہ محبوب چیز پینے کی چھوڑ دوں گا، جب تندرست ہو گئے تو اونٹ کا گوشت کھانا اور اونٹنی کا دودھ پینا جو آپ علیہ السلام کو پسند خاطر تھا چھوڑ دیا۔ تمہیں اللہ کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری بتاؤ یہ سچ ہے؟ ان سب نے قسم کھا کر کہا کہ ہاں آپ نے سچ فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ان پر گواہ رہنا۔

اچھا اب ہم پوچھتے ہیں کہ عورت مرد کے پانی کی کیا کیفیت ہے؟ اور کیوں کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وَأَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الذِی لَا إِلٰهَ إِلَّا هو، الَّذِی أَنزَلَ التَّوْرَاةَ عَلَى مُوسَى، هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ مَاءَ الرَّجُلِ أَبْيَضُ غَلِيظٌ، وَأَنَّ مَاءَ الْمَرْأَةِ أَصْفَرُ رَقِيقٌ، فَأَيُّهُمَا عَلَا كَانَ لَهُ الْوَلَدُ وَالشَّبَهُ بِإِذْنِ اللّٰهِ، وَإِذَا عَلَا مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَ الْمَرْأَةِ كَانَ الْوَلَدُ ذَكَرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ، وَإِذَا عَلَا مَاءُ الْمَرْأَةِ مَاءَ الرَّجُلِ كَانَ الْوَلَدُ أُنْثَى بِإِذْنِ اللّٰهِ؟

سنو مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور زردی مائل ہوتا ہے جو بھی غالب آجائے اسی کے مطابق پیدائش ہوتی ہے اور شبیہ بھی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجائے تو حکم الٰہی سے بیٹا پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجائے تو حکمِ الٰہی سے اولاد لڑکی ہوتی ہے، تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں سچ بتاؤ میرا جواب صحیح ہے؟ سب نے قسم کھا کر کہا: بیشک آپ نے سچ ارشاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ان پر گواہ رہنا۔

انہوں نے کہا اچھا یہ فرمائیے کہ تورات میں جس نبی امی کی خبر ہے اس کی خاص نشانی کیا ہے؟ اور اس کے پاس کونسا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَأَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الذِی أَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلَى مُوسَى، هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ هٰذَا النَّبِیَّ الْأُمِّیَّ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ؟ اس نبی کی خاص نشانی

یہ ہے کہ اس کی آنکھیں جب سوئی ہوئی ہوں اس وقت میں اس کا دل جاگتا رہتا ہے تمہیں اس رب کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی بتاؤ تو میں نے ٹھیک جواب دیا؟

سب نے قسم کھا کر کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل صحیح جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! اس پر گواہ رہنا۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ ہمارے اس سوال کا جواب دیں کہ فرشتوں میں سے آپ کا دوست کونسا فرشتہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَإِنَّ وَلِيِّي جِبْرِيلُ، وَلَمْ يَبْعَثِ اللَّهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا وَهُوَ وليُّه میرا دوست جبریل علیہ السلام ہے، اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا اس کے پاس وحی جبریل علیہ السلام ہی لاتے رہے، سچ کہو اور قسم کھا کر کہو کہ میرا یہ جواب بھی درست ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس لیے ہم آپ سے جدا ہو رہے ہیں، اگر جبریل علیہ السلام کے علاوہ کوئی فرشتہ آپ کا دوست ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ میری تصدیق کرنے سے تمہیں کون سی چیز روکتی ہے؟ انہوں نے کہا: جبریل ہمارا دشمن ہے۔

ایک روایت کے مطابق انہوں نے روح کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں حضرت جبریل علیہ السلام کا نام لے لیا، جس پر انہوں نے کہا کہ جبریل علیہ السلام ہمارا دشمن ہے، وہ سختی اور خون ریزی وغیرہ لے کر آتا رہتا ہے اس لئے ہم اس کی نہیں مانیں گے نہ آپ کی مانیں گے، ہاں! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت میکائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے جو رحمت، بارش، پیداوار وغیرہ لے کر آتے ہیں اور ہمارے دوست ہیں تو ہم آپکی تابعداری اور تصدیق کرتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَلَكٌ مِنْ مَلَائِكَةِ اللَّهِ، عَزَّ وَجَلَّ، مُوَكَّلٌ بِالسَّحَابِ بِيَدَيْهِ-أَوْ فِي يَدِهِ-مِخْرَاقٌ مِنْ نَارٍ يَزْجُرُ بِهِ السَّحَابَ، يَسُوقُهُ حَيْثُ أَمَرَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ رعد اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے، بادلوں کو ہانکنا اس کی ذمہ داری ہے، اس کے ہاتھوں میں یا اس کے ایک ہاتھ میں آگ کی تلوار ہوتی ہے جس سے وہ بادلوں کو جھڑکتا ہے اور جہاں اللہ چاہتا ہے انہیں ہانک کر لے جاتا ہے۔ انہوں نے کہا

یہ گرج کی آواز کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اسی فرشتے کی آواز ہے۔ (مسند احمد)

ایک روایت میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے اس وقت حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں تھے اور یہودیت پر قائم تھے۔ انہوں نے جب آپ ﷺ کی آمد کی خبر سنی تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا نبی کریم ﷺ یہ فرمایئے کہ قیامت کی پہلی شرط کیا ہے؟ اور جنتیوں کا پہلا کھانا کیا ہے؟ اور کونسی چیز بچہ کو کبھی ماں کی طرف کھینچتی ہے اور کبھی باپ کی طرف۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان تینوں سوالوں کے جواب ابھی ابھی جبریل علیہ السلام نے مجھے بتلائے ہیں سنو، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرف سے کیے جانے والے سوالوں کے جواب دینے شروع کیے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ إِلَى الْمَغْرِبِ، پہلی نشانی قیامت کی ایک آگ ہے جو لوگوں کے پیچھے لگے گی اور انہیں مشرق سے مغرب کی طرف اکٹھا کر دے گی۔ وَأَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ الْحُوتِ، جنتیوں کی پہلی خوراک مچھلی کی کلیجی بطور ضیافت ہو گی۔ وَإِذَا سَبَقَ مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَ الْمَرْأَةِ نَزَعَ الْوَلَدُ، وَإِذَا سَبَقَ مَاءُ الْمَرْأَةِ [مَاءَ الرَّجُلِ] نَزَعَتْ، جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کر جاتا ہے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی سے سبقت لے جاتا ہے تو لڑکی ہوتی ہے۔

یہ جواب سنتے ہی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے اور پکار اٹھے أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ، پھر کہنے لگے یا رسول اللہ! یہودی بڑے بہتان تراش لوگ ہیں، اگر انہیں میرا اسلام لانا پہلے معلوم ہو جائے گا تو وہ مجھ پر بہتان تراشی کریں گے، آپ ﷺ پہلے انہیں ذرا قائل کر لیجئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ کے پاس جب یہودی آئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تم میں کیسے شخص ہیں؟ انہوں نے کہا، بڑے بزرگ اور دانشور آدمی ہیں، بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں، وہ تو ہمارے سردار ہیں اور سرداروں کی اولاد میں سے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اگر وہ مسلمان ہو جائیں پھر تو تمہیں اسلام قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو گا؟ کہنے لگے اللہ تعالیٰ اسے اپنی پناہ میں رکھے مسلمان ہونے سے، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو اب تک چھپے ہوئے تھے باہر آ گئے اور زور سے کلمہ پڑھا۔ تو تمام کے تمام کہنے لگے یہ برا ہے، یہ برے شخص کا بیٹا ہے، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی برائیاں گننے لگے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! اسی چیز کا مجھے ڈر تھا۔ (بخاری) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کا نام عبد اللہ ہے، میکائیل علیہ السلام کا نام عبید اللہ ہے، ایل اللہ کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی الٹ بھی کئے ہیں، وہ کہتے ہیں ایل کے معنی عبد کے ہیں اور اس سے پہلے کے الفاظ اللہ کے نام ہیں، جیسے عربی میں عبد اللہ، عبد الرحمٰن، عبد الملک، عبد القدوس، عبد السلام، عبد الکافی، عبد الجلیل وغیرہ، لفظ عبد ہر جگہ باقی رہا اور اللہ کے نام بدلتے رہے اس طرح ایل ہر جگہ باقی ہے اور اللہ کے اسماء حسنیٰ بدلتے رہتے ہیں۔ غیر عربی زبان میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں، اسی قاعدے کے مطابق ان ناموں میں بھی ہے جیسے جبریل علیہ السلام میکائیل علیہ السلام اسرافیل علیہ السلام عزرائیل علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یہودیوں کے مجمع میں کبھی کبھی چلا جایا کرتا تھا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کس طرح قرآن تورات کی اور تورات قرآن کی سچائی کی تصدیق کرتی ہے؟ یہودی بھی مجھ سے محبت ظاہر کرنے لگے اور اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی، ایک دن میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا تو راستے سے نبی کریم ﷺ نکلے، انہوں نے مجھ سے کہا تمہارے نبی ﷺ وہ جا رہے ہیں۔ میں نے کہا میں ان کے پاس جاتا ہوں لیکن تم یہ تو بتاؤ تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، اس کی ذات کو سامنے رکھو، اس

کی نعمتوں کا خیال کرو، اللہ تعالیٰ کی کتاب تم میں موجود ہے رب کی قسم کھا کر بتاؤ کیا تم رسول کریم ﷺ کو رسول نہیں مانتے؟ اب سب خاموش ہو گئے۔

ان کے بڑے عالم نے جو ان سب میں علم میں بھی کامل تھا اور سب کا سردار بھی تھا، اس نے کہا اس شخص نے اتنی سخت قسم دی ہے، تم صاف اور سچا جواب کیوں نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا حضرت آپ ہی ہمارے بڑے ہیں ذرا آپ ہی جواب دیجئے۔ اس بڑے پادری نے کہا سنئے جناب! آپ نے زبردست قسم دی ہے لہذا سچ تو یہی ہے کہ ہم دل سے جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، میں نے کہا افسوس جب یہ جانتے ہو تو پھر مانتے کیوں نہیں کہا؟

انہوں نے کہا کہ صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس آسمانی وحی لے کر آنے والے جبریل علیہ السلام ہیں، جو نہایت سختی، تنگی، شدت، عذاب اور تکلیف کے فرشتے ہیں ہم ان کے اور وہ ہمارے دشمن ہیں، اگر وحی لے کر حضرت میکائیل علیہ السلام آتے جو رحمت و رافت تخفیف و راحت والے فرشتے ہیں تو ہمیں ماننے میں تامل نہ ہوتا۔

میں نے کہا اچھا بتاؤ تو ان دونوں کی اللہ کے نزدیک کیا قدر و منزلت ہے؟ انہوں نے کہا ایک تو اللہ تعالیٰ کے ایک طرف ہے اور دوسرا دوسری طرف، میں نے کہا اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں جو ان میں سے کسی کا دشمن ہو۔ اس کا دشمن اللہ بھی ہے اور دوسرا فرشتہ بھی، کیونکہ جبریل علیہ السلام کے دشمن سے میکائیل علیہ السلام دوستی نہیں رکھ سکتے اور میکائیل علیہ السلام کا دشمن جبریل علیہ السلام کا دوست نہیں ہو سکتا، نہ ان میں سے کسی ایک کا دشمن اللہ تعالیٰ کا دوست ہو سکتا ہے نہ ان دونوں میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر زمین پر آسکتا ہے نہ کوئی کام کر سکتا ہے، واللہ مجھے نہ تم سے لالچ ہے نہ خوف، سنو! جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا دشمن ہو تو اس کافر کا اللہ تعالیٰ بھی دشمن ہے، اتنا کہہ کر میں چلا آیا، نبی کریم

ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: اے ابن خطاب! مجھ پر تازہ وحی نازل ہوئی ہے، میں نے کہا یا رسول اللہ! سنایئے، آپ ﷺ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، یہی باتیں ابھی ابھی یہودیوں سے میری ہو رہی تھیں، میں تو چاہتا ہی تھا بلکہ اسی لئے حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو اطلاع کروں مگر میرے آنے سے پہلے سننے دیکھنے والے اللہ نے آپ کو خبر پہنچادی۔ (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر ج ۱)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام اللہ کے امین فرشتے ہیں، اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کے دل پر اللہ کی وحی پہنچانے پر مقرر ہیں، وہ فرشتوں میں سے اللہ کے رسول ہیں کسی ایک رسول سے دشمنی رکھنے والا سب رسولوں سے دشمنی رکھنے والا ہوتا ہے جیسے ایک رسول پر ایمان سب رسولوں پر ایمان لانے کا نام ہے اور ایک رسول کے ساتھ کفر تمام نبیوں کے ساتھ کفر کرنے کے برابر ہے، خود اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کے نہ ماننے والوں کو کافر فرمایا ہے۔

اسی طرح جبریل علیہ السلام کا دشمن اللہ کا دشمن ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آتے قرآن فرماتا ہے کہ وہ تو اللہ کے حکم کے سوا نہیں اترتے، یہ قرآن اللہ کی طرف سے اتارا جاتا ہے جسے لے کر روح الامین علیہ السلام آتے ہیں اور آپ ﷺ کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو ہوشیار کر دیں۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے اپنے رسول چن لیتا ہے، جبریل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام بھی فرشتوں میں ہیں، لیکن ان کا خصوصاً نام لیا تاکہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے اور یہ بھی جان لیں کہ ان میں سے ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن ہے بلکہ اللہ بھی اس کا دشمن ہے، حضرت میکائیل علیہ السلام بھی کبھی انبیاء کے پاس آتے رہے ہیں جیسا کہ نبی ﷺ کے ساتھ شروع شروع میں تھے لیکن اس کام پر مقرر حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جیسے حضرت میکائیل علیہ السلام روئیدگی ارزاق وغیرہ پر اور جیسے حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے پر۔

واضح نشانیوں کا فاسق انکار کرتے ہیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ (۹۹) أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۰) البقرہ

جواب ترجمہ: اور بیشک ہم نے آپ پر ایسی آیتیں اتاری ہیں جو حق کو آشکارہ کرنے والی ہیں، اور ان کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو نافرمان ہیں۔ یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ ان لوگوں نے جب کوئی عہد کیا، ان کے ایک گروہ نے اسے ہمیشہ توڑ پھینکا؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان لاتے ہی نہیں۔

ابن صوریا یہودی نے حضرت سرور عالم ﷺ سے کہا کہ اے محمد! کوئی ایسی چیز آپ نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوتے اور نہ آپ ﷺ کے پاس ایسی کوئی کھلی ہوئی دلیل ہے جس کی وجہ سے ہم آپ ﷺ کا اتباع کرلیں، اس کی تردید میں اللہ جل شانہ، نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ہم نے اے محمد! تمہاری طرف واضح آیات نازل فرمائی ہیں جو آیات بینات ہیں، ان آیات میں یہود کی پوشیدہ باتیں ان کے بھید اور راز بیان کرنا ان کے گزرے ہوئے اسلاف کے حالات بتانا اور ان کی تحریفات کا پتہ دینا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل شانہ، نے حضرت سرور عالم ﷺ پر ظاہر فرمایا اور اپنی کتاب میں نازل فرمایا جو شخص انصاف پسند ہو حسد اور جلن کی وجہ سے اپنی جان ہلاک کرنے پر تل نہ گیا ہو اس کے لیے یہ دلائل کافی اور وافی ہیں، لیکن اگر کسی کو حق اور حقیقت سے بغض اور عناد ہو اور حکم عدولی ہی جس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور فسق اس کی طبیعت میں رچ بس گیا ہو وہی ان آیات بینات کا منکر ہو سکتا ہے۔

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا: حضرت سرور عالم ﷺ نے یہودیوں کو تذکیر فرمائی اور جو ان سے میثاق اور قول و قرار لیا گیا تھا وہ ان کو یاد دلایا اور خاتم النّبیین ﷺ کے بارے میں جو ان سے عہد لیا گیا تھا اس

کی یاد دہانی فرمائی تو وہ صاف منکر ہوگئے، ان میں ایک آدمی مالک بن سیف تھا اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! محمد ﷺ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوا عَهْدًا یعنی یہ لوگ اس عہد سے منکر ہو رہے ہیں اور حال ان کا یہ رہا ہے کہ جب کبھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک جماعت نے اس کو پھینک دیا ان کا یہ مزاج ہے اور نقض عہد کی عادت ہے۔ (انوار البیان

واؤ سے پہلے معطوف علیہ حذف ہے اور عبارت یوں ہے۔ اَكَفَرُوا بِالْآيَاتِ وَ كُلَّمَا عَاهَدُوا وَهُوَ مِن عَطفِ الفِعلِيَةِ عَلَى الفِعلِيَةِ۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ ان کی پرواہ نہ کریں اور ان کی مخالفت کو اپنے دل کا بوجھ نہ بنائیں، آخر میں فرمایا بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے، بعض یہودی مسلمان ہوگئے تھے اس لیے فرمایا کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔ (روح المعانی بحوالہ انوار البیان)

یہودیوں نے تورات پر عمل کرنا کیوں چھوڑا؟

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۱) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغمبر (آخر الزمان ﷺ) آئے اور وہ ان کی (آسمانی) کتاب کی تصدیق بھی کرتے ہیں تو جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک جماعت نے خدا کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں۔

یہاں رسول سے سید دوعالم حضرت نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس مراد ہے، آپ ﷺ تورات، زبور کی تصدیق فرماتے تھے، خود ان کتب میں بھی نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی

بشارتیں موجود تھیں، آپ ﷺ کی صفات، آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا ان کتب میں ذکر موجود تھا، آپ ﷺ کا تشریف لانا ہی ان کتابوں کی تصدیق تھا۔

تو آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ان یہود و نصاریٰ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنے نبی پر آنے والی کتابوں پر پختہ یقین کر لیتے، مگر عناد اور بغض نے انہیں اپنی کتابوں پر بھی ایمان نہیں لانے دیا، انہوں نے اپنی کتابوں کے ساتھ بھی کفر کیا، جب آپ ﷺ تشریف لائے تو یہودیوں نے تورات سے قرآن کریم کو ملا کر دیکھا، جب انہوں نے دیکھا کہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہوا ہے وہی کچھ ہماری تورات میں بھی لکھا ہوا ہے تو انہوں نے تورات کو پڑھنا چھوڑ دیا۔

یہودیوں نے تورات کو ریشم و دیبا کے غلافوں میں لپیٹ کر، مزین و مرصع کر کے رکھ لیا مگر اس کے اندر جو کچھ لکھا ہوا تھا اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب ان لوگوں نے قرآن کریم اور تورات کا موازنہ کیا، دونوں ایک جیسی دکھائی دیں تو تورات کو بھی پس پشت ڈال کر جادو اور کہانت سیکھنا شروع کر دیا تھا۔

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود کے چار گروہ تھے، جیسے روح البیان میں علامہ اسماعیل حقی حنفی استنبولی رحمہ اللہ نے بھی ذکر فرمایا ہے کہ اصل میں یہود کے چار گروہ تھے۔

① ایک ان میں سے تورات پر ایمان لایا، اس نے تورات کے حقوق بھی ادا کیے، یہ ایمان والے اہل کتاب ہیں، ان کی تعداد تھوڑی ہے، قرآن کریم کی آیت بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ، میں اسی فرقے کا ذکر ہے۔ ② دوسرا فرقہ وہ ہے جس نے علی الاعلان تورات کے فرامین توڑے، اس کی حدود سے باہر نکلے اور سرکشی اور تمرد اختیار کیا، اس مقام پر جو فرمایا گیا کہ نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ انہوں نے کتاب کو پھینک دیا وہ یہی فرقہ ہے۔ ③ تیسرا فرقہ وہ ہے جس نے عہد شکنی کا اعلان تو نہیں کیا لیکن بربنائے جہالت عہد شکنی کرتے رہے، یہ فرقہ بڑی تعداد میں تھا۔ ④ چوتھے فرقے نے ظاہری طور پر احکام مانے مگر باطن میں بغاوت اور عناد سے مخالفت کرتے رہے یہ بتکلف جاہل بنتے تھے۔ (روح البیان ۱)

جادوٹونہ اور ہاروت وماروت کی آزمائش

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۱۰۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اور انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا، لیکن شیطانوں نے ہی کفر کیا، لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اس کی بھی جو شہر بابل میں ہاروت وماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا اور وہ کسی کو نہ سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، تو کافر نہ بن، پس ان سے وہ بات سیکھتے تھے، جس سے خاوند اور بیوی میں جدائی ڈالیں، حالانکہ وہ اس سے کسی کو اللہ کے حکم کے سوا کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور سیکھتے تھے وہ، جو ان کو نقصان دیتی تھی اور نہ نفع اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جس نے جادو کو خریدا اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ چیز بہت بری ہے، جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچا کاش وہ جانتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جب آپ بیت الخلاء جاتے تو اپنی بیوی حضرت جرادہ کو دے جاتے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا وقت آیا اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور

انگوٹھی طلب کی جو دے دی گئی، اس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا، تمام جنات وغیرہ حاضر خدمت ہو گئے حکومت کرنے لگا ادھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تو جھوٹا ہے، انگوٹھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام لے گئے، آپ نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے، ان دنوں میں شیاطین نے جادو، نجوم، کہانت، شعر و اشعار اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں، آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا۔

آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے، عمر طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے ان کی کرسی تلے دفن ہیں، چونکہ جنات اس کرسی کے پاس نہیں جاسکتے تھے اس لئے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں، بس ان کا چرچا ہو گیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز یہی تھا بلکہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو گئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو کھولا اور فرمان باری تعالیٰ نازل ہوا کہ جادوگری کا یہ کفر تو شیاطین کا پھیلایا ہوا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بری الذمہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا عراق سے! فرمایا عراق کے کس شہر سے؟ اس نے کا کوفہ سے! پوچھا وہاں کی کیا خبریں ہیں؟ اس نے کہا وہاں باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انتقال نہیں کر گئے بلکہ زندہ روپوش ہیں اور عنقریب آئیں گے آپ کانپ اٹھے اور فرمانے لگے اگر ایسا ہوتا تو ہم ان کی میراث تقسیم نہ کرتے اور ان کی عورتیں اپنا دوسرا نکاح نہ کرتیں، سنو! شیاطین آسمانی باتیں چرالایا کرتے تھے اور ان میں اپنی باتیں ملا کر لوگوں میں پھیلایا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ تمام کتابیں جمع کر کے اپنی کرسی تلے دفن کر دیں۔ آپ کے انتقال کے بعد جنات نے وہ پھر

نکال لیں وہی کتابیں عراقیوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان ہی کتابوں کی باتیں وہ بیان کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں، اسی کا ذکر اس آیت میں ہے۔

اس زمانہ میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ شیاطین غیب جانتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کتابوں کو صندوق میں بھر کر دفن کر دینے کے بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ جو یہ کہے گا اس کی گردن ماری جائے گی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جنات نے ان کتابوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد آپ کی کرسی تلے دفن کیا تھا اور ان کے شروع صفحہ پر لکھ دیا تھا کہ یہ علمی خزانہ آصف بن برخیا کا جمع کیا ہوا ہے، جو حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے وزیر اعظم مشیر خاص اور دلی دوست تھے۔

یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی نہ تھے بلکہ جادوگر تھے، اس بنا پر یہ آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ کے سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سچے نبی کی برأت کی اور یہودیوں کے اس عقیدے کو باطل قرار دیا، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام نبیوں کے زمرے میں سن کر بہت بدکتے تھے اس لئے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کر دیا۔

ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام موذی جانوروں سے عہد لیا تھا، جب انہیں وہ عہد یاد کرایا جاتا تھا تو وہ ستاتے نہ تھے، پھر لوگوں نے اپنی طرف سے عبارتیں بنا کر جادو کی قسم کے منتر بنا کر ان سب کو آپ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا، جس کا بطلان ان آیات کریمہ میں ہے۔ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں کا ہونا قرآن سے ثابت ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہونا بھی قرآن سے ظاہر ہے۔

داؤد علیہ السلام اور جالوت کے قصے میں ہے من بعد موسیٰ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے کہا تھا اِنَّمَا اَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِینَ یعنی تو جادو کئے گئے لوگوں میں سے ہے۔ یہودیوں کے اس دوسرے اعتقاد کی کہ جادو فرشتوں پر نازل ہوا ہے اس آیت میں تردید ہے، ہاروت، ماروت لفظ شیاطین کا بدل ہے تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے آیت اِن کَانَ لَهُ

اِخوَۃٌ میں یا اس لئے جمع کیا گیا کہ ان کے ماننے والوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور ان کا نام ان کی زیادہ سرکشی کی وجہ سے سرفہرست دیا گیا ہے، قرطبی رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ اس آیت کا یہی ٹھیک مطلب ہے اس کے سوا کسی اور معنی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہئے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جادو اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں۔ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان پر کوئی جادو نہیں اترا۔ اس بناء پر آیت کا ترجمہ اس طرح پر ہو گا کہ ان یہودیوں نے اس چیز کی تابعداری کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، نہ اللہ تعالیٰ نے جادو کو ان دو فرشتوں پر اتارا ہے (جیسے اے یہودیو! تمہارا خیال جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کی طرف ہے) بلکہ یہ کفر شیطانوں کا ہے، جو بابل میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور ان کے سردار دو آدمی تھے، جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی رحمہ اللہ اسے اس طرح پڑھتے تھے آیت وَمَا اُنزِلَ عَلَی المَلَکَینِ دَاوٗدَ وَسُلَیمَانَ یعنی داؤد و سلیمان دونوں بادشاہوں پر بھی جادو نہیں اتارا گیا، یا یہ کہ وہ اس سے روکتے تھے کیونکہ یہ کفر ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا زبردست رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں "ما" معنی میں الذی کے ہے اور ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں، جنہیں اللہ نے زمین کی طرف اتارا ہے اور اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان کے لئے انہیں جادو کی تعلیم دی ہے، لہٰذا ہاروت ماروت اس فرمان باری تعالیٰ کو بجالا رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی، تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر برے لوگ ہیں؟ کیسے نافرمان اور سرکش ہیں؟ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز اللہ کی نافرمانی نہ کرتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هَلُمُوا مَلَكَيْنِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ حَتَّى نُهْبِطَهُمَا إِلَى الْأَرْضِ، فَنَنْظُرَ كَيْفَ يَعْمَلَانِ؟ قَالُوا: بَرِّبِّنَا، هاروتَ وماروتَ. فَأُهْبِطَا إِلَى الْأَرْضِ ومثُلت لَهُمَا الزُّهَرة امْرَأَةً مِنْ أَحْسَنِ الْبَشَرِ، فَجَاءَتْهُمَا، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا فَقَالَتْ: لَا وَاللَّهِ حَتَّى تَتَكَلَّمَا بِهَذِهِ الْكَلِمَةِ مِنَ الْإِشْرَاكِ. فَقَالَا وَاللَّهِ لَا نُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا أَبَدًا فَذَهَبَتْ عَنْهُمَا ثُمَّ رَجَعَتْ بِصَبِيٍّ تَحْمِلُهُ، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا فَقَالَتْ: لَا وَاللَّهِ حَتَّى تَقْتُلَا هَذَا الصَّبِيَّ فَقَالَا لَا وَاللَّهِ لَا نَقْتُلُهُ أَبَدًا ثُمَّ ذَهَبَتْ فَرَجَعَتْ بِقَدَحِ خَمْرٍ تَحْمِلُهُ، فَسَأَلَاهَا نَفْسَهَا فَقَالَتْ: لَا وَاللَّهِ حَتَّى تَشْرَبَا هَذَا الْخَمْرَ فَشَرِبَا فَسَكِرَا، فَوَقَعَا عَلَيْهَا، وَقَتَلَا الصَّبِيَّ فَلَمَّا أَفَاقَا قَالَتِ الْمَرْأَةُ: وَاللَّهِ مَا تَرَكْتُمَا شَيْئًا أَبَيْتُمَاهُ عَلَيَّ إِلَّا قَدْ فَعَلْتُمَاهُ حِينَ سَكِرْتُمَا. فخيرا بَيْنَ عَذَابِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ، فَاخْتَارَا عَذَابَ الدُّنْيَا (احمد)

اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کر لو، میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں انسانوں میں بھیجتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ہاروت وماروت کو پیش کیا اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! بنی آدم کو تو میں نبیوں کے ذریعہ اپنے احکام پہنچاتا ہوں، لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، شراب نہ پینا، اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لئے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا، جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا، اس نے کہا: اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں، انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا وہ چلی گئی پھر آئی اور کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو، تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے، انہوں نے اسے بھی نہ مانا، وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو، انہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کر لیا، اب نشہ میں مست ہو کر زناکاری بھی کی اور اس بچے کو بھی قتل کر ڈالا، جب ہوش و حواس درست ہوئے، تو اس عورت نے کہا، جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، سب تم نے کر ڈالے، یہ نادم ہوئے انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کرو یا عذاب اخروی کو، انہوں نے دنیا کے عذاب

کو پسند کیا۔ (مسند احمد، تفسیر ابن کثیر)

بعض روایتوں میں ہے کہ جب ان دونوں فرشتوں سے یہ نافرمانیاں سرزد ہوئیں تب اور فرشتوں نے اقرار کر لیا کہ بنی آدم جو اللہ تعالیٰ سے دور ہیں اور بن دیکھے ایمان لاتے ہیں جن سے خطاؤں کا سرزد ہو جانا کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں، ان دونوں فرشتوں سے کہا گیا کہ اب یا تو دنیا کا عذاب پسند کر لو یا آخرت کے عذاب کو اختیار کر لو انہوں نے دنیا کا عذاب چن لیا، چنانچہ انہیں بابل میں عذاب ہو رہا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے تھے ان میں قتل سے اور مال حرام سے ممانعت بھی کی تھی اور یہ حکم بھی تھا کہ حکم عدل کے ساتھ کریں، یہ بھی وارد ہوا ہے کہ یہ تین فرشتے تھے لیکن ایک نے آزمائش سے انکار کر دیا اور واپس چلا گیا، پھر دو کی آزمائش ہوئی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، یہاں بابل سے مراد بابل دنباوند ہے اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیذخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا، یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی جب انہوں نے اس سے برائی کا ارادہ کیا تو اس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے، انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر اس نے کہا، مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو؟ انہوں نے یہ بھی بتا دیا، چنانچہ وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی، اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کبھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے، سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں پہلے پہل چند دنوں تک تو فرشتے ثابت قدم رہے، صبح سے شام تک فیصلہ عدل کے ساتھ کرتے رہتے، شام کو آسمان پر چڑھ جاتے، پھر زہرہ کو دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے، زہرہ

ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت مبارکہ کے ذیل میں مرفوع، موقوف روایات بیان کرنے کے بعد اس سارے منظر نامے کے بارے میں واضح فرمایا ہے کہ الغرض ہاروت ماروت کا یہ قصہ تابعین میں سے بھی اکثر لوگوں نے بیان کیا ہے جیسے مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابو العالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقتل بن حیان وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اور متقدمین اور متاخرین مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اسے نقل کیا ہے، لیکن اس کا زیادہ تر دار و مدار بنی اسرائیل کی کتابوں پر ہے، کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور نہ قرآن کریم میں اس قدر بسط و تفصیل ہے، پس ہمارا ایمان ہے کہ جس قدر قرآن میں ہے صحیح اور درست ہے اور حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (قرآن کریم کے ظاہری الفاظ مسند احمد، ابن حبان، بیہقی وغیرہ کی مرفوع حدیث حضرت علی حضرت ابن عباس بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ کی موقوف روایات تابعین وغیرہ کی تفاسیر وغیرہ ملا کر اس واقعہ کی بہت کچھ تقویت ہو جاتی ہے، نہ اس میں کوئی محال عقلی ہے، نہ اس میں کسی اصول اسلامی کا خلاف ہے، پھر ظاہر سے بے جا ہٹ کر تکلفات اٹھانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ واللہ اعلم (فتح البیان)

ابن جریر میں ایک غریب اثر اور ایک عجیب واقعہ ہے اسے بھی سنیے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد آپ کی تلاش میں آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر پا کر بے چین ہو کر رونے پیٹنے لگی، میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ہمیشہ ناچاقی رہا کرتی تھی، ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا، ایک بڑھیا سے میں نے یہ سب ذکر کیا، اس نے کہا جو میں کہوں وہ کر، وہ خود بخود تیرے پاس آجائے گا، میں تیار ہو گئی، وہ رات کے وقت دو کالے کتے لے کر میرے پاس آئی، ایک پر

وہ خود سوار ہوئی اور دوسرے پر میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں بابل پہنچ گئیں، میں نے دیکھا کہ دو شخص ادھر لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے میں جکڑے ہوئے ہیں، اس عورت نے مجھ سے کہا، ان کے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں، میں نے ان سے کہا، انہوں نے کہا، سن! ہم تو آزمائش میں ہیں، تو جادو نہ سیکھ، اس کا سیکھنا کفر ہے۔

میں نے کہا، میں تو سیکھوں گی، انہوں نے کہا، اچھا پھر جا اور اس تنور میں پیشاب کر کے چلی آ، میں گئی ارادہ کیا، لیکن کچھ دہشت سی طاری ہوئی، میں واپس آ گئی اور کہا میں فارغ ہو آئی ہوں، انہوں نے پوچھا، کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں، انہوں نے کہا، تو غلط کہتی ہے، ابھی تو کچھ نہیں بگڑا، تیرا ایمان ثابت ہے، اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر۔ میں نے کہا، مجھے تو جادو سیکھنا ہے، انہوں نے پھر کہا جا اور اس تنور میں پیشاب کر آ، میں پھر گئی، لیکن اب کی مرتبہ بھی دل نہ مانا، واپس آئی، پھر اسی طرح سوال جواب ہوئے، میں تیسری مرتبہ پھر تنور کے پاس گئی اور دل کڑا کر کے پیشاب کرنے کو بیٹھ گئی، میں نے دیکھا، کہ ایک گھوڑ سوار منہ پر نقاب ڈالے نکلا اور آسمان پر چڑھ گیا ہے، واپس چلی آئی، ان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ہاں! اب کی مرتبہ تو سچ کہتی ہے، وہ تیرا ایمان تھا، جو تجھ میں سے نکل گیا، اب جا چلی جا، میں آئی اور اس بڑھیا سے کہا، انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں سکھایا، اس نے کہا، بس تجھے کچھ آ گیا، اب تو جو کہے گی ہو جائے گا، میں نے آزمائش کے لئے ایک دانہ گیہوں کا لیا، اسے زمین پر ڈال کر کہا اگ جا وہ فوراً اگ آیا۔

میں نے کہا تجھ میں بال پیدا ہو جائے، چنانچہ ہو گئے، میں نے کہا سوکھ جا، وہ بال سوکھ گئے، میں نے کہا الگ الگ دانہ ہو جا، وہ بھی ہو گیا، پھر میں نے کہا سوکھ جا، تو سوکھ گیا، پھر میں نے کہا، آٹا بن جا، تو آٹا بن گیا، میں نے کہا روٹی پک جا، تو روٹی پک گئی، یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا اور مجھے اپنے بے ایمان ہو جانے کا صدمہ ہونے لگا، اے ام المومنین! قسم اللہ کی! نہ میں نے اس جادو سے کوئی کام لیا، نہ

کسی پر کیا، میں یونہی روتی پیٹتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئی کہ آپ ﷺ سے کہوں، لیکن افسوس بد قسمتی سے آپ کو بھی میں نے نہ پایا، اب میں کیا کروں؟ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی، سب کو اس پر ترس آنے لگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حیران تھے کہ اسے کیا فتویٰ دیں؟ آخر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تم اس فعل کو نہ کرو، توبہ اِستغفار کرو اور اپنے ماں باپ کی خدمت گزاری کرتی رہو۔

اللہ کے ہاں بہترین ثواب

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۱۰۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اگر وہ ایمان رکھتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کی طرف سے بہت ہی اچھا۔ کاش ان کو معلوم ہوتا!

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ یہودی جادو، سحر اور دوسری شیطانی حرکتوں کو چھوڑ کر نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر ایمان لے آتے اور بدیوں، برائیوں اور شر انگیزیوں کی بجائے تقویٰ، طہارت، للّٰہیت، خدا خوفی والی زندگی اختیار کرتے تو ان کے لیے یہ چیزیں اللہ کے ہاں سے ثواب واجر کا باعث بن جاتیں، اور اللہ کے ہاں بہترین اجر و ثواب ہے، اے کاش! انہیں اس بات کا علم ہوتا، وہ یقین کر لیتے کہ ایسا ہی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ یہاں تقویٰ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اَلِاحْتِرَازُ عَنْ فِعْلِ الْمَنْهِيَّاتِ وَتَرْكِ الْمَأْمُورَاتِ جن چیزوں سے اللہ کی طرف سے روکا گیا ہے ان سے گریز کرنا، ان سے رکنا، اور جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے انہیں بجالانا ہی تقویٰ ہے

امام بغوی رحمہ اللہ اس آیت کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَالْقُرْآنِ، وَاتَّقَوْا: الْيَهُودِيَّةَ وَالسِّحْرَ، اگر یہ لوگ حضرت محمد ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لاتے اور یہودیت اور جادوگری کو چھوڑ دیتے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کاموں کو اختیار کرنے کی بجائے ترک کرنے کی بناء پر اجر وثواب زیادہ اور بہتر ملتا۔ (تفسیر بغوی)

امام بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں کہ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِالرَّسُولِ وَالكِتَابِ.وَاتَّقَوْا بِتَرْكِ المَعَاصِي، كَنَبْذِ كِتَاب اللهِ وَاتِّبَاعِ السِّحر اگر یہ یہودی رسول کریم ﷺ اور کتاب اللہ پر ایمان لاتے اور گناہوں اور معاصی کو چھوڑتے جیسے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنا اور جادو کی پیروی کرنے کو تو اللہ کے ہاں ان کے لیے بہترین اجر تھا۔ (تفسیر بیضاوی)

غیر مسلموں کی مشابہت سے گریز لازم

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر فرمائیں

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۰۴) البقرہ)

جواب ترجمہ: اے اہل ایمان: راعنانہ کہو اور انظرنا کہو اور سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے یہود کی ان خباثتوں کو بیان کیا جو نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے کی تھیں، اب یہاں یہود کی ان خباثتوں میں سے ایک خباثت کا پردہ چاک کیا جارہا ہے جو انہوں نے آپ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کے ساتھ روا رکھی تھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کافروں کی بول چال اور ان کے کاموں کی مشابہت سے روک رہا ہے، یہودی بعض الفاظ زبان دبا کر بولتے تھے اور مطلب برا لیتے تھے، جب انہیں یہ کہنا ہوتا کہ ہماری سنئے تو کہتے تھے رَاعِنَا اور مراد اس سے رعونت اور سرکشی لیتے تھے، جیسے اور جگہ بیان

ہے مِنَ الَّذِينَ هَادُوا یعنی یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو باتوں کو اصلیت سے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم سنتے ہیں، لیکن مانتے نہیں، اپنی زبانوں کو موڑ توڑ کر اس دین میں طعنہ زنی کے لئے رَاعِنَا کہتے ہیں، اگر یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا ہماری بات سنئے اور ہماری طرف توجہ کیجئے تو یہ ان کے لئے بہتر اور مناسب ہوتا، لیکن ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ہے، اس میں ایمان بہت ہی کم ہے۔

احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جب یہ لوگ سلام کرتے ہیں تو السام علیکم کہتے ہیں اور سام کے معنیٰ موت کے ہیں تو تم ان کے جواب میں وعلیکم کہا کرو، ہماری دعا ان کے حق میں قبول ہو گی اور ان کی بد دعا ہمارے حق میں مقبول نہیں ہو گی، الغرض قول و فعل میں ان سے مشابہت کرنا منع ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۳۷۳)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةَ بِالسَّيْفِ، حَتَّى يُعبدَ اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ. وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي، وَجُعِلَتِ الذِّلَّةُ والصَّغارُ عَلَى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي، وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (مسند احمد بن حنبل)

میں قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں، یہاں تک کہ اللہ اکیلے، لاشریک کی عبادت کی جائے، میری روزی میرے نیزے کے سائے تلے رکھی گئی ہے، اس کے لئے ذلت اور پستی لکھ دی گئی ہے جو میرے احکام کے خلاف چلا کرے گا اور جو شخص کسی (غیر مسلم) قوم سے مشابہت کرے وہ انہی میں سے ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا گیا کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ منهم (ابوداؤد) اس آیت اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کفار کے اقوال وافعال لباس عید اور عبادت میں ان کی مشابہت کرنا، جو ہمارے لئے مشروع اور مقرر نہیں، سخت منع ہے، ایسا کرنے والوں کو شریعت میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ نے اسے فرمایا کہ إِذَا سَمِعْتَ

اللّٰہَ یَقُولُ {یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا} فَأَرْعِہَا سَمْعَکَ، فَإِنَّہُ خَیْرٌ یَأْمُرُ بِہِ أَوْ شَرٌّ یَنْہَی عَنْہُ (ابن ابی حاتم ج ا ص ۳۱۷، تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۳۷۴)

جب تم قرآن کریم میں آیت یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا سنو تو کان لگادو اور دل سے متوجہ ہو جایا کرو، کیونکہ یا تو کسی بھلائی کا حکم ہو گا یا کسی برائی سے ممانعت ہو گی۔

حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَا تَقْرَؤُونَ فِی الْقُرْآنِ: {یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا} فَإِنَّہُ فِی التَّوْرَاۃِ: یَا أَیُّہَا الْمَسَاکِینُ قرآن کریم میں ایمان والوں کو یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا کے ساتھ خطاب فرمایا، یہی خطاب بنی اسرائیل کے لیے جب اختیار کیا تو وہاں تورات میں یَا أَیُّہَا الْمَسَاکِینُ استعمال فرمایا۔ قرآن کریم میں اٹھاسی مقامات پر اللہ نے ایمان والوں کے لیے لفظ یَا أَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا استعمال فرمایا ہے، یہ اس بات پر دلالت ہے کہ جب اللہ نے اس امت کو دنیا میں ایمان کی دولت سے مالا مال کیا تو آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے عذابِ دوزخ سے امان عطاء فرمائیں گے، اسی طرح مومن کا لفظ اسماء اور صفات میں سب سے زیادہ عزت و شرافت والا لفظ ہے، تو جب اللہ نے ہمیں دنیا میں اس لفظ سے مخاطب فرمایا تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے آخرت میں بھی ہمارے ساتھ بہتر معاملہ کرے گا۔ یہود کے لیے جب دنیا میں یَا أَیُّہَا الْمَسَاکِینُ استعمال فرمایا تو یہ دلالت ہے اس بات پر کہ ان پر ذلت اور مسکنت دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں ڈال دی گئی ہے۔

راعنا کے معنی ہماری طرف کان لگانے کے ہیں بروزن عاطنا۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے معنیٰ خلاف کے بھی ہیں، یعنی خلاف نہ کہا کرو، اُن سے یہ بھی مروی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری سنئے اور ہم آپ کی سنیں، یہ انصار کی زبان کا لفظ تھا مگر اللہ نے انہیں بھی یہ لفظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بولنے سے روک دیا تھا، حالانکہ وہ ازروئے بے ادبی نہیں کہتے تھے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں، راعن مذاق کی بات کو کہا جاتا ہے، اس لیے تو نَہَاہُمُ اللّٰہُ أَنْ

يَسْخَرُوا مِنْ قَوْلِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَمَا يَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ مِنَ الْإِسْلَامِ اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ اور اسلام کی باتوں کے ساتھ مذاق نہ کیا کریں۔

حضرت ابو صخر رحمہ اللہ کہتے ہیں كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِذَا أَدْبَرَ نَادَاهُ مَنْ كَانَتْ لَهُ حَاجَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، فَيَقُولُ: أَرْعِنَا سَمْعَكَ. فَأَعْظَمَ اللَّهُ رَسُولَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُقَالَ ذَلِكَ لَهُ جب نبی کریم ﷺ جانے لگتے تو، ایمان والوں میں سے جنہیں کوئی بات کہنا ہوتی، وہ کہتے اپنا کان ادھر کیجئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی عظمت منوانے کے لیے اس لفظ کو استعمال کرنے سے روک دیا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْيَهُودِ مِنْ بَنِي قَيْنُقَاعَ، يُدْعَى رِفَاعَةُ بْنُ زَيْدٍ يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِذَا لَقِيَهُ فَكَلَّمَهُ قَالَ: أَرْعِنِي سَمْعَكَ وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ. وَكَانَ الْمُسْلِمُونَ يَحْسَبُونَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ كَانَتْ تُفَخَّمُ بِهَذَا، فَكَانَ نَاسٌ مِنْهُمْ يَقُولُونَ: اسْمَعْ غَيْرَ مَسْمَعٍ: غَيْرَ صَاغِرٍ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

یہودی قبیلے بنی قینقاع میں ایک شخص تھا، جس کا نام رفاعہ بن زید تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا تھا، وہ جب آپ ﷺ سے ملاقات کرتا تو آپ ﷺ سے کہتا تھا کہ اپنا کان میری طرف کریں، میری بات سنیں اس حال میں کہ آپ کی بات نہیں سنی جائے گی، مسلمان یہ خیال کرتے تھے کہ اس لفظ کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کی عزت کی جاتی ہے، اس لیے لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو یہی جملہ کہتے تھے کہ آپ سنیے آپ کی نہیں سنی جائے، یہ جملہ مسلمان کوئی تحقیر کرنے کے لیے نہیں بولتے تھے۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جب یہود سے اس طرح کی بات سنی تو انہیں فرمانے لگے يَا أَعْدَاءَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَئِنْ سَمِعْتُهَا مِنْ رَجُلٍ مِنْكُمْ يَقُولُهَا لِرَسُولِ اللَّهِ لَأَضْرِبَنَّ عُنُقَهُ، فَقَالُوا: أَوَلَسْتُمْ تَقُولُونَهَا؟ فَنَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ. اے دشمنانِ خدا! تم پر اللہ کی

لعنت ہو، قسم بخدا! جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم میں سے کسی شخص کی زبان سے میں نے یہ جملہ رسول کریم ﷺ کے لیے سنا تو میں اس کی گردن اڑادوں گا، یہودیوں نے جواباً کہا کہ کیا تم لوگ یہ جملہ استعمال نہیں کرتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔ (تفسیر کبیر ج۳ص ۶۳۴)

جب اس لفظ سے کچھ لوگ غلط مفہوم لیتے تھے تو اللہ نے غلط مفہوم نہ لینے والوں کو بھی اس کے استعمال سے روک دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا جملہ اپنے نبی ﷺ کے لیے ناپسند کرتے ہیں، جیسے نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ لَا تَقُولُوا لِلْعِنَبِ الْكَرْمَ، وَلَكِنْ قُولُوا: الْحَبَلَةَ وَلَا تَقُولُوا: عَبْدِي، وَلَكِنْ قُولُوا: فَتَايَ، انگور کو کرم کی بجائے حبلہ کہنے کا حکم دیا، عبدی میرا بندہ کہنے سے منع کیا، اس کی جگہ فتایَ میرا جوان کہنے کا حکم دیا۔

یہود عناد کے طور پر جب آپ ﷺ کے پاس بیٹھتے تو اپنی زبانوں کو مروڑ کر، راعنا پر زور دے کر راعی نا کہتے تھے، اب ان دونوں لفظوں کا معنی جدا جدا ہے، راعنا کا معنی ہے ہماری رعایت کریں، مگر زبان کو مروڑ کر جب وہ راعی نا کہتے تو اس کا معنی بدل جاتا تھا، اس کا معنی ہے ہمارے چرواہے، ہماری بکریاں چرانے والے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ راعنا اور انظرنا دونوں کا ایک ہی معنی ہے مگر چونکہ یہودی اس کو اپنی باطنی خباثت کے باعث غلط مفہوم میں لیتے ہیں اس لیے اگر تم مسلمانوں نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے عرض کرنا ہی ہے تو راعنا کی بجائے انظرنا کہا کرو، بہتر یہ ہے کہ تم لوگ توجہ، انہماک سے کان لگا کر میرے نبی کی بات کو شروع سے ہی سنا کرو تاکہ دوبارہ زحمت ہی نہ دینا پڑے تمہیں پوچھنا ہی نہ پڑے۔

یہود کا مسلمانوں کے ساتھ بغض وعناد

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر بیان فرمائیں

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۱۰۵) البقرہ

جواب ترجمہ: جو لوگ کافر ہیں اہل کتاب یا مشرک وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے خیر (وبرکت) نازل ہو اور خدا تو جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے۔

یہود نبی کریم ﷺ کے ساتھ بغض اور عناد رکھتے تھے، ان کی کتابوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ خیر موجود تھا، آپ ﷺ کے اوصاف اور کمالات کا ذِکر اُن کی کتابوں میں موجود تھا، مگر جب آپ ﷺ بنی اسماعیل میں پیدا ہو گئے تو پھر انہوں نے آپ ﷺ کو ماننے سے انکار کر دیا، محض اس بناء پر کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے، یہاں ان کافروں کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بھی کوئی اچھا برتاؤ نہیں رکھتے، کچھ یہودی ایسے تھے جو مسلمانوں کو کہتے تھے کہ بخدا ہم تمہارے خیر خواہ ہیں، ہم دل وجان سے چاہتے ہیں کہ تمہیں دینی احکامات ہمارے دینی احکامات سے بہتر ملیں، تو ہم بھی انہیں قبول کر لیں گے، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کو جھٹلا رہے ہیں، اللہ واضح فرما رہے ہیں کہ کافروں کا تعلق چاہے اہلِ کتاب سے ہو، چاہے مشرکین سے ہو، وہ کبھی تمہاری خیر خواہی نہیں چاہتے، تمہیں عرش بریں سے کوئی اچھا، عمدہ اور بہتر پیغام ملے، عمدہ اور اچھا دینی حکم ملے تو یہ وہ بھی پسند نہیں کریں گے، اس لیے کہ یہ اپنے کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں، جب تمہاری طرف کوئی حکم آتا ہے تو یہ اسے حسد کی بناء پر نہیں تسلیم کرتے، ان کے زبانی کلامی دعوے ہیں۔

اللہ کی طرف سے ایک کی جگہ دوسری آیت

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۶) البقرہ

جواب ترجمہ: ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے۔

اہل علم کی تحقیق کے مطابق قرآن کریم میں چند آیات ایسی ہیں جنہیں منسوخ کیا گیا ہے، ان آیات کا نزول اللہ کی طرف سے رسول کریم ﷺ کے قلب اطہر پر ہوا تھا اور اللہ ہی نے ان آیات کو منسوخ بھی فرمادیا، یہاں آیات قرآنی کے منسوخ ہونے کی جتنی بھی شکلیں ہیں ان سب کو یکجا کیا گیا ہے، نسخ کا لغوی معنٰی ہے دور کرنا، زائل کرنا، ختم کرنا، کینسل کرنا، منسوخ کرنا، مٹانا، نسخ کا ایک معنٰی لکھنا بھی ہے، کتاب کو حرف بہ حرف لکھنا، نقل کرنا، کتابت کرنا، کاپی بنانا، منسوخ کا معنٰی ہے کالعدم قرار دیا ہوا، لسان العرب میں ہے نَسَخَت الرِّيحُ آثَارَ الدِّيَارِ ہوا نے گھروں کے نشانات تک مٹادیے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے، نَسَخَت الشمسُ الظِّلَّ سورج نے سائے کو ختم کر دیا۔ نَسَخَ الشَّيبُ الشَّبَابَ بڑھاپے نے جوانی کو ختم کر دیا۔ یہاں نسخ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی آیت کے حکم کو ختم کر دینا، منسوخ کر دینا، حضرات مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم بھی یہاں یہی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں نسخ سے مراد کسی حکم کا زائل کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے اور اسی لئے اصطلاح کتاب و سنت میں نسخ ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے خواہ وہ دوسرا حکم یہی ہو کہ پہلے والا حکم بالکل ختم کر دیا جائے یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دوسرا عمل بتلایا جائے۔

اَحکامِ الٰہیہ میں نسخ کی حقیقت: مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں، دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات

کے مناسب تھا اور آگے آنے والے واقعات وحالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اول ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہو گا، دوسرا حکم دینا ہو گا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرارداد سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہو گی یہ سب جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے، جو اس دن کے مناسب ہے، دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دے دے کہ دو روز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کیے اور اسی طرح ایک ہی نبوت وشریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم رہا، پھر بتقاضائے حکمت خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے۔ لَمْ تَكُنْ نَبُوَّةٌ قَطُّ اِلَّا تَنَاسَخَتْ (مسلم) یعنی کبھی کوئی نبوت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور ردوبدل نہ کیا ہو (قرطبی بحوالہ معارف القرآن)

صاحب تفسیر تیسیر القرآن مولانا کیلانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں، یہود جن جن طریقوں سے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا کردار ادا کر رہے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ قرآن کو مشکوک قرار دیا جائے، وہ لوگوں سے کہتے کہ اگر قرآن بھی منزل من اللہ (اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی) ہے اور تورات تو منزل من اللہ ہے ہی، پھر قرآن اور تورات کے احکام میں اختلاف کیوں ہے؟ اس اعتراض کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ قرآن میں ایک حکم نازل ہوتا ہے پھر اس کی جگہ کوئی اور حکم آ جاتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو یہ علم نہیں کہ میں پہلے کیا حکم دے چکا ہوں اور اب کیا دے رہا ہوں؟ یہود کے ایسے ہی اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے اور فرمایا کہ عیب نہ پہلے حکم میں تھا اور نہ دوسرے حکم میں ہے، حالات اور موقع کی مناسبت سے جس طرح کے احکام کی ضرورت ہوتی ہے، ویسے ہی دیئے جاتے ہیں اور تمہیں یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ مالک الملک ہے وہ جیسے چاہے حکم دے سکتا ہے، پہلے کے احکام منسوخ بھی کر سکتا ہے اور نئے دے بھی سکتا ہے۔

ارض وسماء کا بادشاہ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۱۰۷) البقرہ

جواب ترجمہ: کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ وہ ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت تنہا اسی کی ہے، اور اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا رکھوالا ہے نہ مددگار؟

مطلب یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے اور بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اسی کو ہے تو پھر اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس حکم کو چاہے منسوخ بھی کر سکتا ہے گویا کلام سابق کی یہ دلیل ہے۔ وَمَا لَكُمْ (اور تمہارے لیے کوئی نہیں) یعنی اے کافرو

تمہارے لیے عذاب کے وقت کوئی حامی و مدد گار نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری)

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ: ولی قریب کو کہتے ہیں ولی اور نصیر میں یہ فرق ہے کہ ولی کبھی نصیر سے ضعیف ہوتا ہے اور نصیر کبھی ولی نہیں ہوتا بلکہ کوئی اجنبی بھی نصیر ہو سکتا ہے اس لیے ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص من وجہ ہے۔ واللہ اعلم۔ (مظہری)

یہاں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے وَمَا لَكُم مِن دُونِ اللهِ الخ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اے محمد! ان سے کہہ دیجئے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے حکمرانی اور سلطانی ہے، آسمانوں اور زمین میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مدد گار نہیں ہے۔

بے جا قیل و قال کی ممانعت

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

أَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ أَنۡ تَسۡأَلُوا رَسُولَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنۡ قَبۡلُ وَمَنۡ يَتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡإِيمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (۱۰۸) البقرہ

جواب ترجمہ: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے؟ اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر لیا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں ایمان والوں کو فضول سوال کرنے سے منع فرمارہے ہیں کہ کسی واقعہ کے ہونے سے پہلے میرے نبی ﷺ سے فضول سوال نہ کیا کرو، یہ کثرت سوال کی عادت بہت بری ہے جیسے سورۃ المائدہ میں وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ ایسے ایسے سوال نہ کرو کہ اگر ان کو ظاہر کر دیا جائے تو تمہیں برا محسوس ہو، اور اگر تم قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں ایسے سوالوں کا سلسلہ جاری رکھو گے تو یہ باتیں ظاہر کر دی جائیں گی۔ کسی بات کے واقع ہونے سے پہلے اس کی نسبت

سوال کرنے میں خوف یہ ہے کہ کہیں اس سوال کی وجہ سے وہ حرام نہ ہو جائیں۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ، فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ. (بخاری، مسلم) مسلمانوں میں سے بڑا مجرم وہ ہے جو اس چیز کے بارے میں سوال کرے، جو حرام نہ تھی پھر اس کے سوال سے حرام ہو گئی۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ عَنِ الرَّجُلِ يَجِدُ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا فَإِنْ تَكَلَّمَ تَكَلَّمَ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ، وَإِنْ سَكَتَ سَكَتَ عَلَى مِثْلِ ذَلِكَ، فَكَرِهَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسَائِلَ وَعَابَهَا ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ حُكْمَ الْمُلَاعَنَةِ (بخاری، مسلم)

ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے تو کیا کرے؟ اگر لوگوں کو خبر کرے تو یہ بھی بڑی بے شرمی کی بات ہے اور اگر چپ ہو جائے تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے؟ آپ ﷺ کو یہ سوال بہت برا معلوم ہوا، آخر اسی شخص کو ایسا واقعہ پیش آیا اور لعان کا حکم نازل ہوا۔

ایک اور روایت ہے، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَى عَنْ قِيلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةِ الْمَالِ (بخاری، مسلم)

نبی کریم ﷺ قیل و قال (فضول بکواس) بہت زیادہ سوالات کرنے اور مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا، ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِنْ نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، میں جب تک کچھ نہ کہوں، تم بھی نہ پوچھو تم سے پہلے لوگوں کو اسی بری عادت نے ہلاک کر دیا کہ وہ بہت زیادہ سوال کرتے تھے اور اپنے نبیوں کے سامنے اختلاف کرتے تھے، جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق بجالاؤ اور اگر منع کروں تو رک جایا کرو۔

یہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا، جب لوگوں کو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، تو کسی نے کہا یا رسول اللہ! ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ چپ ہو گئے، اس نے پھر پوچھا، آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا، اس نے تیسری بار پھر یہی سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا ہر سال نہیں، لیکن اگر میں ہاں کہہ دیتا، تو ہر سال فرض ہو جاتا اور پھر تم کبھی بھی اس حکم کو بجانہ لاسکتے۔ (مسلم) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ، میں جب تک کچھ نہ کہوں، تم بھی نہ پوچھو۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہمیں آپ سے سوال کرنے سے روک دیا گیا تو فَكَانَ يُعْجِبُنَا أَنْ يَأْتِيَ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ (مسلم) ہمیں یہ بات اچھی لگتی تھی کہ دیہاتیوں میں سے کوئی شخص آکر آپ ﷺ سے سوال کرے اور ہم سنیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ سے کوئی چیز پوچھنا ہوتی تو اس کے لیے سال سال گزر جاتا تھا، ڈر کی وجہ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، ہم خواہش رکھتے تھے کہ کوئی دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آجائے اور وہ آپ ﷺ سے سوال کرے تو ہم بھی اسے سن لیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۸۰)

قومی عصبیت اور مسلمانوں کی تربیت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۹) وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۱۰) البقرہ

جواب ترجمہ: (مسلمانو) بہت سے اہل کتاب اپنے دلوں کے حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنادیں، باوجودیکہ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ چنانچہ تم معاف کرو اور درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود اپنا فیصلہ بھیج دے۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو بھلائی کا عمل بھی تم خود اپنے فائدے کے لیے آگے بھیج دوگے اس کو اللہ کے پاس پاؤگے بیشک جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب یہ دونوں یہودی سب سے زیادہ مسلمانوں کے حاسد تھے لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے اور عربوں سے جلتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، کعب بن اشرف کا بھی یہی شغل تھا، زہری کہتے ہیں اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے یہ بھی یہودی تھا اور اپنے شعروں میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتا تھا گو ان کی کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق موجود تھی اور یہ بخوبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں جانتے تھے اور آپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے پھر یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ قرآن ان کی کتاب کی تصدیق کر رہا ہے ایک اُمی (جس نے کسی کی شاگردی اختیار نہ کی ہو) وہ کتاب پڑھتا ہے جو سراسر معجزہ ہے لیکن صرف حسد کی بنا پر کہ عرب میں آپ کیوں مبعوث ہوئے کفر و انکار پر آمادہ ہوگئے بلکہ اور لوگوں کو بھی بہکانا شروع کر دیا۔

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا کہ تم درگزر کرتے رہو اور اللہ کے حکم کا اور اس کے فیصلے کا انتظار کرو۔ جیسے اور جگہ فرمایا تمہیں مشرکوں اور اہل کتاب سے بہت کڑوی باتیں سننی پڑیں گی مگر بعد میں حکم نازل فرمادیا کہ ان مشرکین سے اب دب کر نہ رہو ان سے لڑائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکین اور اہل کتاب سے درگزر کرتے تھے اور ان کی ایذاء اور تکلیف سہتے تھی اور اس

آیت پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ دوسری آیتیں اتریں اور یہ حکم ہٹ گیا اب ان سے بدلہ لینے اور اپنا بچاؤ کرنے کا حکم ملا اور پہلی ہی لڑائی جو بدر کے میدان میں ہوئی اس میں کفار کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی لاشیں میدان میں بچھ گئیں۔ (ابن کثیر)

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ: پھر مومنوں کو رغبت دلائی جاتی ہے کہ تم نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی حفاظت کرو یہ تمہیں آخرت کے عذابوں سے بچانے کے علاوہ دنیا میں بھی غلبہ اور نصرت دے گی پھر فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہر نیک و بد عمل کا بدلہ دونوں جہاں میں دے گا اس سے کوئی چھوٹا، بڑا، چھپا، کھلا، اچھا، برا، عمل پوشیدہ نہیں یہ اس لئے فرمایا کہ لوگ اطاعت کی طرف توجہ دیں اور نافرمانی سے بچیں مبصر کے بدلے بصیر کہا جیسے مبدع کے بدلے بدیع اور مولم کے بدلے الیم۔ ابن ابی حاتم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت میں سمیع بصیر پڑھتے تھے اور فرماتے تھے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

صرف یہود و نصاریٰ ہی جنت جائیں گے؟

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۱۱۱) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (یہودی و عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جانے کا، یہ ان لوگوں کے خیالات باطل ہیں (اے پیغمبر ﷺ ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کا کوئی لمحہ ضائع نہیں جانے دیتے تھے، وہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر پریشان ہوتے تھے، ان کے باپ دادا کے تفصیلی اور اجمالی کرتوت قرآنِ

کریم میں جس طرح بیان کیے گئے شاید ہی کسی اور کے اس طرح بیان کیے گئے ہوں، یہاں بھی ان کے ایک دھوکے کی قلعی کھولی گئی ہے، وہ دھوکہ یہ دیتے تھے کہ جنت میں تو ہم ہی جائیں گے، کوئی اور نہیں جاسکتا، جیسے سورۃ المائدہ میں ان کے اس بلند بانگ دعوے کا ذکر کیا گیا جس میں وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کی اولاد ہیں ،ہم اللہ کے چہیتے ہیں،لاڈلے ہیں ،اللہ کے دوست ہیں، انہیں واضح طور پر بتایا گیا کہ یہ سب تمہاری خام خیالی ہے اگر تم اسی قدر محبوب اور چہیتے ہو تو پھر تم دوزخ میں کیوں جاؤ گے ؟وہاں تمہاری تواضع سخت ترین عذاب سے کیونکر کی جائے گی ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کے زبانی کلامی دعوے ہیں، بے تکے اور بے دلیل، یہ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں کہ ہم جنت کے ٹھیکیدار ہوں گے، اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہوں تو اس پر کوئی دلیل ، کوئی حجت، کوئی برہان پیش کریں۔ دلیل اور برہان پیش کرنے سے ہی ان کا سچ ثابت ہو گا۔

اصل جنتی کون ہے؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۱۲)(البقرہ)

جواب ترجمہ: ہاں جس نے اپنی ذات کو اللہ کی فرمانبرداری کے لیے جھکا دیا اور وہ محسن ہو تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اس کے رب کے پاس، اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں، اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو اور اپنی ذات کو اللہ کے احکام کی تعمیل میں جھکا دے اور وہ صفت احسان سے متصف بھی ہو تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ضرور ملے گا، جو جنت کے داخلے کی صورت میں ہو گا، ان لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہونے کا

کوئی موقع ہے یہ عمومی قانون ہے جو بھی اس پر عمل کرے گا داخلہ جنت کا مستحق ہو گا، اللہ تعالیٰ سے کسی کی قرابت، رشتہ داری اور عزیز داری نہیں ہے اور نہ کوئی خواہ مخواہ محبوب اور مقرب بن جاتا ہے، ایمان پر دخول جنت کا مدار ہے۔

لفظ محسن احسان سے مشتق ہے جو حسن سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے اچھے طریقے سے کام کرنا اور عمدگی کے ساتھ انجام دینا، اس میں احسان عقیدہ اور احسان عمل سب کچھ داخل ہے، بعض مفسرین نے محسن کا ترجمہ مخلص سے کیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ عقیدہ بھی صحیح ہونا لازم ہے اور عمل بھی صحیح ہونا ضروری ہے، جس کا عقیدہ رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ کے بتائے ہوئے عقیدوں کے خلاف ہو، وہ عقیدہ میں محسن نہیں ہے لہٰذا اس کی نجات نہیں ہے، اس نے اپنی ذات کو اللہ کے لیے نہیں جھکایا وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کی تکذیب کرتا ہے، لہٰذا مستحق نجات نہیں اور جس شخص کا عمل رسول اللہ ﷺ کے عمل کے موافق نہیں ہے یا نیت میں اخلاص نہیں یعنی اللہ کی رضا مطلوب نہیں اس کا وہ عمل مردود ہے، اللہ کی محبت کا دعویٰ ہو اور رسول اللہ ﷺ کا اتباع نہ ہو تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے، عقیدہ اور عمل دونوں میں اخلاص ضروری ہے، منافق عقیدہ میں مخلص نہ تھے اور جو لوگ عقیدہ ٹھیک رکھتے ہیں لیکن عمل اللہ کی رضا کے لیے نہیں کرتے، دکھاوے کے لیے اور دنیاوی جاہ و عزت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں ان کے عمل کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں۔ (انوار البیان

یہود و نصاریٰ کا تعصب

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۱۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی راستے پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی راستے پر نہیں حالانکہ وہ کتاب (الٰہی) پڑھتے ہیں اسی طرح بالکل انہی کی سی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو (کچھ) نہیں جانتے (یعنی مشرک) تو جس بات میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں خدا قیامت کے دن اس کا ان میں فیصلہ کر دے گا۔

پہلے یہود و نصاریٰ کی ہم آہنگی اور یکجہتی کو بیان کیا گیا کہ یہ دونوں یک زبان ہیں کہ ہمارے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا، اب یہاں ان کی باہمی تفریق کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھی تسلیم نہیں کرتے، ایک دوسرے کی تکذیب، تردید اور تکفیر کرتے ہیں۔

شانِ نزول: اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ نبی کریم، رؤف ورحیم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا، یہودی علماء بھی آئے، آپ ﷺ کی موجودگی میں دونوں کے درمیان مناظرہ ومباحثہ شروع ہو گیا، آوازیں بلند ہونے لگیں، شور مچ گیا، یہود نے کہا کہ نصاریٰ کا دین ایسا نہیں ہے جسے کچھ سمجھا جائے یا جس کو دین کہا جائے، ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل کا انکار کر دیا، نصاریٰ نے کہا کہ ان یہودیوں کا دین ایسا نہیں ہے جسے کچھ سمجھا جائے یا جس کو دین خیال کیا جائے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی کتاب تورات کا انکار کر دیا، اللہ نے ان کی اس معرکہ آرائی پر یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

یہ ان لوگوں کی گفتگو تھی جو اپنے کو صاحب علم وکمال سمجھتے تھے، اپنے کو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے لاڈلے سمجھتے تھے، اس طرح کی جاہلانہ، عامیانہ اور سوقیانہ گفتگو کی ان لوگوں نے کہ الامان والحفیظ، حالانکہ جس انجیل کا وہ انکار کرتے ہیں اسی انجیل میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر خیر موجود ہے، اسی طرح نصاریٰ جس تورات کا انکار کرتے ہیں اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر خیر موجود ہے، یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، دونوں اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہیں۔

یہ تو اہل کتاب لوگوں کا ذکر تھا، اسی آیت میں ان عقل وبصیرت کے اندھوں کا ذکر ہے جن کے

پاس کتاب رشد وہدایت بھی نہیں تھی، وہ بت پرستی اور آتش پرستی کے خوگر تھے ان کی سرکشی اور تمرد کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہر دین والے کو جھٹلانا شروع کر دیا، انہی میں سے عرب کے وہ مشرک بھی تھے جو آپ ﷺ کے بارے میں نازیبا کلمات منہ سے نکالتے اور آپ ﷺ کو ستاتے تھے، انہی میں سے کئی بدبخت آپ ﷺ کی ہجو کرتے تھے، آپ ﷺ کو گالیاں دیتے اور انہی میں ایک وہ بدنصیب بھی تھا جس نے صحنِ حرم میں آپ ﷺ کے پاکیزہ جسم پر اونٹ کی گندی اوجھڑی ڈال دی تھی۔

امت محمدی یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پہ: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَاعْلَمْ أَنَّ هَذِهِ الْوَاقِعَةَ بِعَيْنِهَا قَدْ وَقَعَتْ فِي أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى الله عليه وآله وَسَلَّمَ فَإِنَّ كُلَّ طَائِفَةٍ تُكَفِّرُ الْأُخْرَى مَعَ اتِّفَاقِهِمْ عَلَى تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ، (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۰) جان لو! یہ واقعہ بعینہ نبی کریم ﷺ کی امت میں واقع ہو چکا ہے، ہر گروہ دوسرے کو کافر قرار دے رہا ہے، باوجودیکہ ان سب کا قرآن کی تلاوت پر اتفاق ہے۔

میں خود حیران ہوں کہ مسلمانوں کا رب ایک ہے، مسلمانوں کا نبی ایک ہے، مسلمانوں کی کتاب ایک ہے، مسلمانوں کی شریعت ایک ہے، مسلمانوں کا دین ایک ہے اصول ایک ہیں، پھر بھی ایک دوسرے کے خلاف تکفیری مہم چلانے سے باز نہیں آتے۔

ہر گروہ اسی چیز پر خوش ہے جو اس کے پاس موجود ہے، کوئی اپنے سوا کسی کو دین کا پاسبان اور محافظ خیال نہیں کرتا، ہر گروہ دوسرے گروہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے، جہاں ایک گروہ کو مہلت و موقع مل جاتا ہے وہ دوسرے فرقے اور گروہ کو نقصان پہنچانے سے ذرا دریغ نہیں کرتا، ہمارے ملک پاکستان کے حالات باقی ممالک کی بہ نسبت زیادہ گھمبیر اور خوفناک ہیں۔

یہاں فرقوں کی بنیاد پر مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں، ادارے الگ الگ وجود میں آچکے ہیں، بعض مقامات کی عبادت گاہوں پر تو اس فرقے کی رجسٹریشن کے بورڈ آویزاں دکھائی دیتے ہیں، کسی

مسجد کے مرکزی دروازے پر ناک منہ چڑھانے والا یہ جملہ لکھا ہوتا ہے کہ یہاں فلاں فرقے اور مسلک کے لوگ نماز نہیں پڑھ سکتے، کہیں کسی شخص کو قرآن کریم دکھایا اور پڑھایا جائے تو وہ قرآن کریم کے سرورق پر نظر ڈال کر دیکھتا ہے کہ اس قرآن کریم کا ترجمہ کس فرقے کے عالم نے کیا ہے۔

یہاں فرقوں اور مسلکوں کی بنیاد پر لڑائیاں جاری رہتی ہیں، کہیں کھل کر اور کہیں دب دبا کر، کہیں علی الاعلان اور کہیں خفیہ، کہیں قتل و قتال کی نوبت ہے اور کہیں انتشار و تشتت عروج پر ہے، حکمران اپنی سی کوشش کرتے ہیں کہ یہ فرقہ بندیاں اور جتھہ بندیاں ختم ہو جائیں مگر یہ ایسا مرض اور ایسی بیماری ہے جو یا تو لاعلاج ہے یا اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، فرقے اور جتھے نہ بناؤ، اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت اور الفت ڈال دی، باہمی لڑائی، جھگڑے، تشتت، انتشار اور فرقہ بندی نے تمہیں جہنم کے کنارے پر پہنچا دیا تھا، اللہ نے تمہیں اس آتشی کنارے سے بچایا، وہ بچانا چاہتا ہے تم پھر لپک لپک کر دوزخ کی طرف جانا چاہتے ہو، اللہ تعالیٰ واضح فرما رہا ہے کہ تم اگر باہمی انتشار اور افتراق کا شکار ہو جاؤ گے تو تم کمزور ہو جاؤ گے، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

میں عرض کروں کہ مسلمان آج کروڑوں میں ہیں، ستاون اسلامی ممالک اس وقت دنیا کے نقشے پر موجود ہیں، پاکستان اسلامی ملک ہی نہیں بلکہ ایٹمی ملک ہے، جس کے پاس نت نیا اسلحہ موجود ہے، ایٹم بم موجود ہے مگر ہماری دنیا میں کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں ہے، ہم پانی کے بلبلے سے زیادہ کیا ہیں؟ سمندر کی جھاگ سے زیادہ ہماری کیا حیثیت ہے؟ ہم ملکی سطح پر پریشانی کا شکار ہیں، ہم بین الاقوامی سطح پر مرعوب ہیں، ہمارے اوپر یہود و نصاریٰ کا تسلط ہے، ہماری پالیسیاں، ہمارا طرز حکمرانی سب انہی کا مرہون منت ہے۔

ان ربانی ارشادات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنا قبلہ درست کرنا چاہیے، ہمیں تشتت اور انتشار سے بچنا چاہیے، فرقوں، مسلکوں، مشربوں کی بجائے ہمیں امت واحدہ بن کر کام کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اپنے اپنے خانہ ساز مسلکوں کے خول سے باہر نکل کر صرف اور صرف امت مسلمہ صرف اور صرف محمدی کہلوانے پر فخر ہونا چاہیے، ہم محمدی ہیں، ہم مسلم ہیں، ہم اللہ واحد کے پرستار ہیں کیا یہ نسبتیں ہمارے لیے کوئی اعزاز نہیں ہے کہ ہم نے گلی محلوں کو اپنی پہچان بنالیا ہے، بستیوں اور شہروں کو اپنی پہچان کا ذریعہ بنالیا ہے، شخصیات کی طرف نسبت کرتے ہیں اور جس عظیم نبی ﷺ کے احسانات ہم پر بے شمار ہیں ان کی طرف نسبت کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔

یہ آیت مبارکہ ہمیں بہت کچھ بتارہی ہے، ہمیں یہود بے بہبود کی تباہی اور بربادی کا پورا منظر پیش کررہی ہے، نصاریٰ کی تنزلی کا پورا منظر بیان کررہی ہے، اس لیے ہمیں مسلمان ہونے کے ناطے ان چیزوں کو خوب توجہ سے دیکھنے اور سننے کی ضرورت ہے اور ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے، ملی و قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (جواب شکوہ)

مساجد اور عبادت گاہوں سے روکنے والے ظالم

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۱۴)البقرہ

جواب ترجمہ: اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو؟ ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں دوسرا یہ کہ اس سے مراد مشرکین ہیں، نصرانی بھی بیت المقدس کی مسجد میں پلیدی ڈال دیتے تھے اور لوگوں کو اس میں نماز ادا کرنے سے روکتے تھے، بخت نصر مجوسی نے جب بیت المقدس کی بربادی کے لئے چڑھائی کی تھی تو ان نصرانیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور مدد کی تھی، بخت نصر بابل کا رہنے والا مجوسی تھا اور یہودیوں کی دشمنی پر نصرانیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور اس لئے بھی کہ بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تھا۔

مشرکین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ والے سال کعبۃ اللہ سے روکا تھا، یہاں تک کہ ذی طویٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانیاں دینا پڑیں اور مشرکین سے صلح کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں سے واپس آ گئے، حالانکہ یہ امن کی جگہ تھی، باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی یہاں کوئی نہیں چھیڑتا تھا اور ان کی کوشش یہی تھی کہ ذکر اللہ اور حج و عمرہ کرنے والی مسلم جماعت کو روک دیں۔

جب نصرانیوں نے یہودیوں کو بیت المقدس سے روکا تھا اس وقت یہودی بھی محض بے دین ہو چکے تھے، ان پر تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی لعنتیں نازل ہو چکی تھیں، وہ نافرمان اور حد سے متجاوز ہو چکے تھے اور نصرانی مسیح علیہ السلام کے دین پر تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اوپر یہود و نصاریٰ کی مذمت بیان ہوئی تھی اور یہاں مشرکین عرب کی اس بد خصلت کا بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور

آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسجد الحرام سے روکا، مکہ سے نکالا، پھر حج وغیرہ سے بھی روک دیا۔

مشرکین مکہ اپنے انداز میں بیت اللہ کی ویرانی کے لیے کوشش کرتے تھے، انہوں نے عبادت گزاروں کو وہاں سے دیس نکالا دیا، بیت اللہ عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا، انہوں نے اس میں بتوں کو لا جمع کیا تھا، قرآن میں بتایا گیا کہ وہ مسجد الحرام سے لوگوں کو روکتے تھے، مشرکین اپنے کفر و شرک کے خود گواہ ہیں وہ اللہ کے گھروں کو کیونکر آباد کر سکتے ہیں۔

مشرک ناپاک ہوتا ہے، وہ اللہ کے گھر کو کیونکر آباد کر سکتا ہے، اس کے اپنے اعمال تباہ و برباد ہو چکے ہوتے ہیں، وہ جہنم کے کنارے پہنچ چکا ہوتا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دینی احکامات سے اسے کیا سروکار؟ رسول کریم ﷺ کے ساتھ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کا آج بھی قرآن کریم گواہ ہے۔

جب مکہ فتح ہو گیا اگلے سال ۹ ہجری اعلان کرا دیا کہ اس سال کے بعد حج میں کوئی مشرک نہ آنے پائے اور بیت اللہ شریف کا طواف کوئی ننگا ہو کر نہ کرے جن لوگوں کے درمیان صلح کی کوئی مدت مقرر ہوئی ہے وہ قائم ہے، مشرک لوگ ناپاک ہیں اس سال کے بعد انہیں مسجد حرام میں نہ آنے دو اور یہ معنیٰ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ مشرک کانپتے ہوئے اور خوف زدہ مسجد میں آئیں لیکن برخلاف اس کے الٹے یہ مسلمانوں کو روک رہے ہیں۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کہ عنقریب میں تمہیں غلبہ دوں گا اور یہ مشرک اس مسجد کی طرف رخ کرنے سے بھی کپکپانے لگیں گے چنانچہ یہی ہوا اور نبی کریم ﷺ نے وصیت کی کہ جزیرۂ عرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں اور یہود و نصاریٰ کو وہاں سے نکال دیا جائے۔

اور اگر اس سے مراد نصاریٰ لئے جائیں تو بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی بیت المقدس کی بے حرمتی کی تھی، بالخصوص اس صخرہ (پتھر) کی جس کی طرف یہود نماز پڑھتے تھے، اسی طرح جب یہودیوں نے بھی نصرانیوں سے بہت زیادہ ہتک کی اور ان پر ذلت بھی اس وجہ سے زیادہ نازل ہوئی دنیا

کی رسوائی سے مراد امام مہدی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی رسوائی بھی ہے اور جزیہ کی ادائیگی بھی ہے۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ نے اپنے اپنے انداز میں اللہ کے گھروں میں عبادت کرنے سے لوگوں کو روکا، آج مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے بدنصیب لوگ موجود ہیں جو مختلف حیلوں اور ہتھکنڈوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ مساجد بنانے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں بلکہ ان کو ویران کرنے کی جد وجہد میں بھی پیش پیش ہیں، ہمارے ہاں پاکستان میں حکومت نے ایک قانون بھی بنادیا ہے کہ حکومتی اجازت کے بغیر کوئی شخص اپنے طور پر مسجد تعمیر نہیں کر سکتا، اس قانون بنانے میں بھی یہ عنصر کارفرما تھا کہ کچھ لوگ گلی کوچے کے اجارہ دار بن کر مسجدوں کی تعمیر میں رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے

بیت المقدس ہو یا بیت اللہ مقصود صرف اللہ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۱۱۵) البقرہ

جواب ترجمہ: اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ لہٰذا جس طرف بھی تم رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے۔ بے شک اللہ بہت وسعت والا، بڑا علم رکھنے والا ہے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں، اوپر جن تین گروہوں کا ذکر ہوا ہے ان کے درمیان ایک اختلاف قبلے کا بھی تھا، اہل کتاب بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے اور مشرکین بیت اللہ کو قبلہ سمجھتے تھے، مسلمان بھی اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور یہ بات یہودیوں کو ناگوار تھی، ایک مختصر عرصے کے لئے مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تو یہودیوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ دیکھو! مسلمان ہماری بات ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں، پھر دوبارہ بیت اللہ کو مستقل قبلہ بنادیا گیا۔ (توضیح القرآن)

مفتی صاحب فرماتے ہیں یہ آیت بظاہر اس موقع پر نازل ہوئی ہے جب مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے، بتلانا یہ مقصود ہے کہ کوئی بھی سمت اپنی ذات میں کسی تقدس کی حامل نہیں، کسی بھی جگہ یا کسی بھی سمت میں اگر کوئی تقدس آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے آتا ہے، مشرق و مغرب سب اللہ کی مخلوق اور اسی کی تابع فرمان ہیں، اللہ تعالیٰ کسی ایک جہت میں محدود نہیں وہ ہر جگہ موجود ہے؛ چنانچہ وہ جس سمت کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے بندوں کا کام ہے کہ اسی حکم کی تعمیل کریں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ ہو جہاں قبلے کی صحیح سمت پتہ نہ چل رہی ہو تو وہاں وہ اپنے اندازے سے جس سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز پڑھے گا اس کی نماز ہو جائے گی یہاں تک کہ اگر بعد میں پتہ چلے کہ جس رخ پر نماز پڑھی ہے وہ صحیح رخ نہیں تھا تب بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس شخص نے اپنی طاقت کے مطابق اللہ کے حکم کی تعمیل کر لی۔

دراصل کسی بھی جگہ یا کسی بھی سمت میں اگر کوئی تقدس آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے آتا ہے لہذا اگر اللہ تعالیٰ قبلے کے تعین میں اپنے احکام بدل رہا ہے تو اس میں کسی فریق کی ہار جیت کا سوال نہیں، یہ تبدیلی یہی دکھانے کے لئے آرہی ہے کہ کوئی سمت اپنی ذات میں مقصود نہیں، مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی ہے، اگر آئندہ اللہ تعالیٰ دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے تو یہ بات نہ قابل تعجب ہونی چاہیے نہ قابل اعتراض۔ (توضیح القرآن)

اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ (۱۱۶) بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۱۱۷) البقرہ

جواب ترجمہ: اور کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنایا ہے حالانکہ وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ وہ بلا مثال کے پیدا فرمانے والا ہے، اور جب فیصلہ فرمائے کسی امر کا تو بس یوں فرما دیتا ہے کہ ہو جا، پس ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت کعب بن اشرف اور کعب بن اسد اور وھب بن یہودا کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا ٹھہرایا تھا، قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا، نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا، مشرکین مکہ نے اللہ کے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہرایا تو اللہ نے ان کے رد میں فرمایا کہ میں ان ساری نسبتوں سے پاک ذات ہوں۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ اور اس کے ساتھ کی آیت نصرانیوں کے رد میں ہے اور اس طرح ان جیسے یہود و مشرکین کی تردید میں ہے، جو اللہ کی اولاد بتاتے تھے ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین و آسمان وغیرہ تمام چیزوں کا تو اللہ مالک ہے، ان کا پیدا کرنے والا، انہیں روزیاں دینے والا، ان کے اندازے مقرر کرنے والا، انہیں قبضہ میں رکھنے والا، ان میں ہر تغیر و تبدل کرنے والا، اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

پھر بھلا اس مخلوق میں سے کوئی اس کی اولاد کیسے ہو سکتا ہے؟ عزیر علیہ السلام اور نہ ہی عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے بن سکتے ہیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا خیال تھا، نہ فرشتے اس کی بیٹیاں بن سکتے ہیں جیسا کہ مشرکینِ عرب کا خیال تھا۔ اس لئے کہ دو برابر کی مناسبت رکھنے والے ہم جنس سے اولاد ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ ہی اس کی عظمت و کبریائی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کی جنس کا کوئی اور، وہ تو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے اس کی اولاد کیسے ہو گی؟

اس کی کوئی بیوی بھی نہیں، وہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا عالم ہے، یہ لوگ رحمٰن کی اولاد بتاتے ہیں، یہ کتنی بے معنی اور بے ہودہ اور بے تکی بات تم کہتے ہو؟ اتنی بری بات زبان سے نکالتے ہو کہ

اس سے آسمانوں کا پھٹ جانا اور زمین کا شق ہو جانا اور پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا ممکن ہے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے، اللہ کی اولاد تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی، اس کے سوا جو بھی ہے سب اسی کی ہی ملکیت ہے، زمین و آسمان کی تمام ہستیاں اس کی غلامی میں ظاہر ہونے والی ہیں، جنہیں ایک ایک کر کے اس نے گھیر رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے، ان میں سے ہر ایک اس کے پاس قیامت والے دن تنہا تنہا پیش ہونے والی ہے، پس غلام اولاد نہیں بن سکتا، ملکیت اور ولدیت دو مختلف اور متضاد حیثیتیں ہیں۔ (ابن کثیر)

بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: نیست سے ہست کرنے، عدم محض سے موجود کرنے کو عربی میں ابداع کہتے ہیں۔ یعنی نہ پہلے اس کا کوئی مادہ ہو نہ نمونہ اور نہ بنانے کے آلات موجود ہوں۔ اس ایک لفظ سے رد ہو گیا ان لوگوں کا (مثلاً آریہ سماجی وغیرہ) جو کہتے ہیں کہ روح بھی ہمیشہ سے موجود ہے اور مادہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے زیادہ سے زیادہ صرف یہ کیا کہ ایک ماہر کاریگر کی طرح مادے کے مختلف اجزاء کو ایک خاص تناسب سے باہم ملا دیا اور رنگا رنگ چیزیں نمودار ہو گئیں۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف صانع ہی نہیں بلکہ بدیع ہے۔ اس نے آسمان اور زمین کو محض اپنے ارادہ سے بغیر کسی سابق مادہ کے پیدا فرمایا۔ (ضیاء القرآن)

جاہل یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ناجائز مطالبات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۱۱۸) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ: اللہ ہم سے (براہ راست) کیوں بات نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ بھی اسی

طرح کی باتیں کہتے تھے جیسے یہ کہتے ہیں۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یقین کرنا چاہیں ان کے لیے ہم نشانیاں پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قَالَ الَّذِینَ سے مراد یہود ہیں۔ انہی کی ایک روایت میں ہے کہ رافع نامی یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ سے کہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کلام کرے اور ہمیں کہے کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے، مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قَالَ الَّذِینَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قَالَ الَّذِینَ سے مراد عرب کے مشرک ہیں، علامہ طبری رحمہ اللہ نے یہود و نصاریٰ والی بات کو ترجیح دی ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ (بعضے) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں یا فرشتوں کے واسطے سے جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتادیں کہ دوسرے رسول کی ہم کو ضرورت ہی نہ رہے یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں تو ہم ان کی ہی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل (ثبوت رسالت کی) آجائے (حق تعالیٰ اولاً اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے۔

پھر ثانیاً اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب سے بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی پھر

ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں اور چونکہ اس قول کا جزوِ اول حماقت محض تھا کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پلہ ملائکہ اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے جو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے۔

اس لئے اس احمقانہ بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہو سکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کد ہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے ان کو تحقیق ہی منظور نہیں سو ایسوں کی تسلی و تشفی کا کون ذمہ دار بنے)۔ (تفسیر بیان القرآن)

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ: (اسی طرح کہہ چکے وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہیں) یعنی گزشتہ یہود اور نصاریٰ بھی اسی قسم کی باتیں کہا کرتے تھے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہود نے کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو علی الاعلان دکھا دے اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی تھی کہ ہم پر آسمان سے کھانے کا بھرا ہوا خوان اترے۔ (مظہری)

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ: (ملے جلے ہیں ان سب کے دل) یعنی عناد اور نابینائی میں پہلے پچھلوں کے دل برابر ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: (بیشک ہم بیان کر چکے نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں) یعنی ہم نے اس قوم کے لیے دلائل بیان کر دیے جو حق بات کے ساتھ یقین کے طالب ہیں یہ جو فرمایا کہ یقین کرنے والوں کے لیے بیان کر دیا حالانکہ سب کے لیے بیان فرمایا ہے۔ تو وجہ تخصیص یہ ہے کہ چونکہ آیات کی منفعت یعنی ہدایت اور رشد سے ایسے ہی منتفع ہیں اور جو عناد اور جدال کرنے والے ہیں وہ محروم اور نامراد ہیں تو گویا آیات ان کے لیے ہی بیان ہوئیں۔ (مظہری)

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بشر و نذیر بنا کر مبعوث کیے گئے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ (۱۱۹) البقرہ

جواب ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور دوزخ والوں کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

اس آیت میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اور آپ کا عہدہ یہ ہے کہ آپ جنت کی بشارت دیں اور دوزخ سے ڈرائیں بشارت میں وہ اعمال بتانا داخل ہے جو دخول جنت کا سبب ہیں جن میں سب سے بڑی چیز ایمان ہے اور ڈرانے کے مفہوم میں ان اعمال سے باخبر کرنا شامل ہے جو دوزخ میں لے جانے والے ہیں جن میں سب سے بڑی چیز کفر و شرک ہے۔ (انوار البیان)

حضرت عطا بن یسار رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صفت و ثنا تورات میں کیا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اللہ کی قسم! جو صفتیں آپ کی قرآن میں ہیں وہی تورات میں بھی ہیں، تورات میں ہے

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا، وَحِرْزًا لِلْأُمِّيِّينَ، وَأَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي، سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ، لَا فَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ وَلا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ، وَلَنْ يَقْبِضَهُ حَتَّى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ، بِأَنْ يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ. فَيَفْتَحَ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيًا، وَآذَانًا صُمًّا، وَقُلُوبًا غُلْفًا (بخاری، ابن کثیر)

اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ اور خوشخبریاں دینے والا اور ڈرانے والا اور ان پڑھوں کا بچاؤ بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ نہ بد

زبان ہیں، نہ سخت گو ہیں، نہ بد خلق ہیں، نہ بازاروں میں شور وغل کرنے والے ہیں، نہ برائی کے بدلے برائی کرنے والے ہیں، بلکہ معاف اور درگزر کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں دنیا سے نہ اٹھائے گا جب تک کہ آپ کے دین کو آپ کی وجہ سے بالکل ٹھیک اور درست نہ کر دیں اور لوگ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا اقرار نہ کرلیں اور ان کی اندھی آنکھیں کھل نہ جائیں اور ان کے بہرے کان سننے نہ لگ جائیں اور ان کے زنگ آلود دل صاف نہ ہو جائیں۔

وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ: آپ ﷺ سے دوزخ والوں کے بارے میں سوال نہ ہو گا، اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ مسلمان نہ ہوں، آپ ﷺ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں، آپ ﷺ اپنا کام کیے جائیں، اللہ کا کلام پہنچائیں حق کو واضح طور پر بیان فرمادیں، آگے ایمان کو قبول کرنا یا نہ کرنا مخاطبین کی ذمہ داری ہے، آپ ﷺ سے کوئی سوال نہ ہو گا کہ کافروں نے اسلام کیوں قبول نہ کیا اور وہ دوزخ کے مستحق کیوں ہوئے، زبردستی ایمان قبول کرانا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا کام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ (انوار البیان)

یہود و نصاریٰ کی پیروی میں اللہ کی ناراضگی

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدَى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۱۲۰) البقرہ

جواب ترجمہ: اور تم سے یہود اور نصاریٰ ہر گز راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی نہیں کرو گے، کہہ دو بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے اور اگر تم نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی اس کے بعد جو تمہارے پاس علم آچکا تو تمہارے لیے اللہ کے ہاں کوئی دوست اور مددگار نہیں ہو گا۔

یہود و نصاریٰ کو اللہ کی رضا مطلوب نہیں ہے، وہ اپنی خواہشات، اپنے باطل خیالات، اپنی خانہ ساز باتوں کے پیروکار ہیں، وہ مسلمانوں اور ان کے محبوب نبی ﷺ سے کسی طور خوش نہیں ہو سکتے، ان سے راضی نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ مسلمان اپنا دین، راہِ ہدایت چھوڑ چھاڑ کر ان کی طرح نہ ہو جائیں، یہودی تب ان سے راضی ہوں گے جب مسلمان یہودیت اختیار کر لیں اور نصاریٰ تب مسلمانوں سے راضی ہوں گے جب مسلمان نصرانیت اختیار کر لیں، ہدایت کی بجائے ان کی خواہشات کی پیروی نہ شروع کر دیں، یہود مسلمانوں سے اس وقت راضی اور خوش ہوں گے جب مسلمان یہود کے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں اور یہود کا قبلہ مغرب ہے۔

نصاریٰ مسلمانوں سے اس وقت راضی اور خوش ہوں گے جب مسلمان ان کے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں اور نصاریٰ کا قبلہ مشرق ہے، یہودی تب راضی ہو گا جب مسلمان یہودیت اختیار کر لے اور عیسائی تب راضی ہو گا جب مسلمان عیسائی بن جائے، ان جیسی وضع قطع، طور اطوار اختیار کر لے تو وہ خوش ہوں گے، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دین پر ڈٹے رہیں، راہ ہدایت کو ہر گز ترک نہ کریں، یہود و نصاریٰ کی پیروی نہ کریں، ان کے طور طریقوں کی اتباع نہ کریں، اللہ نے جو دین انہیں دیا ہے یہ سب سے سچا، سب سے کھرا، اور سارے مصائب اور آلام سے نجات دلانے والا دین ہے، یہ دین اللہ کا پسندیدہ دین ہے جسے دین اسلام کہا جاتا ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسی دین پر ڈٹے رہیں۔

یہود و نصاریٰ اپنے اپنے دور میں بھی اللہ کے احکامات کا مذاق اڑاتے تھے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین اور تضحیک کرتے تھے، ان پر نازل ہونے والے احکامات کو اپنی خواہشات کے تابع بنانے کی کوشش کرتے تھے، ان میں کتر و بیونت کرتے تھے، اپنی مرضی کے مسائل اور احکامات پر عمل کر لیتے تھے مگر مرضی کے خلاف آنے والے احکامات کو نہیں مانتے تھے۔ اس لیے مسلمان ان کی کسی طور پیروی نہ کریں۔

تلاوتِ قرآن کریم کا حق ادا کرنے والے

سوال اس آیت کریمہ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟ مختصر تحریر کریں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖۤ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱) البقرہ

جواب ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، جبکہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہوں جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے، تو وہ لوگ ہی (در حقیقت) اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو اس کا انکار کرتے ہوں تو ایسے لوگ ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسی تلاوت کرنا جیسا کہ تلاوت کا حق ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی کتاب میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے ان پر عمل کریں اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کو اختیار نہ کریں اور قرآن کو اسی طرح پڑھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اس کے کلمات میں تحریف نہ کریں اور اس کے معانی میں کوئی تبدیلی نہ کریں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے محکمات پر عمل کریں اور متشابہات پر ایمان لائیں اور جو کچھ اشکال پیش آئے اس کو اہل علم کے سپرد کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو تلاوت کرتے وقت کسی رحمت والی آیت پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب کسی عذاب کی آیت پر پہنچتے ہیں تو اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (ابن کثیر)

یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ: یہ جو فرمایا کہ اسی طرح تلاوت کریں جیسا کہ اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے، اس میں تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھنا بھی داخل ہے سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ عربی ایک مستقل زبان ہے جو ۲۹ حروف پر مشتمل ہے، حروف کے مخارج بھی ہیں اور صفات بھی ہیں، مخارج اور صفات کا خیال نہ کرنے سے ایک حرف دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے، جس سے

معانی بھی بدل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے، ضروری ہے کہ تلاوت کرنے والے قرآن کو صحیح طریقہ پر مخارج وصفات کی رعایت کے ساتھ پڑھیں، پوری دنیا میں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں مسلمان قرآن کریم کے حافظ ہیں، لاکھوں لوگ قرآن کریم کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پڑھتے ہیں، ہزاروں مدارس ایسے ہیں جہاں تجوید وترتیل کے ساتھ قرآن کریم پڑھایا ہی نہیں جاتا بلکہ قواعدِ تجوید باقاعدہ سکھائے جاتے ہیں، جن لوگوں کو تجوید وترتیل کے ساتھ قرآن کریم پڑھنا آتا ہے ان سے دوسروں کو مشق کرنا چاہیے اور سیکھنا چاہیے تاکہ منشاء خداوندی کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کی جاسکے، تجوید وترتیل کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت میں بڑی تاثیر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے، اس آیت میں ہر چند کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے اور چونکہ قرآن افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولی ثابت ہوگئی اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کروگے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ترکیبا تو اخبار ہے مگر مقصد انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ حقوق ادا کریں۔ (تفسیر بیان القرآن)

بنی اسرائیل میں جہاں سرکش لوگ بڑی تعداد میں تھے وہاں بہت سے لوگ ایسے مخلص بھی تھے جنہوں نے تورات اور انجیل کو صرف پڑھا ہی نہیں تھا؛ بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے حق کی ہر بات کو قبول کرنے کے لئے اپنے سینوں کو کشادہ رکھا تھا، چنانچہ جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

دعوت پہنچی تو انہوں نے کسی عناد کے بغیر اسے قبول کیا، اس آیت میں ان حضرات کی تعریف کی گئی ہے اور سبق یہ دیا گیا ہے کہ کسی آسمانی کتاب کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کے تمام احکام کو دل سے مان کر ان کی تعمیل کی جائے، درحقیقت تورات پر ایمان رکھنے والے وہی ہیں جو اس کے احکام کی تعمیل میں آنحضرت ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔ (توضیح القرآن)

بنی اسرائیل کے لیے نصیحت آموز جملے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کریں۔

يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (۱۲۲) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۱۲۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ اس کو کوئی سفارش فائدہ دے گی اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔

سورت بقرہ کی کئی آیات میں بنی اسرائیل کے احوال بیان ہوئے، انہی الفاظ کے ساتھ گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو ان پر کی جانے والی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، ان پر کیے جانے والے احسانات کا ذکر کیا گیا، ان کی طرف سے ان احسانات کا کس انداز میں جواب دیا گیا اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے، ان پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوئے، انہیں ذلیل بندر بنایا گیا، گوسالہ پرستی پر انہی کی تلواروں و شمشیروں سے انہی کے لوگ تہ تیغ کیے گئے، جس طرح ان پر نعمتوں کی موسلا دھار بارشیں آئیں اسی نسبت سے ان کی نافرمانیوں اور عصیاں کی وجہ سے ان پر عذاب بھی آیا، دریا کی موجوں میں انہیں موت کے گھاٹ

اتارا گیا، ان کی ذلت وادبار کے تمغے قرآن کریم کی زبانی سنائے گئے۔

یہاں تاکیدی طور پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے، انہیں نبی کریم ﷺ کی اتباع و پیروی کی ترغیب دی گئی ہے جن کی صفات، مدح و تعریف، جن کا نام نامی اسم گرامی، جن کے احوال اور جن کی امت کے تذکرے وہ اپنی کتابوں میں دیکھتے ہیں، انہیں اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں پر پردہ نہ ڈالیں، ان چیزوں کو نہ چھپائیں جن کے ذریعے اللہ نے ان پر انعام کیا ہے، انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر کریں گے، چاہے وہ دنیوی نعمتیں تھیں یا اخروی، وہ عربوں کے ساتھ حسد نہیں کریں گے جو ان کے بنی عم ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کی رسالت و نبوت کے ساتھ سرفراز فرمایا، حسد کی بناء پر ان کی مخالفت اور تکذیب سے گریزاں ہوں گے، حسد کی بناء پر ان کی موافقت و ہم آہنگی سے راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ: یہاں پر قیامت کی ہولناکی کا منظر بیان کیا گیا ہے، کہ اس دن کی وحشت و ہولناکی سے بچنے کی کوشش کرو جس دن سب کو اپنی اپنی پڑی ہو گی، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہو گا، جان خلاصی کے لیے کسی سے فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی سفارش کام آئے گی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امتحان میں کامیابی

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کیجیے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (۱۲۴) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے کئی باتوں سے آزمایا، اور انہوں نے وہ ساری باتیں کیں، اللہ نے (ان سے) کہا: میں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

ابراہیم نے پوچھا: اور میری اولاد میں سے؟ اللہ نے فرمایا میرا (یہ) عہد ظالموں کو شامل نہیں ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ: ان کلمات سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں مفسرین کرام نے بہت کچھ لکھا ہے، کلمات جمع ہے کلمۃ کی اور کلمہ لفظ مفرد با معنی کو کہا جاتا ہے اور کلام کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں کلمات سے احکام شرعیہ مراد ہیں جن کا ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا، جو احکام ان کو دیے گئے انہوں نے ان کو پورا کیا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان احکام کے انجام دینے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف فرمائی، یہاں فرمایا، **فَأَتَمَّهُنَّ** ای قَامَ بِهِنَّ کلهن یعنی جتنے بھی احکام کا حکم دیا گیا ان کو پورا فرمایا اور سورۃ النجم میں فرمایا: **وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ** اور وہ ابراہیم علیہ السلام جس نے احکام کی پوری بجا آوری کی۔ (تفسیر انوار البیان)

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جو احکامات دیے اس بارے میں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کے بہت سے ارشادات ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بھی اس کی وضاحت میں کئی اقوال ہیں، ① ان کا ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مناسک حج کا حکم دیا جس کو انہوں نے پورا فرمایا۔ ② دوسرا قول یہ ہے کہ طہارت اور نظافت سے متعلق ان کو احکام دیے تھے اور یہ دس احکام ہیں جن میں پانچ سر سے متعلق اور پانچ باقی جسم سے متعلق ہیں۔ جو سر سے متعلق تھے وہ یہ ہیں ① مونچھیں کاٹنا۔ ② کلی کرنا۔ ③ سانس کے ساتھ ناک میں پانی لے کر ناک صاف کرنا۔ ④ مسواک کرنا۔ ⑤ سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔ باقی جسم سے متعلق احکام یہ ہیں۔ ⑥ ناخن کاٹنا۔ ⑦ ناف کے نیچے بال صاف کرنا۔ ⑧ ختنہ کرنا۔ ⑨ بغلوں کے بال صاف کرنا۔ ⑩ پیشاب اور پائخانہ کر کے پانی سے استنجا کرنا۔ (انوار البیان، ابن کثیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں قدوم نامی جگہ پر اپنا ختنہ خود کیا (بخاری) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے مہمان کی مہمان نوازی کی اور سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنا ختنہ خود کیا اور

وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی مونچھیں تراشیں اور وہ سب سے پہلے شخص ہیں جن کے چہرے پر سفید بال نظر آئے، انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے (یعنی متانت اور سنجیدگی کی چیز ہے) اس پر انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! میرا وقار اور بڑھا دیجیے۔ (مؤطا مالک)

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تیسرا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن احکام کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی ان میں سے چھ چیزیں انسان کے اندر ہیں اور چار احکام حج کے متعلق ہیں جسم انسانی کے متعلق چھ عدد یہ ہیں۔ ① ناف کے نیچے بال صاف کرنا اور باقی چار احکام حج سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں ① طواف کرنا۔ ② صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا۔ ③ جمرات پر کنکریاں مارنا۔ ④ طواف زیارت کرنا۔ ④ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے چوتھا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جن چیزوں کا حکم دیا اور انہوں نے ان کو پورا کیا وہ تیس چیزیں ہیں ان میں سے دس سورت برأت میں اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ سے لے کر آیت کے آخر تک میں، دس سورت مؤمنون کے اول میں اور سورت معارج کے پہلے رکوع میں، دس سورت احزاب کی آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ میں مذکور ہیں۔

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکررات کو چھوڑ کر ان سب کا شمار اس طرح ہے ① توبہ کرنا۔ ② عبادت کرنا، ③ اللہ کی حمد کرنا۔ ④ روزہ رکھنا، ⑤ رکوع کرنا، ⑥ سجدہ کرنا، ⑦ امر بالمعروف کرنا، ⑧ نہی عن المنکر کی انجام دہی کرنا، ⑨ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا۔

(سورۃ المؤمنون میں یہ احکام مذکور ہیں، ① نماز میں خشوع کرنا، ② لغو سے اعراض کرنا، ③ زکوٰۃ ادا کرنا، ④ شرم کی جگہ کو حرام سے محفوظ رکھنا، ⑤ امانتوں کی نگہداشت رکھنا، ⑥ عہد کی پابندی کرنا، ⑦ نمازوں کی پابندی کرنا، یہ چیزیں سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع میں مذکور ہیں، سورۃ معارج میں بھی ان چیزوں کا تذکرہ ہے، اس میں یہ چیزیں زائد ہیں، ⑧ اپنے مالوں میں سائل

اور محروم کا حصہ رکھنا، ⑨ اپنے رب کے عذاب سے ڈرنا، ⑩ گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔ (انوار البیان)

سورۃ احزاب میں یہ چیزیں مذکور ہیں، ① اسلام کے کام کرنا، ② دل سے مؤمن ہونا، ③ فرمانبرداری کرنا، ④ قول و عمل میں سچائی اختیار کرنا، ⑤ طاعات کی ادائیگی میں اور مصائب کے آنے پر صبر اختیار کرنا، ⑥ خشوع اختیار کرنا، ⑦ مال کی خیرات کرنا، ⑧ روزہ رکھنا، ⑨ شرم کی جگہوں کی حفاظت کرنا، ⑩ بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنا۔ (انوار البیان) ⑤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پانچواں قول یہ منقول ہے کہ جن کلمات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبتلا فرمایا اور ان کو آزمایا۔ وہ یہ ہیں۔ ① اپنی قوم سے جدا ہو جانا اور اللہ کے لیے مفارقت اختیار کرنا۔ ② نمرود سے اللہ کی توحید کے بارے میں مباحثہ کرنا اور جان کا خطرہ ہوتے ہوئے ایک جابر کے سامنے کلمہ حق کہہ دینا۔ ③ پھر آگ میں ڈالا جانا اور اس کے باوجود حق پر قائم رہنا، ④ اپنا وطن چھوڑ کر اللہ کے لیے ہجرت کرنا اور دوسری جگہ ملک شام چلا جانا۔ ⑤ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ضیافت کے لیے مامور ہو جانا اور اپنی جان و مال سے اس پر ثابت قدم رہنا۔

⑥ بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم ہونا پھر اس کے لیے نہ صرف یہ کہ آمادہ ہو جانا بلکہ اس کے گلے پر چھری پھیر دینا (انہوں نے تو چھری پھیر ہی دی، آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوئی اور بیٹا ذبح نہ ہوا، یہ دوسری بات ہے) جب یہ سب کام کر گزرے اور امتحان میں پورے اتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَسلِم (فرمانبردار ہو جاؤ) انہوں نے عرض کیا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں رب العالمین کا فرمانبردار ہوں۔ (تفسیر انوار البیان)

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے یہاں یہ بتلایا ہے کہ ان کا تینوں گروہوں (یہود، نصاریٰ، مشرکین) کے باطل عقائد سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان کی ساری زندگی توحید کی تبلیغ میں خرچ ہوئی اور انہیں اس راستے میں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا جن میں وہ پورے اترے،

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام ہی کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبوت کا سلسلہ انہی کی اولاد یعنی بنی اسرائیل میں چلا آرہا تھا، جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر کی پیشوائی کا حق صرف انہی کو حاصل ہے، کسی اور نسل میں کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو ان کے لئے واجب الاتباع ہو۔

قرآن کریم نے یہاں یہ غلط فہمی دور کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا ہے کہ دینی پیشوائی کا منصب کسی خاندان کی لازمی میراث نہیں ہے اور یہ بات خود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صریح لفظوں میں کہہ دی گئی تھی انہیں جب اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے آزمالیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہمیشہ تیار ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا بھر کی پیشوائی کا منصب دینے کا اعلان فرمایا، اسی موقع پر جب انہوں نے اپنی اولاد کے بارے میں پوچھا تو صاف طور پر بتلا دیا گیا کہ ان میں جو لوگ ظالم ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کریں گے وہ اس منصب کے حق دار نہیں ہوں گے۔

بنی اسرائیل کو صدیوں آزمانے کے بعد ثابت یہ ہوا کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ قیامت تک پوری انسانیت کی دینی پیشوائی ان کو دی جائے اس لئے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بھیجے جارہے ہیں جن کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ وہ اہل مکہ میں سے بھیجے جائیں، اب چونکہ دینی پیشوائی منتقل کی جارہی ہے اس لئے اب قبلہ بھی اس بیت اللہ کو بنایا جانے والا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ (توضیح القرآن للعثمانی)

بیت اللہ شریف اور مقام ابراہیم علیہ السلام

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۱۲۵) البقرہ

جواب ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے ایسی جگہ بنایا جس کی طرف وہ لوٹ لوٹ کر جائیں اور جو سراپا امن ہو۔ اور تم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو یہ تاکید کی کہ تم دونوں میرے گھر کو ان لوگوں کے لیے پاک کرو جو (یہاں) طواف کریں اور اعتکاف میں بیٹھیں اور رکوع اور سجدہ بجالائیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی یہ حرمت رکھی ہے کہ نہ صرف مسجد حرام میں بلکہ اس کے ارد گرد کے وسیع علاقے میں جسے حرم کہا جاتا ہے، نہ کسی انسان کو قتل کیا جاسکتا ہے نہ شدید دفاعی ضرورت کے بغیر جنگ کرنا جائز ہے، نہ کسی جانور کا شکار حلال ہے، نہ کوئی خودرو پودا اکھاڑنے کی اجازت ہے، نہ کسی جانور کو قید رکھا جاسکتا ہے، اس طرح یہ صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں حیوانات اور نباتات کے لئے بھی امن کی جگہ ہے۔ (توضیح القرآن)

مقام ابراہیم اس پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر کیا تھا، یہ پتھر آج بھی موجود ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا طواف کرے سات چکر لگانے کے بعد اس پتھر کے سامنے کھڑا ہو کر بیت اللہ کا رخ کرے اور دو رکعتیں پڑھے ان رکعتوں کا اسی جگہ پڑھنا افضل ہے۔ (توضیح القرآن)

اہل مکہ کے لیے دعائے ابراہیمی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱۲۶) البقرہ

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ: اے میرے پروردگار! اس کو ایک پر امن شہر بنا دیجیے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں انہیں قسم قسم کے پھلوں سے رزق عطا فرمایئے۔ اللہ نے کہا: اور جو کفر اختیار کرے گا اس کو بھی میں کچھ عرصے کے لیے لطف اٹھانے کا موقع دوں گا، (مگر) پھر اسے دوزخ کے عذاب کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔ اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے اللہ جل شانہ سے درخواست کی کہ اس کو امن والا شہر بنا دیجیے، اللہ جل شانہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کو بلد امین قرار دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا کی کہ اس شہر کے رہنے والوں کو جو بھی ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو رزق دیا جائے جو طرح طرح کے پھلوں سے ہو، چونکہ انہوں نے پہلے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کا اعلان سن لیا تھا اس لیے دعا میں اہل ایمان کی تخصیص کر دی اور عرض کیا پھلوں کا انعام اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو دیا جائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں سبھی کو دیتے ہیں اور رزق دنیاوی مومن اور کافر سبھی کو ملتا ہے اس لیے اللہ پاک کی طرف سے اعلان ہوا کہ رزق تو سبھی کو ملے گا اس میں ایمان والوں کی تخصیص نہیں ہے مومن اور کافر سبھی کھائیں گے لیکن آخرت کا رزق صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے کافروں کو بھی دنیا میں رزق ملتا رہے گا۔ جتنی جس کی زندگی ہو گی اتنے دن دنیا میں اپنا رزق کھا سکے گا اور دنیا میں جتنی بھی بڑی زندگی ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی سی ہی ہے، اہل کفر دنیا میں کھا پی لیں گے دنیا سے نفع اٹھا لیں گے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں وہاں ان کو دوزخ میں جانے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا اور دوزخ کے عذاب سے انہیں کسی بھی طرح اور کبھی بھی کوئی چھٹکارا نہ ملے گا اور دوزخ بہت بڑی عذاب کی جگہ ہے۔ (انوار البیان)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں جب تک اللہ نے چاہا اہل ایمان رہے اور مکہ معظمہ میں بستے رہے

جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، پھر اہل مکہ مشرک ہو گئے، کعبہ شریف تک میں انہوں نے بت رکھ لیے اور لات و عزیٰ اور منات کی پوجا کرنے لگے اگر ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہو جاتی کہ جو اہل ایمان ہیں انہیں رزق ملے تو اہل مکہ نے جب کفر اختیار کیا تھا اسی وقت سے پھلوں سے محروم ہو جاتے لیکن اللہ جل شانہ نے اہل مکہ کو ہمیشہ رزق دیا مومنوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔ (تفسیر انوار البیان)

مکہ معظمہ میں پھلوں کی بہتات: حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ایسی قبول فرمائی کہ دنیا بھر سے مکہ معظمہ میں پھل آتے ہیں اور وہاں کے مقامی حضرات اور حجاج و زائرین سب کھاتے ہیں اور ان سے منتفع اور متمتع ہوتے ہیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ، کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے کھانے کو ملتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

مکہ معظمہ کے قریب ہی شہر طائف آباد ہے اور وہ سرسبز و شاداب علاقہ ہے ہمیشہ وہاں سے طرح طرح کے پھل مکہ معظمہ پہنچتے رہے ہیں اور دنیا کے تمام اطراف و اکناف سے مکہ معظمہ میں طرح طرح کے پھل آرہے ہیں، شاید دنیا کا کوئی پھل ایسا نہ بچا ہو جو مکہ معظمہ نہ پہنچا ہو بعض حضرات کا یہ فرمانا ہے کہ ثمرات کے عموم میں درختوں کے پھلوں کے علاوہ مشینوں کی پیداوار اور دستکاریوں سے حاصل ہونے والا سامان بھی داخل ہے، مکہ کی سرزمین میں نہ کاشت ہے نہ شجر کاری ہے اور نہ صنعتکاری لیکن پھر بھی اس میں دنیا بھر کے ثمرات اور طرح طرح کی مصنوعات ملتی ہیں۔ (انوار)

مدینہ منورہ کے لیے دعائے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم: حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے مکہ معظمہ کے لیے دعا کی تھی اور حضرت حبیب اللہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے دعا کی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل مدینہ کا یہ طریقہ تھا کہ جب پہلا پھل آتا تھا تو نبی

اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آتے تھے، آپ اسے لے کر یوں دعا کرتے تھے، اے اللہ! تو ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمارے لیے ہمارے شہر میں برکت دے اور ہمارے لیے ہمارے صاع میں برکت دے اور ہمارے لیے ہمارے مد میں برکت دے (صاع اور مد اس زمانہ کے پیمانے تھے) اے اللہ! بیشک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں اور ابراہیم علیہ السلام نے آپ سے مکہ کے لیے دعا کی تھی اور میں آپ سے مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں جو کچھ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے مانگا میں اسی قدر اور اس کے ساتھ اس جیسا مزید آپ سے طلب کرتا ہوں۔

اس کے بعد اپنے کسی سب سے چھوٹے بچہ کو بلا کر وہ پھل دے دیتے تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یوں دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اجعَل بالمَدِینَۃِ ضِعفَی مَا بِمَکَّۃَ مِنَ البَرَکَۃِ (اے اللہ مدینہ میں اس سے دوگنی برکت کر دے جو مکہ میں ہے۔ (صحیح مسلم) حضور سرور عالم ﷺ کی دعا بھی منقول ہے۔ مدینہ منورہ میں بھی پورے عالم سے طرح طرح کے ثمرات و مصنوعات منتجات کھچ کر آتے ہیں اور کھلی آنکھوں مکہ معظمہ سے دوچند برکات دیکھنے میں آتی ہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

تاریخ خانہ کعبہ

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کریں

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۲۷) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب ابراہیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور یہ دعا کر رہے تھے، اے ہمارے رب! ہم سے قبول کر بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ (سورۃ البقرہ ۱۲۷)

کتب تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کعبہ دس بار تعمیر ہوا۔ ① سب سے پہلے اسے

فرشتوں نے بنایا، اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت المعمور کی سیدھ میں خانہ کعبہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا، فرشتوں نے اللہ کے حکم پر اس کی کھدائی کی یہاں تک کہ وہ ساتویں زمین تک اتر گئے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا پر مارا تو ساتویں زمین تک ایک گڑھا بن گیا، اس گڑھے میں فرشتوں نے چٹانیں پھینکیں، یہاں تک کہ وہ سطح زمین کے برابر ہو گیا، پھر انہوں نے اس کی تعمیر کی، پھر اللہ نے زمین پر موجود اپنی مخلوق کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کا اس طرح طواف کرے جس طرح فرشتے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

② دوسری بار آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں جبریل علیہ السلام کے ذریعے حکم دیا تھا کہ وہ عبادت کے لیے کعبہ بنائیں، آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بیت اللہ کی تعمیر کی، ان میں حرا، طور سینا، لبنان، جودی اور طور زیتا شامل ہیں۔ اس کے بعد انہیں حکم ملا کہ وہ اس گھر کا طواف بھی کریں، جب آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو فرشتوں نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ آدم تمہاری عبادت اچھی ہے۔ ایک روایت کے مطابق آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اتارا گیا تھا تو یہاں دور دور تک ویرانی اور تنہائی کو دیکھ کر اللہ سے درخواست کی تھی، جس پر اللہ نے بیت اللہ بنانے کا اشارہ دیا تھا۔

③ تیسری بار شیث علیہ السلام (آدم کے بیٹے) نے پتھر اور گارے سے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، یہ تعمیر طوفانِ نوح علیہ السلام میں گر گئی، طوفانِ نوح آیا تو کعبۃ اللہ کے آثار و نشانات مٹ گئے تھے۔

④ چوتھی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر اسے دوبارہ تعمیر کیا، طوفانِ نوح میں بیت اللہ کے نشانات تک دب گئے تھے، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام بیت اللہ کے نشانات سے لاعلم تھے، پھر اللہ نے کرم نوازی کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو راہ سجھائی تو انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی بنیادوں پر اسے اٹھایا، انہوں نے اس کی لمبائی سات ہاتھ رکھی، زمین میں تین ہاتھ اس کی بنیاد تھی، ابراہیم علیہ السلام نے حجرِ اسود کو بیت اللہ میں شامل کیا، ان کے تعمیر کردہ بیت

اللہ کی چھت نہیں تھی، صرف ایک دروازہ تھا، اس کے قریب ایک کنواں تھا جس میں نذرانہ دینے والوں کے نذرانے ڈالے جاتے تھے۔ تعمیرِ بیت اللہ کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے اس کی قبولیت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دُعا کی تھی، اس شہر کو امن والا گھر بنانے کی دُعا کی تھی، اس کے رہنے والوں کو پھل اور رزق کی فراوانی عطا کرنے کی اِلتجا کی تھی، اس تعمیر میں ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ ارجمند اسماعیل علیہ السلام بھی شریک تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق اس تعمیر میں حضرت ہاجرہ بھی شریک تھیں۔

⑤ پانچویں بار قومِ عمالقہ نے۔ ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ بیت اللہ اس وقت تک رہا جب تک اللہ نے چاہا، پھر یہ منہدم ہو گیا تھا، اس کے بعد عمالقہ نے اسے تعمیر کیا تھا۔

⑥ چھٹی بار قبیلہ جرہم نے۔ عمالقہ کا تعمیر کردہ بیت اللہ بھی منہدم ہو گیا تھا اس کے بعد قبیلہ جرہم نے اسے تعمیر کیا تھا۔

⑦ ساتویں بار قصی بن کلاب نے۔ جرہم کا تعمیر کردہ بیت اللہ بھی کچھ عرصہ بعد منہدم ہو گیا تھا پھر اس کے بعد قصی نے اسے تعمیر کیا تھا (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ہیں)

⑧ آٹھویں بار قریش نے۔ اس تعمیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی تھی، اسی تعمیر کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود کو اپنے دستِ مبارک سے نصب فرمایا تھا، قریش نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے تھوڑا سا ہٹ کر بیت اللہ کا ایک حصہ الگ کیا تھا، جسے حطیم کہا جاتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے اس کے دو دروازے رکھے تھے، قریش نے دو کی بجائے ایک دروازہ کر دیا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس بات کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کی طرح بیت اللہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں، مگر چونکہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اس لیے غلط فہمیاں بڑھ سکتی تھیں، آپ نے ان غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے پرانی تعمیر ہی باقی رہنے دی۔

⑨ نویں بار حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے۔ اللہ نے انہیں مختصر سا دورِ حکومت عطا فرمایا تھا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق خانہ کعبہ کو اس طرح تعمیر کیا تھا جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے

تعمیر کیا تھا۔

⑩ دسویں بار حجاج بن یوسف نے۔ حجاج نے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا تھا، اس کے بعد ان کی یادگاروں کو بھی مٹا دیا تھا، اس نے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا تعمیر کردہ خانہ کعبہ دوبارہ سے تعمیر کیا اور اسے قریش کی تعمیر کی طرح کر دیا تھا، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھا اسی طرح کر دیا۔

حجاج بن یوسف کے بعد کچھ مسلمان حکمرانوں نے کوشش کی کہ خانہ کعبہ کو اس طرح بنا دیا جائے، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواہش فرمایا کرتے تھے، کہ بیت اللہ ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کی طرح ہونا چاہیے مگر حضرت امامِ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا کہ خانہ کعبہ کا بار بار انہدام اور تعمیر آنے والوں کے لیے مشکلات پیدا کر دے گی، اس طرح خانہ کعبہ نئے آنے والوں کے لیے ایک کھلونا بن جائے گا، چنانچہ اس کے بعد حجاج بن یوسف والی تعمیر ہی باقی رکھی گئی، البتہ ترمیم و مرمت کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا، اس سلسلے میں آلِ سعود کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، جاذبیت، دلکشی اور خوبصورتی میں اس وقت اس بقعۂ مبارکہ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اللہ اس کے شرف و عظمت میں اضافہ فرمائے۔ (کاروان حرمین شریفین مؤلفہ راقم الحروف)

ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۲۸) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۲۹) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مکمل فرمانبردار بنا لے اور ہماری نسل سے

بھی ایسی امت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو اور ہم کو ہماری عبادتوں کے طریقے سکھا دے اور ہماری توبہ قبول فرمالے۔ بیشک تو اور صرف تو ہی معاف کر دینے کا خوگر (اور) بڑی رحمت کا مالک ہے۔ اور ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاکیزہ بنائے۔ بیشک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔

اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے اس وقت آپ نے تین دعائیں مانگیں، ان میں سے ایک دعا یہ تھی کہ اے پروردگار! تو ہم سے بیت اللہ کی تعمیر کی خدمت قبول فرما، دوسری دعا اس مقام پر موجود ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے لیے دعا کی کہ اے پروردگار! ہم دونوں باپ بیٹے کو تو اپنا مکمل فرمانبردار، اطاعت گزار اور تابعدار بنادے، ہماری نسلوں میں سے بھی ایسے لوگ پیدا فرمانا جو تیری بات کو مانیں، ہمیں اپنی بندگی کے طریقے بھی سکھا دیجیے، ہماری توبہ قبول فرمالیجیے، تیسری دعا یہ مانگی تھی کہ جس بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ہم قبولیت کی دعا مانگ رہے ہیں اس کے لیے انہی مکہ والوں میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیجنا جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے، تیری کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، ان کے دلوں کا تزکیہ کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت جو دعائیں مانگیں اللہ تعالیٰ نے انہیں قبول فرمایا، بیت اللہ کو ایسی قبولیت ملی کہ اس وقت دنیا بھر سے انسانی سمندر اس کی طرف کھنچا چلا آرہا ہے اور قیامت کی صبح تک بیت اللہ کی طرف لوگوں کا رخ یونہی بڑھتا رہے گا، لوگوں کا شوق دیدار بڑھتا رہے گا، اللہ نے بیت اللہ کے شرف وفضیلت کو دوامی قبولیت عطا فرمادی ہے، پھر اپنے اور اپنی اولاد کے لیے جو دعا مانگی اللہ نے اسے بھی قبول فرمایا ہے، پھر بیت اللہ کے اردگرد رہنے والے اہل ایمان کے لیے جو دعاء فرمائی اللہ نے اسے بھی قبول فرمایا ہے، پھر ایک عظیم الشان نبی

کے لیے جو دعا مانگی اللہ نے وہ بھی قبول فرمائی اور مکہ والوں میں سے ہی ایک عظمت والا رسول بھیج دیا، جسے اپنی آخری کتاب دی، جسے آخری امت دی، جسے آخری شریعت دی، جسے خاتم المرسلینی کا تاج پہنایا۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں إِنِّي عِندَ اللهِ لَخَاتِمَالنَّبِيِّينَ، وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ، وَسَأُنَبِّئُكُمْ بِأَوَّلِ ذَلِكَ، دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ، وَبَشَارَةُ عِيسَى بِي، وَرُؤْيَا أُمِّي الَّتِي رَأَتْ، وَكَذَلِكَ أُمَّهَاتُ النَّبِيِّينَ يَرَيْنَ (مسند احمد)، میں اللہ جل شانہ کے نزدیک آخری نبی اس وقت سے ہوں جبکہ آدم ابھی مٹی کی صورت میں تھے، میں تمہیں ابتدائی بات بتاؤں کہ میں اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسی علیہ السلام کی بشارت ہوں، اور میری ماں نے جو خواب دیکھا تھا میں اس کی تعبیر ہوں، اسی طرح نبیوں کی مائیں خواب دیکھا کرتی ہیں۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں اپنے جد امجد ابراہیم کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی ماں کے خواب کی تعبیر ہوں، وَرَأَتْ أُمِّي أَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ لَهُ قُصُورُ الشَّامِ، میری ماں نے خواب دیکھا تھا کہ گویا ان میں سے ایک نور نکلا، جس نے شام کے محلات روشن کر دیے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں شہرت کا ذریعہ یہ چیزیں ہوئیں، آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا خواب بھی عرب میں پہلے ہی مشہور ہو گیا تھا اور وہ کہتے ہیں کہ شکم آمنہ سے کوئی بڑا شخص پیدا ہو گا بنی اسرائیل کے نبیوں کے ختم کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو بنی اسرائیل میں خطبہ پڑھتے ہوئے آپ کا نام بھی صاف طور پر لے دیا تھا اور فرمایا تھا کہ لوگو! إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ [الصّٰفّ: ٦] میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد آنے والے نبی کی میں تمہیں بشارت دیتا ہوں، جن کا نام احمد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

خواب میں نور سے شام کے محلات کا چمک اٹھنا اشارہ ہے، اس امر کی طرف کہ دین وہاں جم

جائے گا بلکہ روایتوں سے ثابت ہے کہ آخر زمانہ میں شام اسلام اور اہل اسلام کا مرکز بن جائے گا، شام کے مشہور شہر دمشق ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرقی سفید مینارہ پر نازل ہوں گے۔ بخاری مسلم میں ہے لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَذَلِكَ میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، ان کے مخالفین انہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ امر اللہ آجائے۔ صحیح بخاری میں کہ وہ شام میں ہوں گے۔

ملت ابراہیمی سے انحراف کرنے والے بے وقوف ہیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (۱۳۰) إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۳۱) (البقرہ)

جواب ترجمہ: اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے؟ سوائے اس شخص کے جو خود اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر چکا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں انہیں (اپنے لیے) چن لیا تھا، اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہو گا۔ جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ سر تسلیم خم کر دو تو وہ فوراً بولے میں نے رب العالمین کے ہر حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔

ان آیتوں میں بھی مشرکین کی تردید ہے کہ جو اپنے آپ کو دین ابراہیمی پر بتاتے تھے حالانکہ کامل مشرک تھے جبکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تو موحدوں کے امام تھے، توحید کو شرک سے ممتاز کرنے والے تھے عمر بھر میں ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا بلکہ ہر مشرک سے اور ہر قسم کے شرک سے اور ہر غیر اللہ سے جو معبود مانا جاتا ہو وہ دل سے نفرت کرتے تھے اور ان سب سے بیزار تھے۔

اسی بناء پر قوم سے الگ ہوئے وطن چھوڑا بلکہ باپ تک کی مخالفت کی پروانہ کی اور صاف کہہ دیا

کہ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ الانعام :۷۸) میں بیزار ہوں، اس چیز سے جسے تم شریک کرتے ہو میں نے تو یکسو ہو کر اپنی تمام تر توجہ اس پاک ذات کی طرف کر دی ہے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔ (ابن کثیر)

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے معبودوں سے بری ہوں میں تو اپنے خالق ہی کا گرویدہ ہوں، وہی مجھے راہِ راست دکھائے گا۔ دوسرے مقام پر ہے وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰھِیْمَ لِاَبِیْہِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَۃٍ وَّعَدَھَآ اِیَّاہُ (التوبہ:۱۱۴) ابراہیم نے اپنے والد کے لیے بھی صرف ایک وعدے کی بنا پر استغفار کی تھی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔

ابراہیم علیہ السلام رب کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، وہ ربّ کعبہ کے پسندیدہ تھے اور راہ راست پر لگے ہوئے تھے، دنیا کے بھلے لوگوں میں سے تھے اور آخرت میں بھی صالح لوگوں میں ہوں گے۔ ان آیتوں کی طرح یہاں بھی فرمایا کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بے تدبیر اور گمراہ لوگ ہی ملت ابراہیمی کو ترک کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے ہدایت کے لیے چن لیا تھا اور بچپن سے ہی توفیق حق دے رکھی تھی، خلیل جیسا معزز خطاب انہی کو دیا گیا۔ وہ آخرت میں بھی سعید بخت لوگوں میں ہیں، ان کے مسلک و ملت کو چھوڑ کر ضلالت و گمراہی میں پڑنے والے سے زیادہ بیوقوف اور ظالم اور کون ہو گا؟ تفسیر ابن کثیر)

ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی اپنی اولاد کو وصیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَوَصّٰی بِھَآ اِبْرٰھٖمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ {۱۳۲} اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْہِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَآئِکَ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰھًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَہٗ

مُسْلِمُونَ (۱۳۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اسی بات کی ابراہیم اور یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے تمہارے لیے یہ دین چن لیا، سو تم ہر گز نہ مرنا، مگر درآنحالیکہ تم مسلمان ہو۔ کیا اس وقت تم خود موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ ان سب نے کہا تھا کہ ہم اسی ایک معبود کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلاَ تَمُوتُنَّ إِلاَّ وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس بات کی وصیت کی تھی کہ اللہ نے تمہارے لیے ایک اچھا دین منتخب کیا ہے، تم اسی دین پر قائم دائم رہنا، اس دین سے تم نے کسی طور پر پھرنا نہیں ہے، تمہیں موت اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو، یعنی ہر حال میں تم مسلمان رہو، اسی حال میں تم دنیا سے جاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ یعقوب علیہ السلام کے پاس بھیجا تو اس وقت انہوں نے فرشتے سے مہلت مانگی کہ میں نے اپنی اولاد کو وصیت کرنا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کو بلا کر انہیں بتایا کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے تم بتاؤ میرے جانے کے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے واضح طور پر بتایا کہ ہم آپ کی وفات کے بعد آپ اور آپ کے والد ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے رب کی عبادت کریں گے۔

شان نزول: یہودیوں نے ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یعقوب علیہ السلام نے مرتے وقت اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ یہودیت پر قائم رہنا، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی، اس پر قرآن کریم کی آیت مبارکہ نازل ہوئی أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ۔

اولاد ابراہیم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، مدین، مدان، بعض

کہتے کہ ان کے آٹھ بیٹے تھے، بعض کہتے ہیں کہ ان کے چودہ بیٹے تھے۔ (بیضاوی) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، حضرت ہاجرہ قبطیہ مصریہ سے ① پہلا بیٹا اسماعیل پیدا ہوا، پھر چچا کی بیٹی سارہ سے ② اسحاق پیدا ہوئے، اس کے بعد آپ نے قنطورہ بنت یقطن کنعانیہ سے شادی کی، جس سے چھ بچے پیدا ہوئے، ③ مدین ④ زمران ⑤ سرج ⑥ یقشان ⑦ نشق ⑧ چھٹے بیٹے کا نام نہیں بیان کیا گیا، اس کے بعد حجون بنت امین سے شادی کی اس سے پانچ بیٹے پیدا ہوئے ⑨ کیسان ⑩ سورج ⑪ امیم ⑫ لوطان ⑬ نافس۔ (البدایہ والنھایہ ج ا ص ۲۰۳)

عزالدین ابن اثیر رحمہ اللہ کی التاریخ الکامل میں ہے حضرت سارہ شام میں ایک سو ستائیس سال کی عمر میں فوت ہوئیں، حضرت ہاجرہ حضرت سارہ سے پہلے فوت ہوئیں، سارہ کے فوت ہونے کے بعد کنعانیوں کی عورت قطورہ بنت یقطن سے شادی کی، اس سے چھ بچے پیدا ہوئے، نَفشَان، مرَان، مدیان، مدن، نشَق، سَرح، حضرت اسماعیل و اسحاق علیہما السلام سمیت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد آٹھ افراد پر مشتمل تھی، اسماعیل علیہ السلام پہلے ہوئے، بربر جو ہیں یہ نفشان کی اولاد میں سے ہیں، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین یہ مدیان کی اولاد میں سے ہیں، قنطورہ کے بعد آپ نے حجون بنت اَھیر سے شادی کی تھی۔ (الکامل فی التاریخ ج ا ص ۱۱۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چوتھی بیوی کا نام دونوں بڑے مؤرخین ابن کثیر اور ابن اثیر نے حجون لکھا ہے، مگر ان کے والد کا نام ابن کثیر رحمہ اللہ نے امین لکھا اور ابن اثیر رحمہ اللہ نے اھیر لکھا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے ① روبیل ② شمعون ③ لاوی ④ یہوذا ⑤ یشسوخور ⑥ زبولون ⑦ نفتونی ⑧ دون ⑨ کوذا ⑩ اوشیر ⑪ بن یامین ⑫ یوسف۔ (تفسیر بیضاوی)

ابراہیم علیہ السلام کی یادیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رزق میں فراوانی اور کشادگی عطا فرما رکھی تھی، آپ علیہ السلام بہت ہی مہمان نواز اور سخی آدمی تھے، جو بھی آپ علیہ السلام کے پاس آتا آپ علیہ السلام اس کی مہمانی کرتے تھے، بلکہ مہمان نوازی کی بنیاد رکھنے والے آپ ہی تھے، کھانے میں ثرید کی ابتدا

کرنے والے بھی آپ ہی تھے، آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جن کی داڑھی میں سفید بال دکھائی دیا، تو اللہ سے عرض کرنے لگے، اللہ! یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو وقار اور بزرگی عطا کرنے والا ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! میرے وقار میں اضافہ فرما۔ (الاوائل طبرانی) منبر پر خطابت کے سلسلے کا آغاز کرنے والے بھی آپ علیہ السلام ہی ہیں۔ (المنتظم فی التاریخ الملوک والامم)

سب سے پہلے ایک سو بیس سال کی عمر میں اپنا ختنہ خود کرنے والے ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس کے بعد اسی سال زندہ رہے۔ سب سے پہلے مونچھیں تراشنے والے، سب سے پہلے ناخن کاٹنے والے، سب سے پہلے زیر ناف بال صاف کرنے والے ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (الاوائل لابی عروبہ حرانی) روئے زمین پر سب سے پہلا ظلم کی بنیاد رکھنے والا نمرود تھا جس کی طرف ابراہیم علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے۔ (الاوائل لعروبہ) سب سے پہلے بروز محشر جنہیں دو قبطی چادروں میں لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (الاوائل لعروبہ حرانی) سب سے پہلے عرش کی دائیں جانب یمنی جوڑا جسے پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اللہ فرمائیں گے میرے خلیل علیہ السلام کو جوڑا پہناؤ۔ سب سے پہلے جس شخص نے دین ابراہیمی میں تغیر و تبدل کیا وہ عمرو بن لحی بن قمعہ ہے۔ (الاوائل لابی العاصم)

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ان کی اولاد کو کی جانے والی وصیت کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے انتہائی مبالغے کے انداز میں اپنی اولاد کو وصیت فرمائی کہ وہ دین اسلام پر سختی سے کاربند رہیں گے، ان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنی اولاد کو کی جانے والی وصیت تاکیداً ذکر فرمائی تاکہ یہود و نصاریٰ پر حجت تمام ہو جائے اور بیان کو مؤکد کر کے دکھا دیا کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں وہ درست نہیں ہے، ان میں سے کوئی اس وقت موجود نہیں تھا جس کے سامنے انہوں نے وہ وصیت کی ہو جس کا دعویٰ یہود و نصاریٰ کرتے ہیں۔

شہداء شہید کی جمع ہے، اس کا معنیٰ ہے حاضر ہونا، مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگ حضرت یعقوب

علیہ السلام کی موت کے وقت موجود تھے یہ خطاب اہل کتاب سے ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے زعم وخیال کے مطابق خطاب کر رہے ہیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں وہ انبیاء اور مرسلین کا دین ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ تم کیونکر یہ بات کہہ سکتے ہو؟ کیا تم لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ اپنی اولادوں کو وصیت کر رہے تھے اگر تم لوگ وہاں موجود ہوتے تو پھر تم اس دین کو چھوڑ دیتے جس پر تم ہو اور تم نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں رغبت وشوق رکھتے جو وہی دین ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پوتے یعقوب علیہ السلام اور ان کے بعد باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام تھے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرات انبیاء کرام اپنی اولادوں پر دین کے معاملے میں کس قدر شفیق واقع ہوئے ہیں۔ حضرت قفال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ جب حضرت یعقوب رحمہ اللہ مصر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے لوگ آتش پرستی اور بت پرستی میں جتے ہوئے ہیں، تو انہیں اپنی وفات کے بعد اپنی اولاد کے بارے میں خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں وہ بھی میرے جانے کے بعد ایسا نہ شروع کر دیں، اس لیے انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت پر سختی سے کاربند رہنے کی ترغیب دی۔ (مفاتیح الغیب للرازی)

ہر کوئی اپنے اعمال کا جواب دہ ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۳۴) البقرہ

جواب ترجمہ: وہ ایک امت تھی جو گزر گئی، جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کا ہے اور جو کچھ تم نے کمایا

وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے۔

یہودیوں کو اس بات پر غرور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اور ان کے نسل اور نسب میں ہونے کی وجہ سے ہم عذاب سے بچ جائیں گے۔ اس آیت میں صاف صاف اس بات کی تصریح فرمادی کہ وہ حضرات اپنے اپنے عقائد اور اعمال لے کر دنیا سے چلے گئے انہوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے ساتھ ہے ان کے اعمال صالحہ ان کے کام آئیں گے اور تم نے جو کچھ کیا وہ تمہارے ساتھ ہے ان کے اعمال میں سے کوئی حصہ تمہیں نہ ملے گا۔ دوسروں کے اعمال کی وجہ سے خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھے ہو جبکہ یہ آس اور امید قانون خداوندی کے خلاف ہے، تم اپنے عقائد اور اعمال اور کفر و ایمان کو دیکھو تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہو انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے پھر بھی نجات کی امید لگائے ہوئے ہو۔ یہ بہت بڑی جہالت ہے وہ حضرات سابقین جن سے تم انتساب رکھتے ہو ان کے اعمال کی تم سے پوچھ تک نہ ہوگی اور نہ ان کا ذکر تمہارے سامنے آئے گا ان کے اعمال کا تمہیں نفع پہنچنا تو دور کی بات ہے۔ (انوار البیان)

یہودیت اور نصرانیت نہیں ملت ابراہیمی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۳۵) قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۱۳۶) البقرہ

جواب ترجمہ: اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ راہ راست پر آجاؤ گے۔ کہہ دو کہ نہیں بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک

سیدھی راہ پر تھے، اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ (مسلمانو) کہہ دو کہ: ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس کلام پر بھی جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا، اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا۔ ہم ان پیغمبروں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے، اور ہم اسی (ایک خدا) کے تابع فرمان ہیں۔

عبد اللہ بن صوریا اعور نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ مَا الْهُدَى إِلَّا مَا نَحْنُ عَلَيْهِ، فَاتَّبِعْنَا يَا مُحَمَّدُ تَهْتَدِ ہدایت پر ہم ہیں تم ہماری مانو تو تمہیں بھی ہدایت ملے گی۔ نصرانیوں نے بھی یہی کہا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم تو ابراہیم حنیف علیہ السلام کے متبع ہیں جو استقامت والے، اخلاص والے، حج والے، بیت اللہ کی طرف منہ کرنے والے، استطاعت کے وقت حج کو فرض جاننے والے، اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے، تمام رسولوں پر ایمان لانے والے لا الہ الا اللہ کی شہادت دینے والے، ماں بیٹی خالہ پھوپھی کو حرام جاننے والے اور تمام حرام کاریوں سے بچنے والے تھے۔ حنیف کے یہ سب معنی مختلف حضرات نے بیان کئے ہیں۔ (ابن کثیر)

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ: مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اس کی دعوت دی اور نصاری نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اس کی دعوت دی اللہ جل شانہ نے ان کی تردید فرمائی کہ تم ہدایت پر نہیں ہو تم اپنے اپنے دین کو چھوڑو اور ابراہیم حنیف کے دین کو اختیار کرو جس کے داعی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں ان کے دین کا عالم اور شارح اور داعی آپ کے سوا کوئی نہیں ہے ان کے دین میں توحید ہے حق پر استقامت ہے۔ قربانی ہے ایثار ہے۔ اخلاص ہے اور تم میں سے کوئی بھی ملت ابراہیم کا متبع نہیں ہے۔

دین حق میں اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرض ہے کہ اس کی ساری کتابوں اور اس کے سارے نبیوں پر ایمان لایا جائے اور ایمان لانے میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔ اگر کسی ایک نبی کو

بھی نبی نہ مانا تو سب کی تکذیب لازم آئے گی۔ اس صورت میں ہدایت پر ہونے کا دعوی غلط ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانا اور یہود و نصاری دونوں قوموں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا قرآن کو نہیں مانا پھر ہدایت پر کیسے ہوسکتے ہیں۔ (تفسیر انوار البیان للشیخ مفتی عاشق الٰہی صاحب)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق ہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۳۷)البقرہ

جواب ترجمہ: سو اگر وہ ایمان لے آئیں ان چیزوں پر جن پر تم ایمان لائے تو وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو بس وہ مخالفت ہی میں لگے ہوئے ہیں، پس عنقریب اللہ آپ کی طرف سے ان کے لیے کافی ہو گا اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا :یہودی اپنے ایمان اور ایقان کے دعویدار تھے، دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، نصاریٰ اپنے ایمان اور بڑھوتری کا چرچہ کرتے تھے، دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، سب اپنا اپنا راگ الاپتے تھے، ان سب آوازوں کے جواب میں مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ وہ کس طرح اپنا ایمان بنائیں، مسلمانوں کا پہلا طبقہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، یہاں بتلایا گیا کہ اگر یہ ایمان کے دعویدار تمہاری طرح یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ایمان لاتے ہیں تو فبہا یہ ہدایت پا جائیں گے، گویا کہ یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو معیار اور کسوٹی قرار دیا گیا ہے، یہودی ہوں یا نصرانی، مشرکین مکہ ہوں یا منافقین سب اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے ہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان معیار ہے، اگر یہ سارے فرقے، سارے گروہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ایمان لائیں گے تو ہدایت پائیں گے ورنہ نہیں۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ: اگر ان لوگوں نے اعراض کیا، منہ پھیرا تو یہ ہٹ دھرمی ہے، ضد ہے، مخالفت ہے اور حرماں نصیبی ہے اور جن لوگوں کے ایمان وایقان کو دوسروں کے لیے کسوٹی اور معیار قرار دیا گیا وہی ثقہ ہیں، عادل ہیں، اہل تقویٰ وطہارت ہیں، متورع، زاہد اور پرہیز گار لوگ ہیں، ان پر اعتراض وتنقید نہیں کی جاسکتی، یہ لوگ صحبت مصطفوی ﷺ سے فیضان حاصل کیے ہوئے ہیں اس لیے تنقید سے بالا ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف صالحین: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عادل اور ثقہ ہونے پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ شارح مشکوٰۃ فرماتے ہیں قرآنی ارشادات، سنت نبوی اور اہل حق کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ثقہ ہیں۔ (مرقات) امام ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل اور ثقہ ہیں، ان پر جرح نہیں کی جاسکتی، اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی پاکدامی بیان فرمائی ہے۔ (اسد الغابہ) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع واجب الاتباع ہے۔ (اقامۃ الدلیل) علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع حجت ہے۔ (فتح الباری)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہودیوں کے اکہتر فرقے ہوئے، نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، سبھی جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہ کون سا فرقہ ہے جو جنت میں جائے گا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ وہ فرقہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر ہوگا، (ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع سورۃ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل کہیں مفصل بیان کی گئی ہے اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات پر حاوی ہے کیونکہ اٰمَنْتُمْ کے مخاطب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ومعتبر صرف اس

طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمایا جو اعتقاد اس سے سر مو مختلف ہو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو اور جس طرح اِخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات فرشتے اور انبیاء علیہم السلام ورسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق جو ایمان واعتقاد رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے فرشتوں اور انبیاء ورسل علیہم السلام کے لئے جو مقام آپ کے قول وعمل سے واضح ہوا اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے، اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہو گیا جو ایمان کے دعویدار ہیں مگر حقیقت ایمان سے بے بہرہ ہیں کیونکہ زبانی دعویٰ ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے اور یہود و نصاریٰ بھی اور ہر زمانے میں زندیق وملحد بھی مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا جیسا رسول اللہ ﷺ کا ہے اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود نامقبول ہوا۔ (تفسیر معارف القرآن)

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ: آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آسمانی ہدایت کے مطابق اپنی منزل کی سمت گامزن رہیں، مخالفین اور معاندین کی پرواہ نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان کے خلاف آپ کی مدد و نصرت کرے گا، اللہ تعالیٰ ان کے خلاف آپ کو کامیابی اور فائز المرامی عطا فرمائے گا۔

اللہ ہی کا رنگ بہترین ہے

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (۱۳۸) البقرہ

جواب ترجمہ: (اے مسلمانو! کہہ دو کہ) ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہے اور کون ہے جو اللہ

سے بہتر رنگ چڑھائے؟ اور ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ: یہاں صِبْغَہ یعنی رنگ کا لفظ لا کر یہود و نصاریٰ کے رویے پر تعریض بھی ہے کہ تم جب کسی کو یہودی بناتے ہو تو اسے غسل دیتے ہو اور اس سے یہ سمجھتے ہو کہ جس کو غسل دیا گیا ہے اس پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا ہے جو یہودیت کا رنگ ہے اور یہی رنگ اللہ کو پیارا ہے۔ لیکن یہ رنگ وہ ہے جسے تم اپنے تخیل میں محسوس تو کر سکتے ہو لیکن اس کا اثر یہودیت قبول کرنے والے پر دور دور تک نہیں ہوتا اور نہ کوئی دوسرا شخص اس آدمی کو کسی دوسری شخصیت میں ڈھلتا ہوا محسوس کرتا ہے، بلکہ یہ محض ایک ظاہری اور نارمل کارروائی ہے، جسے یہودیت کے نام سے اختیار کر رکھا ہے اور جس کا زندگی کی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح عیسائی بھی پیدا ہونے والے بچے کو رنگ دار پانی سے غسل دیتے تھے اور عیسائی ہونے والے کو بھی اسی رنگ دار پانی سے نہلایا جاتا تھا، اسے وہ عیسائیت کا رنگ سمجھتے تھے اور اس کا نام اصطباغ رکھتے تھے، لیکن یہ رنگ بھی پیدا ہونے والے بچے یا عیسائیت قبول کرنے والے کی شخصیت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ (روح القرآن)

اللہ کا رنگ عبدیت کا رنگ ہے: یہود و نصاریٰ کو یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے کہ مذہب کے نام پر یہ ظاہری کارروائیاں مذہبی تکلف کے سوا کچھ نہیں، حقیقی تبدیلی جس کے نتیجے میں ایک بہتر انسان وجود میں آتا ہے وہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ رنگین پانی کا رنگ نہ چڑھایا جائے بلکہ اللہ کے رنگ میں دل و دماغ کو رنگا جائے ظاہری شخصیت سے لے کر باطنی اور معنوی شخصیت تک صرف اللہ کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہو یہ وہ رنگ ہے جس سے بڑھ کر کوئی رنگ نہیں، یہ رنگ اصل میں عبدیت کا رنگ ہے اس لیے فرمایا وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

بندہ کا حقیقی رنگ بندگی ہے اور بندگی کا تقاضا سب کچھ اللہ کی اطاعت میں دے دینا، دل کو اس کی محبت سے آباد کرنا اور اپنی پوری شخصیت کو اس طرح اس کے دین میں ڈھال دینا ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ اس کی بندگی میں اللہ کی کبریائی اور اس کی حاکمیت کی چھاپ دیکھے، اس کی ذات اس کے دین کی

امین، اس کی صلاحیتیں اس کی رضا کی پاسبان، اس کا اقتدار اس کی حاکمیت کا خادم، اس کی روح اس کے عشق میں سرشار، اس کی عقل اس کے دین کے نور سے روشن اور اس کے راستے میں مرمٹنا اس کی بندگی کی معراج ہو، یہ ہے اللہ کا دین اور اس کا رنگ جسے اختیار کرنے سے وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جسے اختیار کرنے کی یہود اور نصاریٰ کو دعوت دی جارہی ہے۔ (روح القرآن)

اَعمالِ مشرکین سے بیزاری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ (۱۳۹) أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۴۰) تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۴۱) (البقرہ)

جواب ترجمہ: آپ فرمائیے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔ اور ہمارے لیے ہیں عمل ہمارے اور تمہارے لیے ہیں عمل تمہارے اور ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص والے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی تھے۔ آپ فرمادیجیے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جاننے والا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے چھپایا اس گواہی کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے بیخبر نہیں ہے جنہیں تم کرتے ہو۔ وہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے عمل کیا، اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے عمل کیا، اور تم سے اس چیز کا سوال نہ ہوگا جو وہ کرتے تھے۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ: مشرکین نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ تعالیٰ کی توحید، اخلاص اور اطاعت بارے کوئی نہ کوئی علت و چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے نبی ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان مشرکوں سے پوچھیے کہ تم ہم سے اللہ کی توحید، اخلاص، اطاعت وغیرہ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ وہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمہارا رب بھی تو ہے، ہم پر اور تم پر قابض و متصرف بھی وہی اکیلا ہے۔ ہمارے عمل ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے عمل تمہیں کام آئیں گے، ہم تم سے اور تمہارے شرک سے بیزار ہیں، دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ (الانعام :۱۴۷) یعنی اگر یہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہہ دیں کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے تم میرے (نیک) کام سے اور میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ (آل عمران :۲۰) اگر یہ آپ سے جھگڑیں تو آپ کہہ دیں کہ میں نے اور میرے ماننے والوں نے اپنے منہ اللہ کی طرف کر دیئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ (الانعام :۸۰) کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے اختلاف کرتے ہو؟ ایک اور مقام پر ہے أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ (البقرۃ :۲۵۸) کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑنے لگا۔

وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ: یہاں ان جھگڑالو لوگوں سے کہا گیا کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہم تم سے الگ اور تم ہم سے الگ، ہم عبادت اور توجہ میں اخلاص اور یکسوئی کرنے والے لوگ ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى یہاں ان لوگوں کے دعوے کی تردید ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی

نصرانی، تم اے یہودیو اور اے نصرانیو! کیوں یہ باتیں بنا رہے ہو؟ کیا تمہارا علم اللہ سے بھی بڑھ گیا ہے اللہ نے تو صاف فرما دیا کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی، نہ مشرک، بلکہ خالص مسلمان تھے، ان کا حق کی شہادت کو چھپا کر بڑا ظلم کرنا یہ تھا کہ اللہ کی کتاب جو اس کے پاس آئی اس میں انہوں نے پڑھا کہ حقیقی دین اسلام ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب وغیرہ یہودیت اور نصرانیت سے الگ تھے لیکن پھر نہ مانا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس بات کو بھی چھپا دیا۔

قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے اور اس کی خبر سب سے زیادہ سچی ہوتی ہے، اس نے تورات اور انجیل دونوں آسمانی کتابوں میں بتایا اور پھر قرآن کریم کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنایا کہ وہ لوگ جنہیں یہ یہودیت وعیسائیت کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ سارے کے سارے مسلمان تھے، یہودیت ونصرانیت سے مبرا اور پاک تھے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ: اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اس گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جس نے اللہ تعالیٰ کی اس گواہی کو چھپایا جو اس کے پاس ہے۔ وہ شہادت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حنفیّت کی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اہل کتاب سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس گواہی کو چھپا دیا، حالانکہ اس کو جانتے ہیں، یا اگر ہم اس گواہی کو چھپاتے تو ہم سے بڑا کوئی ظالم نہ ہوتا، پس ہم تو اس کو نہیں چھپاتے، اس میں ان پر تعریض کی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نبوت کی گواہی کو جو ان کی کتابوں میں موجود ہے چھپا رہے ہیں۔ مِنَ اللّٰه میں مِن اس طرح ہے جیسے کہتے ہیں هَذِهِ شَهَادَةٌ مِنِّي لِفُلَانٍ إِذَا شَهِدتُ لَه گویا یہ اس کی صفت ہے (مدارک التنزیل)

اس شہادت کو چھپانے والے ظاہر ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہود کے علماء تھے اور یہ شہادت محفوظ تھی ان کی مسلم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں۔ (تفسیر ماجدی) تمہیں معلوم ہے کہ یہ انبیاء یہودی یا عیسائی نہیں تھے، اسی طرح تمہاری کتابوں میں آنحضرت کی نشانیاں بھی موجود ہیں،

لیکن تم ان شہادتوں کو لوگوں سے چھپا کر ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے ہو جو اللہ تعالیٰ سے خفیہ نہیں۔ (تفسیر مکہ) حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب اپنی کتابیں پڑھا کرتے کہ سچا دین اسلام ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور ابراہیم اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹے یہودیت و نصرانیت سے بری تھے، تورات و انجیل میں اللہ نے ان باتوں کو بیان کیا، اور اہل کتاب نے ان کا اقرار کیا، لیکن انہوں نے اس صداقت کو جان بوجھ کر چھپا دیا، اسی لیے نے بطور تہدید و وعید کہا کہ تم بڑے ہی ظالم ہو۔ (تفسیر تیسیر القرآن) تمہارے پاس یہ گواہی موجود ہے کہ ابراہیم حق پر تھے اور اللہ کے پسندیدہ تھے، تم نے اس بات کو اسلام پر طعن وطنز کرنے کے لیے چھپایا تو گویا تم نے اللہ کی گواہی کو چھپا دیا اس لیے تم اظلم الظالمین ہو گئے۔ (تفسیر المنار)

جو گواہی چھپائی گئی وہ اس کتاب کی خوشخبری تھی کہ اللہ تعالیٰ اولاد اسماعیل یعنی عربوں میں ایک عظیم الشان نبی مبعوث فرمائیں گے، یہ لوگ اس گواہی کو تسلسل کے ساتھ چھپاتے رہے، کبھی یوں کہتے کہ تورات میں ایسی کوئی بات اور ایسی کوئی خوشخبری نہیں ہے، کبھی تورات میں تحریف کر کے اس گواہی کا انکار کرتے تھے، اسی چیز کو اللہ تعالیٰ یہاں بیان کر رہے ہیں کہ ان کا زعم باطل یہ ہے کہ وحی الٰہی صرف بنی اسرائیل تک محدود ہے یہ درست نہیں، کیونکہ وہاں تو صاف اور واشگاف انداز میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عربوں میں ایک عظیم الشان نبی بھیجیں گے۔ (المنار)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: یہ ہر وعید کے لیے ایک جامع کلام ہے، اور جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پوشیدہ احوال اور اس کے ظاہری احوال سے آگاہ ہے، اگر وہ نیکی کرے گا تو نیکی کا صلہ اچھا ملے گا اور اگر برائی کرے گا تو برائی کا انجام برا ہے، اس کی نگاہ جھپکنے کے برابر وہ اوجھل نہیں ہو سکتی، وہ اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے، ڈرتا رہتا ہے، آج کے حالات میں ہر شخص جانتا ہے کہ اگر اس پر حکومت کی طرف سے کوئی نگران مقرر ہے جو اس کے ایک ایک لمحے پر نگاہ رکھے ہوئے ہے تو وہ ہمہ وقت ڈرتا رہے گا، خوف میں مبتلا رہے گا، باوجودیکہ بادشاہ یا حکومت کا مقرر کیا ہوا

نگہبان صرف ظاہر ہی کو جانتا ہے، تو بھلا سوچیے کہ رب تعالیٰ جیسا نگہبان جو ظاہر و پوشیدہ بلکہ سینے کے راز اور بھید تک جانتا ہے، آنکھوں کے اشارے اور دماغ میں پکنے اور اٹھنے والے خیالات سے آگاہ ہے کیا وہ انسانی افعال و اعمال انسانی منصوبوں اور تدبیروں سے غافل ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

نسب پر غرور نہ کیا جائے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۴۱)

جواب ترجمہ: وہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے عمل کیا، اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے عمل کیا، اور تم سے اس چیز کا سوال نہ ہو گا جو وہ کرتے تھے۔ (البقرہ)

یہ آیت مکرر ہے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہود کو دوبارہ متنبہ فرمایا ان کی طبیعتوں میں جو باپ دادوں پر فخر کرنا اور نسب پر بھروسہ کرنا مستحکم تھا اس کے نافع نہ ہونے پر دوبارہ بطور تاکید کے تنبیہ فرمائی اور بتادیا کہ اللہ تمہیں تمہارے اعمال پر جزا دے گا اور تمہارا باپ دادوں کا عمل تمہیں کچھ نفع نہ دے گا اور قیامت کے دن تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادے کیا عمل کرتے تھے (یعنی ان کے اعمال کا بالکل ذکر نہ ہو گا) بلکہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال ہو گا اس کے بعد صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ یہ آیت پہلے جو گزری ہے وہاں اہل کتاب کو خطاب تھا اور یہاں امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ التحیہ کو تنبیہ ہے کہ تم لوگ یہود کی اقتدا نہ کرنا اور ان کی طرح سے آباؤ اجداد پر فخر نہ کرنا اور اپنے ذاتی اعمال کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔ (روح المعانی، انوار البیان)

(دوسرے پارے کے مضامین اگلی جلد میں پیش کیے جائیں گے)

مولانا محمود الرّشید حدوٹی

مصنف۔صحافی۔دینی سکالر۔داعی الی اللہ۔

استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور،

مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''آب حیات'' کالم نویس روزنامہ پاکستان، اوصاف

- استاذ الحدیث: جامعہ رحیمیہ لاہور۔
- فاضل وفاق المدارس العربیہ پاکستان۔
- قومی ایوارڈ یافتہ حکومت پاکستان۔
- رکن مرکزی مجلس شوریٰ جے یو آئی (ن) پاکستان۔
- جنرل سیکرٹری جمعیت علماء اسلام نظریاتی پنجاب۔
- رکن دفاع پاکستان کونسل۔
- رکن متحدہ دینی محاذ پاکستان۔
- رکن جمعیت الدعوۃ الاسلامیہ العالمیہ۔
- سیکرٹری اطلاعات ونشریات ایم ڈی ایم۔
- امیر مجلس تحفظِ اسلام پاکستان۔
- مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''تحفہ خواتین'' لاہور۔
- چیئرمین مجلس تحقیق وتصنیف لاہور۔
- خطیب جامع مسجد ابوذر غفاریؓ لاہور۔
- سابق لیکچرار مون لائٹ کالج شالیمار لاہور۔
- سابق لیکچرار و پرنسپل چیف کالج شالیمار لاہور۔
- خصوصی سند یافتہ (اعزازی) دار العلوم دیوبند بھارت